امام احمدؒ اور امام علیؒ بن المدینیؒ کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ وہ عمروؒ بن شعیبؒ کی روایت کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں صحیح نہیں ہے اور علامہ ذہبیؒ نے عمرو بن شعیبؒ کی روایت کو جو حسن کہا ہے تو اس سے اس کی دوسرے طرق سے روایت مراد ہے نہ کہ عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے کیونکہ اس پر امام الجرح والتعدیل امام یحیٰیؒ بن سعید القطانؒ اور یحییٰؒ بن معینؒ وغیرہ کی مفصل جرح موجود ہے۔

امام ابن حبانؒ اپنا فیصلہ یہ بیان کرتے ہیں کہ فی روایتہ عن ابیہ عن جدہ مناکیر کثیرۃ لا یجوز عندی الاحتجاج بشیء منہا۔ (اسعاف المبطأ برجال الموطأ ص ۲۱)

عمروؒ بن شعیبؒ کی عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے میرے نزدیک کوئی روایت قابل احتجاج نہیں ہے کیونکہ ان میں کثرت سے نکارت ہوتی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: بعض محدثینؒ ان کی مطلقاً تضعیف کرتے ہیں اور جمہور ان کی توثیق کرتے ہیں اور بعض دیگر ان کی بعض روایتوں کو ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں اور اپنا فیصلہ یوں ارقام فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| ومن ضعفہ مطلقا فمحمول علی روایتہ عن ابیہ عن جدہ (تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۵۱) | جو حضرات ان کی مطلقاً تضعیف کرتے ہیں۔ سو ان کی یہ تضعیف صرف عن ابیہ عن جدہ کے طریق پر محمول ہوگی۔ |

علامہ سید سلیمان ندویؒ (المتوفی ۱۳۷۳ھ) لکھتے ہیں کہ اور یہ بیچارے اس لیے ضعیف سمجھے جاتے تھے کہ ان کو کتاب مل گئی تھی جس سے حدیثیں نقل کرتے وقت وہ تدلیس سے کام لیتے تھے۔ (خطبات مدراس ص ۵۳) عمروؒ بن شعیبؒ عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے ایک اور روایت بھی مروی ہے کہ جس نے سکتات امام میں سورۂ فاتحہ کی قرأت نہ کی تو اس کی نماز کامل ادا نہ ہوگی۔ (کتاب القرآۃ ص ۵۵-۵۴)

لیکن اس کی سند میں علاوہ عمروؒ بن شعیبؒ عن ابیہ عن جدہ کے محمدؒ بن عبداللہؒ بن علبیدؒ بن عمیرؒ واقع ہے جس کا حال ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں۔

ہشامؒ بن عروہ رح کی روایت: ان کی روایت موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف بھی

ہے اس کی سند میں موسیٰ بن مسعود ایک راوی ہے۔ امام احمدؒ اس میں کلام کرتے ہیں۔ ترمذیؒ ان کی تضعیف کرتے ہیں۔ امام ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ اس سے احتجاج درست نہیں ہے۔ بندارؒ اس کو ضعیف الحدیث کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۸۱) ابو حاتم رح کہتے ہیں کہ مؤمل بن اسماعیل اور ابو حذیفہ (موسیٰ) دونوں کی کتابوں میں بہت غلطیاں ہیں۔ عمروؒ بن علی الفلاسؒ کہتے ہیں کہ کوئی صاحبِ بصیرت محدث اس سے احتجاج نہیں کر سکتا۔ ابو احمد حاکمؒ کا بیان ہے کہ وہ قوی نہ تھا۔ ابن قانعؒ کہتے ہیں کہ اس میں ضعف ہے۔ امام حاکمؒ کہتے ہیں کہ وہ کثیر الوہم اور سیئ الحفظ تھا۔ ساجیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ دارقطنیؒ اس کو کثیر الوہم بتاتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۷۱)

علاوہ ازیں اس روایت میں فصاعداً کی زیادت بھی موجود ہے۔ کیا فریق ثانی سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا مقتدی کے لیے جواز سمجھتا ہے؟

اثر ابو سلمہؒ یا ابو ہریرہؓ۔ یہ اثر بھی موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف ہے۔ اس کی سند میں موسیٰ بن مسعود واقع ہے جس کی حقیقت آپ کو معلوم ہو چکی ہے۔ مزید برآں رواۃ کو اس کا پورا یقین بھی نہیں کہ یہ روایت حضرت ابو سلمہؒ (تابعی) سے ہے یا حضرت ابو ہریرہؓ سے مؤلف خیر الکلام کا اس کو مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے حدیث حسن کہنا (ملاحظہ ہو خیر الکلام ص ۲۳۷) غلط ہے۔ کیونکہ یہ راوی نرا مختلف فیہ ہی نہیں بلکہ جمہور محدثین کرامؒ کی اس پر کڑی جرح منقول ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

اثر سعیدؒ بن جبیر رح۔ یہ اثر بھی موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف اور کمزور ہے۔ اس کی سند کا ایک راوی عبد اللہ بن رجاء مکی ہے۔ امام احمدؒ اور ازدی رح کہتے ہیں کہ اس کی روایت میں نکارت ہوتی ہے۔ (میزان جلد ۲ ص ۳۷) ساجیؒ کا بیان ہے عندہ مناکیر (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۱۱) کہ وہ صاحبِ مناکیر ہے۔ اس سند کی کڑی کا دوسرا ضعیف راوی عبد اللہ بن عثمان بن خثیم ہے اسکے بارے حضرات محدثین کرامؒ کے متضاد اقوال منقول ہیں۔ امام ابن معینؒ اسکو ثقہ حجۃ کہتے ہوئے بھی یہ فرماتے ہیں احادیثہ لیست بالقویۃ۔ امام ابو حاتمؒ ما بہ بأس صالح الحدیث کہنے کے باوجود فرماتے ہیں وکان یخطئ (اور نیز فرمایا) لا یحتج بہ (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۵۶) امام نسائیؒ نے ایک مرتبہ ثقہ اور ایک مرتبہ لیس بالقوی کہا اور امام علی بن المدینیؒ اسکو منکر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۱۵)

امام دارقطنی رح کا بیان ہے۔ ضعیف لیثؔ وہ ضعیف ہے اور محدثین اس کو ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں۔ (نصب الرأیہ جلد ۱ ص ۳۵۳) مبارکپوری صاحبؒ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ مولانا عبدالحیؒ کے رسالہ امام الکلام ص ۱۷۳ کی آڑ لیتے ہوتے اس ضعیف اور کمزور اور واہی، اثر کو صحیح کہتے ہیں۔ (دیکھیے ابکار المنن ص ۱۶۷) فوا اسفا۔

سعید بن جبیرؒ کا بعینہٖ اس مضمون کا اثر کتاب القراۃ ص ۶۹، ۸۷ میں بھی مذکور ہے، لیکن سند میں وہی عبداللہ بن عثمان بن خثیم ہے۔

یہ ہیں وہ روایات و آثار جن سے یہ حضرات سکتات امام میں مقتدی کے لیے قرأت سورۃ فاتحہ تجویز کرتے ہیں۔ ابھی تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ سکتاتِ امام کا روایتی پہلو تھا۔ اب آپ درایتی پہلو بھی سن لیجئے۔ جہاں تک سکتاتِ امام کا ثبوت مل سکتا ہے وہ صرف دو سکتے ہیں، پہلا سکتہ تکبیر تحریمہ کے بعد کا سکتہ ہے اور فریق ثانی کو اس امر میں اتفاق ہوگا کہ نہ تو اس میں قرأت سورۃ فاتحہ کا ثبوت ہے اور نہ گنجائش اور دوسرا سکتہ سورۃ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہونے کے بعد امام اس لیے کرتا ہے تاکہ امام

حتی یتراد الیہ نفسہ۔ (نسائی جلد ۱ ص ۱۰۳) قرأت سے فارغ ہونے کے صرف سانس لے سکے۔

ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱۳، ترمذی جلد ۱ ص ۳۴، دارمی ص ۱۴۶)

اور صرف اس سکتہ میں سورۂ فاتحہ کی قرأت کیسے ممکن ہے؟ اور پھر ایک سکتہ کے سکتات کیسے بن گئے؟ خود مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں:

بل السکتۃ الثانیۃ کانت لان یتراد الیہ نفسہ کما صرح بہ قتادۃؒ۔ بلکہ دوسرا سکتہ تو صرف اس لیے ہوتا تھا کہ امام قرأت سے فراغت کے بعد سانس لے سکے۔ جیسا کہ حضرت قتادہؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۹)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور جمہور اہل اسلام اس کے ہرگز قائل نہ تھے کہ سورۃ فاتحہ کے بعد امام اس لیے سکتہ کرے تاکہ مقتدی اس میں سورۃ فاتحہ پڑھ لیں اور نہ یہ حضرات سکتہ کے وجوب کے قائل تھے اور نہ استحباب کے۔

(تنوع العبادات ص ۸۵)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ولم نعلم نزاعا بين العلماء انه لا يجب على الامام ان يسكت ليقرأ المأموم بالفاتحة ولا غيرها الى ان قال - ولا يستحب للامام السكوت ليقرأ المأموم عند جماهير العلماء وهذا مذهب مالكؒ وابي حنيفةؒ و احمد بن حنبلؒ وغيرهم - (فتاوی جلد ۲ ص ۱۴۶)

یعنی جہاں تک ہمیں معلوم ہے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں ہے تاکہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ لیں - امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ بن حنبلؒ وغیرہ جمہور اہلِ اسلام اس پر بھی متفق ہیں - کہ امام کے لیے یہ بات مستحب بھی نہیں ہے کہ وہ سکتہ کرے تاکہ مقتدی قرآت کر سکیں۔

قاضی محمد بن عبداللہ ابوبکرؒ ابن العربیؒ[1] المالکی الاندلسی (المتوفی ۵۴۳ھ) مجوز سکتات سے یوں خطاب کرتے ہیں کہ

عجبا لك كيف يقدر المأموم فى الجهرية على القراءة اينازع القرآن الامام ام يعرض عن استماعه ام يقرأ اذا سكت قيل له فان لم يسكت وقد اجمعت الامة على ان سكوت الامام غير واجب، فمتى يقرأ ؟

تعجب ہے تم پر مقتدی کو جہری نمازوں میں قرآت پر کیسے قادر تصور کیا جائے؟ کیا وہ قرائتِ قرآن پر امام سے منازعت کرتا رہے؟ یا استماع سے اعراض کرے؟ یا جب امام سکتہ اختیار کرے تو اس وقت وہ قرآت کرے؟ اگر امام سکتہ نہ کرے تو مقتدی کب پڑھے؟ کیونکہ تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں ہے۔

(عارضة الاحوذی جلد ص بحوالہ اوجز المسالك جلد ۱ ص ۲۴۸)

حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کسی صحیح حدیث سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ آپ نے محض اس لیے سکتہ اختیار کیا ہو تاکہ مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔ (بحوالہ غیث الغمام ص ۱۷۵)

---

[1] موصوف بہت بڑی قدر و منزلت کے مالک تھے متبحرِ علمی ذہانت اور خصائل و عادات میں بے نظیر تھے۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، العلامہ اور القاضی لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۴ ص ۸۶)

محمد بن اسمٰعیل بن الصلاح امیر یمانی (المتوفی ۱۱۸۲ھ) لکھتے ہیں کہ[1]

ثم اختلف القائلون بوجوب القرأة فقیل فی محل سکتات الامام وقیل فی سکوته بعد تمام القرأة ولا دلیل لھذین القولین فی الحدیث۔ (سبل السلام شرح بلوغ المرام جلد ۱ ص ۱۰۶)

امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت تجویز کرنے والے آپس میں مختلف ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے۔ کہ امام کے سکتات میں قرأت کرنی چاہیے۔ اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جب امام قرأت سے فارغ ہو جائے تو اس وقت مقتدی کو قرأت کرنی چاہیے لیکن ان دونوں باتوں کا حدیث میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

ان اقتباسات سے یہ بات آفتاب نیمروز کی طرح ثابت ہو گئی ہے کہ سکتات امام کا کسی حدیث سے ثبوت نہیں ملتا۔ اور امت کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ نہ تو امام پر سکتہ واجب ہے اور نہ مستحب اور یہ بات بعید از قیاس اور انصاف ہے کہ شریعت حقہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت سورۂ فاتحہ کا مکلف تو بنائے لیکن اس کو قرأت کا موقع اور محل نہ بتلائے، یہ تو ایسا ہی ہوا جیسا کسی نے کہا ہے ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یہ ایسی خرافات ہے، جس سے شریعت حقہ کا دامنِ انصاف بالکل مبرا اور پاک ہے امام ابوبکر الجصاص رح فرماتے ہیں کہ مقتدی کا کام تو یہ ہے کہ وہ امام کی پیروی کرے اور جائز نہیں کہ امام مقتدی کا تابع ہو۔ تو اس قائل کا قول کہ امام سکتہ کرے تاکہ مقتدی قرأت کر لے۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول کے خلاف ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے اور پھر باوجود اس کے یہ معاملہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے مخالف ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ اور جب امام قرأت کرے

[1] نواب صاحب رح لکھتے ہیں کہ امام صنعاء و علامہ یمن و شاعر مجید و مجتہد مفید و محدث کامل و عارف واصل است، حامل بود بکتاب و سنت بحسب اجتہاد نفس خود تقیّد بہ تقلید احدے از اہل علم نداشت۔
(تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار ص ۸۰)

تو تم خاموش رہو اس حدیث میں آپ نے مقتدی کو امام کی قرأت کے لیے خاموشی کا حکم دیا ہے اور سکتات کا قائل امام کو مقتدی کے لیے انصات کا حکم دے رہا ہے۔ اور امام کو مقتدی کا تابع بنا رہا ہے اور یہ قول بالکل الٹ ہے۔

اور اس پر بحث کرتے ہوئے مزید ارقام فرماتے ہیں:

وقولہ انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا قرأ فانصتوا اخبار منہ من ان من الائتمام بالامام الانصات لقرأتہ وھذا یدل علیٰ انہ غیر جائز ان ینصت الامام لقرأۃ المأموم لانہ لو کان مأمورا بالانصات لہ لکان مأمورًا بالائتمام بہ فیصیر الامام مأموماً والمأموم اماماً فی حالۃ واحدۃ وھذا فاسد..... الخ

(احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۱)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے پس جب وہ پڑھے تو تم خاموش رہو اس میں آپ نے خبر دی ہے کہ امام کی اقتدا میں یہ امر شامل ہے کہ اس کی قرأت کے لیے خاموشی اختیار کی جائے اور یہ ارشاد صاف بتاتا ہے کہ جائز نہیں کہ امام مقتدی کی قرأت کے لیے انصات کرے کیونکہ اگر وہ اس کا مامور ہوتا تو وہ اقتدا کا مامور ہوتا تو ایک ہی حالت میں امام مقتدی ہو جاتا اور مقتدی امام اور یہ بالکل فاسد ہے۔

**پندرھواں اعتراض** - حضرت امام بخاریؒ[1]، امام بیہقیؒ[2] اور مبارک پوری صاحبؒ[3] وغیرہ فرماتے ہیں کہ خطبہ جمعہ کے وقت اتنی توجہ اور خاموشی کا حکم اور تاکید آئی ہے کہ اگر کوئی شخص شور و غل مچاتا ہو تو اس کو یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ خاموش ہو جاؤ جیسا کہ صحیح حدیث[4] میں آتا ہے۔

اذا قلت لصاحبك یوم الجمعۃ انصت فقد لغوت۔ (بخاری جلد ۱ ص ۱۲۸، مسلم ۱ ص ۲۸۱)

یعنی جب تم کسی کو جمعہ کے خطبہ کے وقت یہ کہو کہ خاموش ہو جاؤ تو تم نے ایک بیجا اور بے ہودہ حرکت کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ خطبہ جمعہ کے وقت ایسی توجہ اور خاموشی مطلوب ہے کہ امر بالمعروف اور

---

[1] جزء القرأۃ ص ۳۵ [2] کتاب القرأۃ ص ۸۴

[3] تحقیق الکلام جلد ص وغیرہ [4] یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۲۰۷، ابوداؤد جلد ص ۱۵۸، ترمذی جلد ۱ ص ۶۷، ابن ماجہ ص ۷۹ اور طحاوی جلد ۱ ص ۲۱۵ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

نہی عن المنکر بھی اس وقت ساقط ہے لیکن مع ہذا آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد[1] فرمایا ہے کہ اذا جاء احدکم یوم الجمعۃ والامام یخطب فلیرکع رکعتین ولیتجوز فیھما (مسلم جلد ۱ ص ۲۸۷) —— جب تم میں سے کوئی شخص اس حالت میں آئے کہ امام جمعہ کا خطبہ پڑھ رہا ہو تو اس آنے والے کو مختصر طریق سے دو رکعت نماز پڑھ لینی چاہیے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز ہے، جس میں بہر حال تلاوت قرآن کریم کی جاتی ہے اور یہ انصات کے منافی نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص امام کے پیچھے بحالت اقتداء قراءت کرتا ہے تو وہ بھی آیت استماع اور انصات کی مخالفت نہیں کر رہا۔

**جواب** ۔ جمہور اہلِ اسلام خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ، امام لیثؒ بن سعدؒ، امام ابو حنیفہؒ اور جمہور حضرات صحابہؓ و تابعینؒ اور سلفؒ کا مسلک یہ ہے کہ خطبہ کے وقت نماز صحیح نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا بھی مسلک ہے۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۸۷)

علامہ عراقیؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، عروہؒ بن زبیرؓ، مجاہدؒ، عطاءؒ بن ابی رباحؒ، سعیدؒ بن المسیبؒ، محمدؒ بن سیرینؒ، امام زہریؒ، قتادہؒ، ابراہیم نخعیؒ اور قاضی شریحؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ (فتح الملہم جلد ۲ ص ۴۱۵)

امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ کوفے کے فقہاء اور محدثین کا یہی مسلک تھا۔ (جلد ۱ ص ۶۷) جب جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز نہیں۔ تو اس پر مقتدی کی قراءت خلف الامام کو قیاس کرنا صحیح نہ ہو گا اور جس طرح خطبہ کے وقت نماز استماع اور انصات کے منافی ہے اسی طرح قراءت خلف الامام بھی منافی ہے، جمہور کا کہنا ہے کہ گو آیت واذا قرئ القرآن ..... الآیۃ کا شان نزول صرف نماز ہے لیکن یہ آیت اپنے عموم الفاظ کے اعتبار سے خطبہ کو بھی شامل ہے۔ اس لیے خطبہ کی حالت میں بھی ہر ایسے قول و فعل سے اجتناب ضروری ہے جو استماع و انصات کے منافی ہو اور ظاہر ہے کہ نماز قولاً و فعلاً استماع و انصات کے منافی ہے۔ لہٰذا نماز بھی صحیح

[1] یہ روایت ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۵۹، نسائی جلد ۱ ص ۱۵۷، ترمذی جلد ۱ ص ۶۷، ابن ماجہ ص ۷۹ اور طحاوی جلد ۱ ص ۱۷۹ وغیرہ میں بھی موجود ہے بعض میں مختصر اور بعض میں قدرے تفصیل سے۔

نہ ہوگی اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

یصلی ما کتب لہٗ ثم ینصت اذا تکلم الامام (بخاری جلد ۱ ص ۱۲۱، مسلم جلد ۱ ص ۲۸۳، طیالسی ص ۶۵)

امام کے آنے سے پہلے جتنی نماز کوئی پڑھنا چاہے پڑھ لے اور پھر جب امام خطبہ شروع کرے تو اس وقت نماز ترک کر کے خاموش ہو جائے۔

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کے خطبہ پڑھنے سے قبل نماز پڑھنا جائز ہے لیکن خطبہ شروع ہونے کے بعد گنجائش نہیں نکلتی اور بغیر خاموشی اور انصات کے کوئی چارہ نہیں اور طیالسی کے یہ الفاظ بھی مدنظر رکھیے فاذا تکلم الامام استمع وانصت۔ جب امام خطبہ پڑھے تو مقتدی اس وقت توجہ کرے اور خاموش رہے اور حضرت نبیشۃ الهذلیؓ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ

فان لم یجد الامام خرج صلّٰی ما بدالہ وان وجد الامام قد خرج جلس فاستمع وانصت الحدیث (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۷۱) وقال رواہ احمد ورجالہ رجال الصحیح خلا شیخ احمد وھو ثقۃ... (انتھٰی)

اگر امام ابھی خطبہ کے لیے نہ آیا ہو تو جتنی نماز پڑھی جاسکتی ہے پڑھنی چاہیے اور جب امام خطبہ کے لیے آچکا ہو تو اس وقت ہر شخص کو بیٹھ کر توجہ اور خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ علامہ ہیثمیؒ کہتے ہیں کہ اس روایت کے سب راوی بخاری کے راوی ہیں۔ ہاں مگر امام احمدؒ کے استادؒ لیکن ہیں وہ بھی ثقہ۔

---

لہ ان کا نام علیؒ بن اسحاقؒ ہے۔ (فتح الملہم جلد ۲ ص ۴۱۵) ابن معینؒ ان کو ثقہ اور صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ نسائیؒ اور محدث محمدؒ بن حمدویہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۸۲) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۲۶۹) حافظ ابن حجرؒ مقدمۃ فتح الباری ص ۴ میں لکھتے ہیں کہ ہم فتح الباری میں جو حدیث بغیر گرفت کے نقل کریں گے۔ وہ صحیح یا حسن ہوگی۔ اور یہ روایت حافظ موصوف نے فتح الباری جلد ۲ ص ۲۹۷ میں نقل کی ہے اور اس پر کوئی گرفت نہیں کی۔ مؤلف خیر الکلام نے (ص ۵۶۳، ۵۶۴ میں) یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کی سند میں عطاء خراسانیؒ ہے اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ارسال تدلیس اور کثرتِ وہم کا شکار تھے۔ اور بخاری نے ان کی کوئی حدیث نہیں لی۔ (تقریب ۱۷۹) اور مقدمہ فتح الباری ص ۴۳۶ میں لکھتے ہیں کہ وہ بخاری کی شرط پر نہیں ہے۔ یہ علامہ ہیثمیؒ کا وہم ہے۔ (باقی صفحہ آئندہ پر)

اس صحیح روایت سے بھی معلوم ہوا کہ نماز کی گنجائش صرف اس وقت ہے۔ جب امام خطبہ کے لیے ابھی نہ آیا ہو۔ لیکن جب امام خطبہ کے لیے آچکا ہو تو پھر نماز کی گنجائش ہے اور نہ سلام و کلام کی اور خطبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی حدیث کا جواب جمہور نے یہ دیا ہے کہ یہ ایک مخصوص واقعہ ہے۔ بعض رواۃ نے نقل بالمعنیٰ کے پیشِ نظر اس کو تعمیم کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت سلیک غطفانی رض فقر و فاقہ کا شکار تھے۔ ان کی خستہ حالی اور پریشانی کو دیکھ کر آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے لیے چندہ کرنے کا قصد فرمایا اور اس کا حکم دیا کہ کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھ لیں تاکہ لوگ ان کی پراگندہ صورت اور بے لبسی کو دیکھ لیں اور دل کھول کر اس کی اعانت اور امداد کریں۔ چنانچہ روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

جاء رجل یوم الجمعۃ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب بھیئاۃ بذۃٍ فقال لہٗ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصلیت قال لا قال صل رکعتین وحث الناس علی الصدقۃ الحدیث۔

(نسائی جلد ا ص ۱۵۸)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک شخص نہایت خستہ حالی میں آیا۔ آپ نے فرمایا: تم نے نماز پڑھی ہے؟ کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھو۔ اور لوگوں کو آپ نے صدقہ اور خیرات کی تلقین فرمائی تاکہ اس کی امداد و اعانت ہو سکے۔

---

(بقیہ پچھلا صفحہ) کہ اس کو صحیح کی شرط پر مانتے ہیں۔ (محصلہ) مگر یہ حافظ ابن حجر رح کا وہم ہے کیونکہ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۳۲ اور ص ۷۹۶ میں عطاءؒ کی روایت موجود ہے۔ محدث ابو مسعود الدمشقیؒ اور ان کے پیرو کار اور علامہ قسطلانیؒ وغیرہ تصریح کرتے ہیں کہ یہ عطا خراسانیؒ ہے۔ لہٰذا یہ علامہ ہیثمی رح کا وہم نہیں بلکہ حافظ ابن حجر رح کا وہم ہے اور جس بنا پر مؤلف مذکور انکار کرتے ہیں کہ چونکہ یہ کمزور ہے لہٰذا بخاری کی شرط پر نہیں اُتر سکتا۔ نہایت کمزور ہے۔ کیونکہ اس سے ضعیف تر راوی صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ ہم ان شاء اللہ تعالیٰ عرض کر سکتے ہیں۔ اور حافظ ابن حجر رح نے تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۱۲ میں نشان دہی کی ہے کہ یہ مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کا راوی ہے۔ اس لحاظ سے بھی وہ صحیح مسلم کا راوی ہے اور یہ روایت بالکل صحیح ہے۔ اور اصولِ حدیث کی رُو سے اس کے حسن ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ البتہ نہ ماننے کا کوئی علاج نہیں۔

اور مسند احمد کی روایت کے الفاظ یوں ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

ان ھذا الرجل دخل المسجد فی ھیئۃ بذۃ فامرتہ ان یصلی رکعتین وانا ارجوان یفطن لہ رجل فیتصدق علیہ۔ (فتح الباری ۲ ص ۳۲۶)

یہ شخص مسجد میں داخل ہوا اور یہ بہت شکستہ حال تھا۔ میں نے اس کو اس امید سے دو رکعتیں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے تاکہ کوئی صاحب دل اس کو دیکھ لے اور اس پر صدقہ کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک مخصوص واقعہ تھا۔ اور رواۃ میں سے بعض نے اس کو عمومی رنگ میں پیش کر دیا ہے اور ایک روایت میں یہ بھی مروی ہے جو محض بطور تائید پیش کی جاتی ہے، جس کی مزید تائید معتمر کا مرسل کرتا ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۶۹)

وامسک عن الخطبۃ حتی فرغ من صلوتہ۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۶۹ وزیلعی جلد ۲ ص ۲۰۳)

کہ جب تک وہ شخص نماز سے فارغ نہ ہو گیا۔ آپ نے خطبہ بند کر دیا تھا۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں جو محض تائیداً پیش کی جا رہی ہے نہ کہ استدلالاً

ارکع رکعتین ولا تعد لمثل ھذا۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۶۹ وزیلعی جلد ۱ ص ۱۶۹)

اب دو رکعتیں پڑھ لے لیکن پھر کبھی ایسا نہ کرنا۔

حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں:

واما قصۃ سلیک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فقد ذکر الترمذی انھا اصح شیئ روی فی ھذا الباب واقوی۔

(فتح الباری جلد ۲ ص ۲۲۵)

امام ترمذی رح کا ارشاد ہے کہ اس باب میں سلیک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ سب سے زیادہ صحیح اور قوی تر ہے۔

چونکہ یہ شخص نہایت ہی غریب تھا اس لیے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے لیے دلسوزی سے چندہ کیا اور جب دوسرے اور تیسرے جمعہ آیا تو پھر بیٹھ گیا آپ نے فرمایا اٹھ اور نماز پڑھ۔ (فتح الباری جلد ۱ ص ۴۹۹) اور ہمارے خیال میں یہ بھی اس کی طرف لوگوں کو توجہ دلانے کے لیے تھا تاکہ لوگ اس مفلوک الحال کو دل کھول کر

چندہ دیں بلکہ امام بخاریؒ روایت نقل کرتے ہیں کہ جب وہ دوسرے جمعہ پر آیا تو اس وقت آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ان یصدقوا علیہ وان یصلی رکعتین۔ (جزء القراۃ ص ۳۷) کہ اس پر صدقہ کریں۔ اور اس کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا اور بقول مؤلف خیر الکلام حافظ ابن حجر رح نے اس کے لیے چندہ مانگنے کو جز و علت کہا ہے۔ (خیر الکلام ص ۵۶۵) مگر یہ جز و علت نہیں پوری علت ہے کیونکہ آپ نے دو تین جمعے متواتر صرف اسی خستہ حال شخص کو نماز کا حکم دیا ہے رہا امام نوویؒ اور حافظ ابن حجر رح کا مسلم کی روایت کے پیش نظر یہ کہنا کہ یہ نص ہے اس میں تاویل کی گنجائش نہیں۔ (محصلہ خیر الکلام ص ۵۶۵ والاعتصام ص ۷۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۲ء) درست نہیں۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ روایت بالمعنیٰ کا یہ جواب نہیں ہے۔

وثانیاً۔ اگر الفاظ یہی ہوتے تو کم از کم حضرات خلفاء ثلاثہ رض کبھی اس کے خلاف نہ کرتے ان کا عمل ہی اس کے غیر نص ہونے کی دلیل ہے اور جمہور اہل اسلام کی تائید اس پر مستزاد ہے۔ امام نسائیؒ سنن الکبریٰ میں اس حدیث کا یہ باب قائم کرتے ہیں: باب الصّلوٰۃ قبل الخطبۃ (زیلعی جلد ۲ ص ۲۰۴) گویا امام نسائی رح کی تحقیق یہ ہے کہ یہ واقعہ (نماز پڑھنے کا) خطبہ شروع ہونے سے پہلے پیش آیا تھا اور امام نسائیؒ کا ایسا سمجھنا محض بے وجہ نہیں ہے کیونکہ یخطب مضارع کا صیغہ ہے اور زمانہ حال و مستقبل دونوں کا اس میں احتمال موجود ہے۔ اور زمانہ استقبال[۱] مراد

---

[۱] اسی مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض محققین نے یخطب کا معنیٰ یرید الخطبۃ کیا ہے۔ دیکھیے فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۱۷، فیض الباری جلد ۲ ص ۳۴۴۔ امام نووی رح اذا امّن الامام فامّنوا کی شرح میں لکھتے ہیں۔ قالوا معناہ اذا اراد التامین۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴) علماء کا بیان ہے کہ جب امام آمین کہنے کا ارادہ کرے تو تم بھی آمین کہو۔ جب امّن ماضی میں ارادالتامین کی گنجائش نکل سکتی ہے تو یخطب میں یرید الخطبۃ کا احتمال کیوں بعید ہے؟ علاوہ بریں بخاری جلد ۱ ص ۱۵۶ میں (وقال الحافظ فی الفتح جلد ۲ ص ۳۲۸ متفق علیہ) اصل الفاظ میں تردد ہے۔ والامام یخطب او قد خرج کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو یا خطبہ کے لیے آرہا ہو او قد خرج جلد ہوتے ہوئے فریق ثانی کا دعویٰ اور کمزور ہو جاتا ہے۔ دیکھیے مزید تحقیق کے لیے عارضۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۳۰۲۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

لینے کی صورت میں حدیث کے معنی یہ ہوں گے۔ جب تم میں کوئی شخص آئے۔ درآں حالیکہ امام خطبہ پڑھنا چاہتا ہو اور اس کا ارادہ کرتا ہو (جو قرائن سے معلوم ہو سکتا ہے) تو خطبہ سے قبل ہی تم نماز پڑھ لیا کرو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں صرف دو رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ امام کے خطبہ شروع کرنے سے پہلے ہی فارغ ہو کر استماع اور انصات پر صحیح طور پر عامل ہو سکے۔

---

(بقیہ پچھلا صفحہ) مؤلف خیر الکلام نے دو باتیں ایسی کہی ہیں جن پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے پہلی بات یہ کہ والامام یخطب او قد خرج میں تردد صرف سعیدؒ کے بعض شاگردوں کو ہے۔ روحؒ بن قاسمؒ اور سفیانؒ بن عیینہ کی روایت میں تردد نہیں اسی طرح شعبہؒ کے بعض شاگرد نضرؒ بن شمیلؒ ابو زید ہرویؒ وہبؒ بن جریر بغیر تردد کے بیان کرتے ہیں۔ (دار قطنی جلد ۱ ص ۱۶۸) اور او یہاں تنویع کے لیے ہے (محصلہ ص ۵۶۷)۔ مگر ہم نے بخاری شریف جلد ۱ ص ۱۵۶ کا حوالہ دیا ہے جس کی سند یوں ہے: حدثنا آدم اخبرنا شعبة قال حدثنا عمرو بن دینار قال سمعت جابر بن عبد الله .... الخ نہ تو اس سند میں سعیدؒ ہے اور نہ اس کے وہ مذکور شاگرد ہیں جن کا ذکر مؤلف مذکور نے کیا ہے۔ اس لیے حرف او کے ساتھ ہی اصل روایت ہے جو برائے شک ہے اور اگر حرف او تنویع کے لیے ہوتا اور خطبہ اور غیر خطبہ کی حالت اجازت نماز کے لیے برابر ہوتی تو جمہور اور خصوصاً حضرات خلفاء ثلاثہ رض اس کے خلاف نہ کرتے بلکہ وہ دونوں حالتوں کو برابر سمجھتے رہا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جمہوریت حدیث کے معاملہ میں کوئی حجت نہیں (۵۶۳) تو یہ شکست فاش کی واضح علامت ہے۔ حق جماعت کے ساتھ ہوتا ہے اور امت کی اکثریت کبھی غلطیات پر مجتمع نہیں ہو سکتی اور یہاں جمہور کے پاس صحیح روایات ہیں محض جمہوریت ہی نہیں ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام اپنے ناخواندہ حواریوں کو سمجھا رہے ہیں۔ دوسری بات مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ پھر یہ کہنا کہ یخطب مضارع کا صیغہ ہے اور زمانہ حال و مستقبل دونوں کا اس میں احتمال ہے۔ قواعد نحویہ سے بے خبری پر مبنی ہے کیونکہ عامل حال اور حال کا زمانہ ایک ہونا چاہیے / پس خطبہ کا زمانہ وہی ہونا چاہیے جو آنے کا ہے ... اھ (ص ۵۶۶) بے شک یہ قواعد نحو سے بے خبری پر مبنی ہے اور ساری عمر پڑھا پڑھا کر بھی مؤلف خیر الکلام کو نحو کے بالکل ابتدائی گرائمر بھی معلوم نہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس حال اور عامل حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے وہ ایسا حال ہے جو ترکیب میں حال واقع ہو اور یہاں یخطب مضارع کا صیغہ ہے جو خود عامل ہے اور اس میں حال واستقبال کا معنٰی پایا جاتا ہے یہ راکباً کی طرح حال نہیں ہے جس کا عامل اور ہوتا ہے۔ اور اس حال میں عامل حال اور حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے۔ بات اور حال کی ہے اور وہ بے خبری میں چسپاں دوسرے حال پر کر رہے ہیں۔

الحاصل خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جمہور کے نزدیک صحیح حدیث کی روشنی میں ممنوع ہے۔ اور جس حدیث سے اجازت ثابت ہوتی ہے اس کا صحیح محمل بھی آپ جمہور کی طرف سے سُن چکے ہیں۔ دریں حالات خطبہ کی حالت میں نماز کو جائز تصوّر کرتے ہوئے اس پر قرأت خلف الامام کے جواز کو قیاس کرنا ایک بے حقیقت اور بے اصل بات ہے، خصوصاً جب کہ مسئلہ مذکورہ منصوص ہے۔

**سولھواں اعتراض** — امام بخاری رح، مبارک پوری رح اور مفتی کلانوری صاحب وغیرہ لکھتے ہیں کہ جب امام قرأت کر رہا ہو اور کوئی شخص آکر اس کی اقتدا کرنا چاہتا ہے۔ تو لا محالہ اس کو تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد ہی اقتدا نصیب ہو سکتی ہے اور اس کا تکبیر تحریمہ کہنا آیت استماع وانصات کے منافی ہے۔ لہذا مانعین قرأت خلف الامام کا عمل بھی آیت مذکورہ پر نہ ہوا۔ (جزء القرأۃ ص ۳۵ و تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۲ وغیرہ)

**جواب** — پہلے پوری تفصیل کے ساتھ یہ بات عرض کی جاچکی ہے کہ آیت کا مخاطب ہر ایسا شخص ہے جو امام کی اقتداء کر چکا ہو اور امام ابن جریر وغیرہ کے حوالے سے نقل کیا جاچکا ہے کہ

فالانصات خلفہ لقرأتہ واجب علی من کان مؤتما بہ۔ | جو آدمی امام کی اقتداء کر چکا ہو۔ امام کی قرأت کے لیے خاموش ہونا اس پر واجب ہے۔

رہا وہ شخص جس نے مطلقاً امام کی اقتدا نہ کی ہو یا ابھی اقتداء کرنے کا ارادہ ہی کر رہا ہو تو وہ شخص اس آیت کا مخاطب نہیں ہے اور تکبیر تحریمہ علمائے احناف کی تحقیق میں شرط ہے۔ (دیکھیے خانیہ جلد ۱ ص ۴۰ و سراجیہ ص ۱۰ و ہدایہ جلد ص ۸۲ اور شرح وقایہ جلد ۱ ص ۱۶۰ وغیرہ) اور شرط خارج ہوتی ہے۔ (وشرط الشئ خارج عنہ ھامش کنز ص ۳۰) لہذا قرأت امام کے وقت مقتدی کا تکبیر تحریمہ کہنا آیت استماع وانصات کے کسی طرح مخالف اور منافی نہیں ہے۔ ہاں اس کا قرأت کرنا یقیناً منافی ہے۔ قاضی مقبول احمد صاحب یہ کہتے ہیں کہ یہاں آیت کو اپنے عموم پر کیوں نہیں رکھا گیا؟ اور جو شخص نماز میں شریک نہ ہوا ہو وہ شور و غل مچاتا رہے (محصلہ الاعتصام ص ۱۰، ۵ راکتوبر ۱۹۷۲ء) لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس شخص نے اقتداء

نہ کی ہو اس کے لیے انصات و استماع مستحب ہے، اس کو شور و غل کا حق کس نے دیا ہے؟
اور آیت استحباب کے حکم میں اپنے عموم پر ہے ہاں وجوب صرف مقتدی کے لیے ہے۔
کیونکہ شان نزول ہی خلف الامام کا مسئلہ ہے۔ کما مرّ۔

سترھواں اعتراض۔ حضرت امام بخاری رح، امام بیہقی رح اور مبارکپوری صاحب رح وغیرہ کہتے ہیں کہ جو لوگ امام کے پیچھے قرأت کرنے کے منکر ہیں۔ ان کا بھی آیت استماع و انصات پر عمل نہیں ہے کیونکہ وہ بھی امام کے پیچھے ثناء وغیرہ پڑھنے کے قائل ہیں۔ اگر امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں تو ثناء وغیرہ کی قرأت کیسے صحیح ہوتی؟ لہذا ثناء وغیرہ کی قرأت کرنیوالے بھی آیت استماع و انصات پر عامل نہ ہوئے۔

(جزء القرأۃ ص ۷، ص ۱۰، کتاب القرأۃ ص ۱۵۷، تحقیق الکلام ج ۲ ص ۴۶)

جواب۔ ان اکابر کا یہ اعتراض بھی سطحی قسم کا ہے اور قابل التفات نہیں ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ اگر صورت مذکورہ بالا میں مقتدی سے مدرک مراد ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے صرف ثناء کی قرأت کرنا ہے۔ اور امام کو ثناء، تعوذ اور تسمیہ بھی پڑھنا ہے۔ اگر مدرک امام سے پہلے قرأتِ ثناء سے فارغ نہ ہوا۔ تو امام کے ساتھ تو بہر حال فارغ ہو ہی جائے گا۔ اور جب امام قرأتِ قرآن (سورۂ فاتحہ) شروع کرے گا تو مدرک ثناء کے پڑھنے سے فارغ ہو چکا ہو گا۔ لہذا مدرک باوجود ثناء پڑھنے کے آیت مذکورہ کا مخالف نہ ہوا۔

وثانیاً۔ اگر صورت مذکورہ میں مقتدی سے مسبوق مراد ہے تو محققین فقہائے احناف رح کی تصریح سے یہ بات ثابت ہے کہ جب امام جہر سے قرأت کر رہا ہو تو مقتدی کو اس وقت ثناء پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ قاضی خاں جلد ۱ ص ۴۲، فتاویٰ سراجیہ ص ۱۶ اور فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۴۵ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے، بلکہ علامہ حلبی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۹۵۶ھ) نے اس کی تصریح کی ہے کہ ولا یاتی الثناء مطلقاً۔ (کبیری ص ۳۰۴) کہ جب امام قرأت شروع کر چکا ہو تو مقتدی کو کسی بھی نماز میں ثناء نہیں پڑھنی چاہیے۔ جہری نمازوں میں قرأتِ امام کا علم مقتدی کو آسانی سے ہو سکتا ہے اور سری نمازوں میں قرائن اور شواہد سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۶۹ میں امام ابو جعفر رح کے حوالہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ مقتدی جب امام کو سورۂ فاتحہ میں پائے تو بالاتفاق ثناء پڑھے۔ (منیۃ المصلی ص ۶۵ محصلہ) اس میں بالاتفاق سے تمام فقہاء احناف کا اتفاق مراد نہیں ہے بلکہ صرف امام ابو یوسف رح اور امام محمدؒ کا اتفاق مراد ہے۔ (صغیری ص ۱۲۸ اور کبیری ص ۳۴۹)

وثالثاً۔ قاضی شوکانی رح لکھتے ہیں کہ

وظاهر التقييد بقوله من القرآن يدل على انه لا بأس بالاستفتاح حال قراءة الامام بما ليس بقرآن والتعوذ والدعاء (ا ه) (نيل الاوطار جلد ۲ ص ۲۲۶)

اور من القرآن کی ظاہری قید اس پر دلالت کرتی ہے کہ امام کی قرأت کے وقت ثناء اور تعوذ اور دعاء وغیرہ جو قرآن نہیں، پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں:

و ایں روایات (یعنی فلا تقرأوا بشیء من القرآن وغیرہ) ونحو آں دلالت دارند بر آنکہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہماں قرآن کریم ست فقط وماما قرأۃ توجہ و استعاذہ ونحو آں (یعنی ثناء وغیرہ) پس لا بأس بہ است۔ ونہی متناول آں نیست و نہ بوجہے از وجوہ بر آں دلالت دارد۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴) مگر سورۂ فاتحہ کو نواب صاحبؒ نے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور یہی مضمون مولانا عبد الصمد صاحبؒ نے بیان کیا ہے۔ (اعلام الاعلام ص ۱۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی کو صرف قرأت قرآن سے منع کیا گیا ہے۔ ثناء، تحمید، تسبیح اور تشہد وغیرہ سے اس کو منع نہیں کیا گیا۔ اور آیت واذا قرئ القرآن... الآیۃ اور حدیث فلا تقرأوا بشیء من القرآن اس کی تائید کرتی ہے۔ اس بحث کو پیش نظر رکھنے سے حضرت امام بخاری رح، امام بیہقی رح اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ کا یہ مغالطہ بھی دور ہو جاتا ہے کہ تمہارے نزدیک فرض (یعنی قرأت) سے غیر فرض (یعنی ثناء وغیرہ) کی اہمیت زیادہ ہے کہ ان دیگر امور میں امام کفایت نہیں کر سکتا۔ مگر قرأت میں کفایت کر سکتا ہے۔ (جزء القراءۃ ص ۷، کتاب القراءۃ ص ۱۵۷، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۴۲)

یہ بات تو جانے دیجئے کہ ان اکابر کے نزدیک صرف سورۂ فاتحہ کی قرأت کی اہمیت کیوں

ہے اور قرآن کریم کی باقی ایک سو تیرہ سورتوں کی اہمیت کیوں نہیں ؟ آخر وہ سورتیں بھی تو قرآن کریم کی ہیں ؟ — ع: ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہو ویسی سنو

مگر قرآن و حدیث کی فہمائش کے علاوہ قاضی شوکانی رح اور نواب صاحب بھی صحیح بات کہنے اور لکھنے پر مجبور رہیں کہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہماں قرآن کریم است، فقط۔ اس لیے جب مقتدی کو قرأتِ امام کے وقت صرف قرآنِ کریم کی قرأت سے منع کیا گیا ہے۔ تو ثناء وغیرہ کا سوال اٹھانا دور از کار بات ہے۔

اٹھارواں اعتراض — حضرت امام بخاری رح وغیرہ لکھتے ہیں کہ جب صبح کی نماز کی جماعت کھڑی ہو تو تمہارے نزدیک صبح کی سنتیں قریب ہی پڑھنی جائز ہیں۔ کیا تمہارا یہ فعل آیت استماع وانصات کے منافی نہیں ہے ؟ لہٰذا تمہارا عمل بھی تو اس آیت پر نہ ہوا۔ (جزء القراۃ ص)

جواب — پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا وجوبی طور پر مخاطب صرف وہ شخص ہے جو امام کی اقتدا اختیار کر چکا ہو۔ جس نے ابھی تک امام کی اقتدار نہیں کی وہ اس کا وجوبی طور پر مخاطب نہیں ہے۔ لہٰذا جماعت کے پاس سنتیں پڑھنے والا کسی طرح بھی آیت کا مخالف نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں محققین علماء احناف رح نے اس کی تصریح کی ہے کہ اس کو سنتیں ترک کر کے جماعت میں شریک ہونا چاہیے۔ چنانچہ حافظ ابن ہمام رح لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ مسجد کے علاوہ اگر اور کوئی جگہ نہ ہو تو نمازی کو صبح کی سنتیں پڑھنا جائز نہیں ہیں کیونکہ ترک مکروہ فعل سنت پر مقدم ہے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| واشد ما یکون کراهیة ان یصلیهما مخالطا للصف کما یفعله کثیر من الجهلة۔ (فتح القدیر جلد ا ص ۳۴۱ طبع مصر) | اور سب سے زیادہ کراہت اس بات میں ہے کہ صف کے پاس ہی صبح کی سنتیں[ا] پڑھی جائیں جیسا کہ بہت سے جاہل پڑھ لیا کرتے ہیں۔ |

غرضیکہ امام بخاری رح کا یہ اعتراض بھی کسی طرح ان کے لیے مفید نہیں ہے اور نہ اس طرح ان کا مطلب پورا ہو سکتا ہے۔

انیسواں[۱۹] اعتراض — مبارکپوری صاحب رح وغیرہ لکھتے ہیں کہ آیت مذکورہ خطبہ کو بھی شامل ہے

---

[ا] جب صبح کی جماعت ہو رہی ہو تو اس وقت صبح کی سنتوں سے متعلق حضرات فقہاء رح اور محدثین رح کا اختلاف ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

حالانکہ تمہارے نزدیک جب خطیب یاایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ پڑھتا ہو تو سامعین کو آہستہ آہستہ درود شریف پڑھنا جائز ہے۔ (کفایہ جلد ا ص ۴۸ اور شرح وقایہ جلد ا ص ۱۷۵) لہذا آیت استماع و انصات پر تمہارا عمل بھی نہ ہوا۔

(تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۴۳)

جواب — یہ تحقیق نقل کی جا چکی ہے کہ آیت کا شان نزول صرف نماز ہے۔ نزول آیت کے وقت خطبہ کا وجود بھی نہ تھا۔ ہاں عموم الفاظ میں خطبہ بھی شامل ہے۔ اس لیے بالطبع اور ثانوی حکم کی ظاہری مخالفت سے مقصودِ اوّلین اور بالذات حکم کی مخالفت کرنی کیسے جائز اور صحیح ہو سکتی ہے؟ علاوہ ازیں اگرچہ بعض علمائے احنافؒ نے خطبہ کے وقت دل میں درود شریف پڑھنے کی اجازت دی ہے بلکہ اس کو صواب اور صحیح کہا ہے۔ لیکن محققین آہستہ پڑھنے سے بھی منع کرتے ہیں۔ چنانچہ امام قاضی خانؒ رح (المتوفی ۵۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ

---

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) ایک گروہ کہتا ہے کہ پاس ہی پڑھ لی جائیں۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ رضؓ سے موقوفاً دو روایتیں آتی ہیں۔ علامہ ہیثمیؒ ایک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ رواتہ، ثقات اور دوسری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ رجالہٗ موثقون (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۷۵) دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جماعت کے بعد پڑھ لی جائیں جیسا کہ بعض احادیث میں آتا ہے لیکن اس مضمون کی بیشتر حدیثیں ضعیف ہیں۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر صبح کی سنتیں رہ جائیں تو ان کی قضا نہیں ہے۔ لیکن یہ قول مخدوش ہے۔ چوتھا گروہ کہتا ہے کہ سورج نکلنے کے بعد پڑھی جائیں (یہ ضروری نہیں کہ وہی جگہ اور وہی وضو ہو) جیسا کہ صحیح اور مرفوع حدیث میں آتا ہے۔ (ترمذی جلد ا ص ۵۷، مستدرک جلد ا ص ۲۷۴، سنن الکبرٰی جلد ۲ ص ۴۸۴) چونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیماری اور تندرستی، اقامت اور کسی حالت میں صبح کی سنتیں ترک نہیں کیں۔ (طیالسی ص ۲۲۰، زاد المعاد جلد ا ص ۱۸۵) لہٰذا یہی آخری مسلک قوی تر ہے۔

[1] حسنؒ بن منصورؒ امام کبیر اور بحر عمیق تھے، بڑے زیرک اور نکتہ رس تھے، بڑے عابد اور فقیہ النفس تھے۔ ان کا شمار مجتہدین فی المسائل میں ہوتا ہے۔ (فوائد بہیہ ص ۶۴، ۶۵) صاحب جواہر المضیہ (علامہ ابو محمد عبد القادرؒ ۷۷۵ھ) ان کو الامام الکبیر سے یاد کرتے ہیں۔

(جواہر المضیہ جلد ا ص ۲۰۵)

ومشائخنا قالوا بانہ لا یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بل یستمع وینصت لان الاستماع فرض والصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یمکن بعد ھذہ الحالۃ۔ (خانیہ جلد ا ص)

ہمارے مشائخ کا بیان ہے کہ خطبہ کی حالت میں درود شریف پڑھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ استماع اور انصات ضروری اور فرض ہے اور سامع کو خطبہ کے لیے نہایت خاموشی سے توجہ کرنی چاہیے اور درود شریف کا پڑھنا اس کے بعد بھی ممکن ہے۔

فتاویٰ سراجیہ[1] ص ۱۷ میں لکھا ہے کہ فقیہ حسام الدین رح نے آہستہ پڑھنے کی اجازت دی ہے لیکن شمس[2] الائمہ سرخسی رح (المتوفی ۴۳۸ھ) آہستہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ اور مبسوط سرخسی جلد ۲ ص ۲۹ میں آہستہ پڑھنے کی بھی صراحت کے ساتھ ممانعت بیان کی گئی ہے، حافظ ابن ہمام رح لکھتے ہیں کہ محققین کا بیان ہے کہ چونکہ استماع اور انصات فرض اور ضروری ہے۔ اس لیے حضرت امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک خطبہ کے وقت آہستہ درود شریف پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ (فتح القدیر جلد ۲ ص ۴۲۱، طبع مصر) اور یہی مسلک علامہ ابن عابدین شامی رح (المتوفی ۱۲۵۲ھ) کا ہے۔ (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ ص ۴۲) لہٰذا مبارک پوری صاحب رح کا یہ اعتراض بھی بے بنیاد ہے۔

بیسواں اعتراض — شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح سری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے استحباب پر استدلال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ذکر قرآت اور دعا کے بغیر سکوت اختیار کرنا نہ مامور بہ ہے اور نہ عبادت ہے بلکہ وساوس کا دروازہ کھولنے کا ایک سبب ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہونا سکوت سے افضل ہوگا۔ اور قرآت قرآن سے بہتر ذکر اور کیا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سری نمازوں میں امام کے پیچھے

---

[1] علامہ سراج الدین اودی رح المتوفی فی حدود ۵۷۰ھ۔

[2] امام، علامہ، حجت، متکلم، مناظر، اصولی اور مجتہد تھے، مبسوط کی پندرہ جلدیں (باب الشروط تک) بغیر مراجعہ کتب کے زبانی انھوں نے املا کرائی تھیں۔ جب کہ حق گوئی کی پاداش میں حکومت وقت نے پرانے دستور کے مطابق ایک تاریک کنوئیں میں ان کو محبوس کر رکھا تھا۔ (فوائد بہیہ ص ۱۸۸)

سورۂ فاتحہ کا پڑھنا مستحب ہوگا۔ (محصلہ فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۵۰)

جواب۔ شیخ الاسلام علیہ الرحمۃ کا یہ استدلال بھی درست نہیں ہے۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ مقتدی کا فریضہ استماع وانصات ہے نہ کہ قرأۃ اور استماع وسماع کا فرق پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

وثانیاً۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد کم وبیش پچیس تیس آیتیں پڑھنی مسنون ہیں اور مقتدی کے لیے دیگر حضرات سلف و خلف کی طرح شیخ الاسلام رحؒ کے نزدیک بھی ما زاد علی الفاتحہ پڑھنے کی گنجایش نہیں ہے۔ اگر کم وبیش تیس آیتوں کے طویل وقفہ میں مقتدی پر وسواس کا دروازہ نہیں کھلتا تو امید واثق ہے کہ سورۂ فاتحہ کے مختصر سی سات آیتوں کے وقفہ میں بھی باب وسوسہ مسدود ہی رہے گا۔

وثالثاً۔ خود شیخ الاسلام رحؒ اس کے قائل ہیں کہ مقتدی کے لیے ما زاد علی الفاتحہ میں قرأت کی بجائے استماع افضل ہے۔ نہ معلوم یہاں ذکر، قرأت اور دعا کے بغیر سکوت کیوں اعلیٰ اور افضل ہو گیا ہے؟ اس لیے سورۂ فاتحہ کی قرأت کے وقفہ میں بھی استماع افضل رہے گا کیونکہ بقول شیخ الاسلام رحؒ آیت واذا قرئی القراٰن کا اوّلین مصداق صرف سورۂ فاتحہ ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اور سرّی نمازوں میں بھی قرأۃ قرآن یقیناً ہوتی ہے۔ ہاں اگر واذا جھر بالقرآن کا ارشاد ہوتا۔ تو بات الگ تھی۔ ہم نے شیخ الاسلام رحؒ کے جواب میں جو باتیں عرض کی ہیں وہ ہماری اپنی اختراع نہیں بلکہ خود موصوف نے بیان کی ہیں۔

وایضاً ففی اجماع المسلمین علیٰ انہ فیما یزاد علی الفاتحۃ یؤمر بالاستماع دون القرأۃ دلیل علیٰ ان استماعہ لقرأۃ الامام خیر لہ من قرأتہ معہ بل علیٰ انہ مأمور بالاستماع دون القرأۃ مع الامام۔

نیز مسلمانوں کے اس اجماع میں کہ ما زاد علی الفاتحہ میں مقتدی کو قرأۃ کے بجائے استماع کا حکم ہے اس امر پر دلیل ہے کہ مقتدی کو استماع کا حکم ہے اور اس امر پر دلیل ہے کہ مقتدی کا استماع اس کے پڑھنے سے بہتر اور افضل ہے بلکہ اس کو صرف حکم ہی یہ ہے کہ وہ قرأت نہ کرے

اور استماع کرے۔ (فتاوی جلد ۲ ص ۱۴۵)

اور لکھتے ہیں کہ

فان الکتاب والسنۃ امرت المؤتم بالاستماع دون القرأۃ والامۃ متفقون علی ان استماعہ لما زاد علی الفاتحۃ افضل من قرأۃ ما زاد علیھا۔ (فتاوی جلد ۲ ص ۱۴۳)

کتاب اور سنت نے مقتدی کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ قرأت نہ کرے بلکہ سنے اور امت اس پر متفق ہے کہ "مازاد علی الفاتحۃ" میں استماع قرأت سے بہتر اور افضل ہے۔

موصوف کی ان عبارتوں کو پیش نظر رکھ کر بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے نقل کردہ جملہ جوابات خود شیخ الاسلام کی عبارات سے ماخوذ ہیں۔ باقی استماع کا معنی اور مطلب پوری تشریح کے ساتھ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ اس میں اُلجھ کر جادۂ مستقیم سے پہلو تہی کرنا ارباب تحقیق کو زیب نہیں دیتا۔

قارئین کرام! ہم نے آیت کے سلسلے میں کافی وقت لیا ہے۔ اگرچہ فریق ثانی کی جانب سے اس سلسلے میں بعض لچر پوچ اور لایعنی اعتراضات یا استدلالات اور بھی کیے گئے ہیں لیکن ہمیں ابھی آپ سے بہت کچھ عرض کرنا ہے اس لیے ہم ان کو نقل کرنے اور جواب عرض کرنے میں مزید آپ کے دماغ کو پریشان نہیں کرتے اور باب اول کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

---

# باب دوم

پہلے باب میں قرآن کریم کی آیت اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ اور دیگر جمہور سلف و خلفؒ سے اس کی تفسیر نقل کی گئی ہے کہ واذا قرئ القرآن ... الآیۃ کا شان نزول صرف نماز ہے۔ اور مقتدی کو امام کے پیچھے کسی نماز میں قرأۃ کرنا جائز نہیں ہے اور یہ کہ آیت کی یہ تفسیر مؤید بالاجماع ہے۔ اور آیت کی تفسیر پر جتنے اہم سوالات کیے گئے تھے ان کے تفصیلی جوابات بھی عرض کیے جا چکے ہیں۔ اب باب دوم میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح صریح اور مرفوع قولی اور فعلی حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔ جن سے بخوبی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام کا وظیفہ پڑھنا اور مقتدی کا خاموش رہنا ہے۔ فریق ثانی کی طرف سے ان پر جو سوالات کیے گئے ہیں ان کو نقل کر کے ان کے مسکت جوابات بھی عرض کر دیے گئے ہیں:۔

داریم بہ اخلاص سر سے بر خطِ تسلیم — با قول نبی چون و چرا را نہ شناسیم
قرآن و حدیث است شفائے دلِ رنجور — قانون و اشارات و شفا را نہ شناسیم

### پہلی حدیث:

امام مسلم[1] علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسحاق[2] بن ابراہیمؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے

---

[1] امام مسلم رحؒ (المتوفی ۲۶۱ھ) صحیح مسلم شریف کے مؤلف ہیں جو بخاری شریف کے بعد تمام حدیث کی کتابوں میں پہلے درجہ پر (حاشیہ [1] کا اور حاشیہ [2] اگلے صفحہ پر دیکھئے)

جریرؒ[۱] نے بیان کیا۔ وہ سلیمان تیمی[۲] رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ قتادہ[۳] رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ یونسؒ[۴] بن جبیرؒ سے اور وہ حطانؒ[۵] بن عبداللہ الرقاشی رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ حضرت ابوموسٰی الاشعری رضی اللہ تعالیٰ سے (المتوفی ۵۲ھ) روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک طویل حدیث میں فرمایا:

---

(بقیہ نوٹ نمبر ا و نمبر ۲ پچھلا صفحہ) صحیح تسلیم کی جاتی ہے اور امت کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے۔ کہ بخاری و مسلم دونوں کی تمام روایتیں صحیح ہیں۔ علامہ ذہبی رح ان کو الامام، الحافظ اور حجۃ الاسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۰)

ے یہ وہی مشہور امام ہیں جو ابن راہویہؒ سے مشہور ہیں۔ مقدمہ میں ان کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے۔

[۱] علامہ ابوالقاسم لالکائی رح کا بیان ہے کہ جریر رح بن عبدالحمید رح کی ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے اور ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۷۶) علامہ ذہبی رح ان کو الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۵۰)

[۲] امام مسلم نے ایک سائل کے جواب میں فرمایا کہ کیا تم سلیمانؒ سے بڑا حافظ حدیث چاہتے ہو؟ (مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴، درایہ ص ۹۴) علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں (طبقات جلد ۷ قسم دوم ص ۱۸) ابن حماد حنبلیؒ ان کو امام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۲۱۲) امام ابن معینؒ، امام احمدؒ، نسائی اور عجلیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام ثوریؒ کا بیان ہے کہ وہ حفاظ بصرہ میں تھے۔ امام شعبہؒ فرماتے تھے کہ سلیمانؒ خالص اور مجسم یقین تھے۔ امام یحیٰیؒ کا بیان ہے کہ مجھے کسی ایسے شخص کی صحبت کبھی نصیب نہیں ہوئی جس کے دل میں سلیمانؒ تیمی سے زیادہ خوف خدا موجود ہو۔ ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ، متقن، حافظ، صاحب سنت اور بصرہ کے عبادت گذاروں میں تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۲۰۲) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الامام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۴۲)

[۳] محدث ابن ناصر الدینؒ کا بیان ہے کہ وہ مفسر قرآن آیۃ فی الحفظ اور نسب دانی کے امام تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۱۵۳) ابن سعدؒ ان کو ثقہ، مامون اور حجت لکھتے ہیں۔ (طبقات جلد ۷ قسم دوم ص ۱) عبدالرحمٰنؒ بن مہدیؒ کا بیان ہے کہ قتادہؒ حمیدؒ کے جیسے پچاس آدمیوں سے زیادہ بڑے حافظ تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ قسم اول ص ۵۷) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ وہ بصرہ کی جماعت افتاء کے ایک معزز رکن تھے۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۲) ابن سیرینؒ کا بیان ہے کہ قتادہؒ سب لوگوں سے زیادہ بڑے حافظ تھے (کتاب العلل ترمذی ۲ ص ۲۳۸ اور

(باقی حاشیے اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبنا فبیّن لنا سنتنا وعلمنا صلوٰتنا فقال اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین فقولوا اٰمین۔ الحدیث

(مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں خطاب فرمایا اور سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمائی اور نماز کا طریقہ بتلایا اور یہ فرمایا کہ نماز پڑھنے سے قبل اپنی صفوں کو درست کرلو۔ پھر تم میں سے ایک تمہارا امام بنے۔ جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرآت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین کہے تو تم آمین کہو۔

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ قرآت کرنا امام کا فریضہ اور ڈیوٹی ہے۔ مقتدیوں کا وظیفہ صرف خاموش رہنا اور انصات کرنا ہے اور ان کے لیے بغیر انصات کے اور کوئی گنجایش نہیں ہے اور چونکہ یہ روایت مطلق ہے۔ لہٰذا سری اور جہری تمام نمازوں کو شامل ہے۔ اور مقتدیوں کو کسی نماز میں امام کے پیچھے قرآت کرنے کی اجازت اور گنجائش نہیں ہے۔ یہ روایت صحیح مسلم کے علاوہ حدیث وغیرہ کی دیگر معتبر اور مستند کتابوں میں بھی موجود ہے۔

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۳۵۱)۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور العلامہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱۵) حافظ ابن کثیر رحؒ ان کو احد علماء التابعین والائمۃ العاملین لکھتے ہیں (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۳۱۳) امام بیہقی رحؒ ان کو حافظ حدیث لکھتے ہیں (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۰۶) ۱۱۷ھ میں ان کی وفات ہوتی ہے۔

۷ یونسؒ بن جبیرؒ امام مسلم کا بیان ہے کہ وہ حدیث کے بیان کرنے میں پختہ کار محدث تھے۔ (مسلم جلد ۱ ص ۲۷) امام ابن معینؒ عجلیؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ نسائیؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۴۳۶)

۸ حطانؒ بن عبداللہ الرقاشی رحؒ، امام عجلیؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محدث ابن مدینیؒ ان کو ثبت کہتے ہیں۔ ابن حبان رحؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۹۲) حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ جلیل القدر اور صاحب مناقب صحابی ہیں۔

جس طرح کہ حاشیہ[۱] سے بخوبی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حافظ ابو عوانہ رح کی بعض سندیں ملاحظہ فرمائیں:

امام ابو عوانہ[۱] رح فرماتے ہیں کہ ہم سے الصائغ[۱] رح نے مکہ مکرمہ میں بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے علی[۱] بن عبداللہ رح نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے جریر رح نے بیان کیا۔ وہ سلیمان رح تیمی سے اور وہ قتادہ رح سے اور وہ ابو غلاب یونس رح بن جبیر رح سے اور وہ حطان رح بن عبداللہ رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رض نے فرمایا:

---

[۱] یہ روایت ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۴۰، مسند احمد جلد ۴ ص ۴۱۵، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵، بیہقی جلد ۲ ص ۱۵۵ ابن ماجہ ص ۶۱، محلی ابن حزم رح جلد ۳ ص ۲۴۰۔ مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۸۱۔ جامع صغیر سیوطی ص ۱۳۰۔ مغنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۶۰۲۔ فتاویٰ ابن تیمیہ رح جلد ۲ ص ۱۴۴، نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۴۹۔ نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۴۔ توجیہ النظر ص ۲۴۰۔ شرح بلوغ المرام جلد ۱ ص ۲۴۵۔ فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰۱۔ زہر الربیٰ جلد ۱ ص ۱۴۶۔ درایہ ص ۹۹۔ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۰۔ اعلاء السنن جلد ۴ ص ۴۲۔ کتاب القرأۃ ص ۸۷۔ امام الکلام ص ۱۱۱۔ کنز العمال جلد ۲ ص ۶۶، ۱۸۶۔ فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۴۱۔ شرح نقایہ ص ۸۲۔ عون الباری جلد ۲ ص ۶۴۳۔ عون المعبود جلد ۱ ص ۲۲۵۔ تنقیح الرواۃ جلد ۱ ص ۱۵۲۔ عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۲۵۹۔ فصل الخطاب ص ۲۷۔ آثار السنن جلد ۱ ص ۸۵۔ جوہر النقی جلد ۱ ص ۱۵۳۔ تحفۃ الاحوذی جلد ۱۔ کتاب العلل جلد ۱ ص ۱۶۴۔ شرح المقنع الکبیر جلد ص ۱۳۔ منتقی الاخبار جلد ۲ ص ۱۳۴۔ تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۴۔ فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲۔ جزء القرأۃ ص ۵۶۔ تنوع العبادات ص ۸۶۔ ازالۃ الستر ص ۱۵۔ خاتمۃ الخطاب ص ۱۶۔ بذل المجہود جلد ۲ ص ۵۵۔ برہان العجائب ص ۱۰۴ اور عقیدۃ المحمدیہ جلد ۲ ص ۱۹۳ وغیرہ حدیث، تفسیر، شرح حدیث اور کتب فقہ میں نقل کی گئی ہے۔ حافظ ابن کثیر رح اس طرح لکھتے ہیں:

کما رواہ مسلم فی صحیحہ من حدیث ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا ۔۔ اھ (تفسیر جلد ۲ ص ۲۸۰) اور قاضی شوکانی رح نے روایت اسی طرح نقل کی ہے۔ اور فرماتے ہیں رواہ احمد و مسلم ... الخ (نیل الاوطار ج ۲ ص ۲۵۰) اور امام احمد رح نے کتاب الصلوٰۃ ص ۵۲ میں اسی طرح نقل کی ہے۔

(باقی نوٹ نمبر ۲ و ۳ و ۴ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعلمنا سنتنا وبین لنا صلوٰتنا فقال اذا کبر الامام فکبروا واذا قرأ فانصتوا

(صحیح ابو عوانہ جلد ۲ ص ۱۳۳)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب کیا اور سنت کی تعلیم دی اور نماز کا طریقہ بتلایا اور فرمایا کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

امام ابو عوانہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے سلیمانؒ[1] بن اشعث سجستانیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عاصمؒ[2] بن نضرؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے معتمرؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سلیمان تیمیؒ سے سنا۔ وہ فرماتے ہیں (حدثنا قتادۃ) ہم سے قتادہؒ نے بیان کیا۔ وہ ابو غلاب یونسؒ بن جبیرؒ سے اور وہ حطانؒ بن عبداللہ الرقاشیؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا:

---

(بقیہ نوٹ پچھلا صفحہ) ۱؎ امام ابو عوانہؒ کا نام یعقوبؒ بن اسحاقؒ ہے (المتوفی ۳۱۶ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقۃ الکبیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۲)

۲؎ الصائغ کا نام محمدؒ بن اسمٰعیلؒ بن سالمؒ تھا۔ (المتوفی ۲۷۶ھ) محدث ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن خراشؒ ان کو اہلِ فہم و اہلِ امانت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۲ ص ۳۹ تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۵۸)

۳؎ علیؒ بن عبداللہؒ بن مدینیؒ۔ (المتوفی ۲۳۴ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ العصر قدوہ اور من ارباب ھذا الشان لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵) امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ مامون اور احد الائمہ فی الحدیث تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۳۵۶)

۱؎ صحاح ستہ میں مشہور کتاب سنن ابو داؤد کے مصنف ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الثبت اور سید الحفاظ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۲) ۲۷۵ھ میں ان کی وفات ہوتی ہے۔

۲؎ محدث ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۵۸) حافظ ابن حجر علیہ الرحمۃ ان کو صدوق لکھتے ہیں (تقریب ص ۱۸۵) کسی کی جرح ان پر منقول نہیں ہے۔

۳؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ اور الثقہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۴۶)

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبنا فکان ما بین لنا من صلوتنا و یعلمنا سنتنا قال اقیموا الصفوف ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبرالامام فکبروا واذا قرأ فانصتوا (صحیح ابو عوانہ ج۲ ص۱۳۳، ابو داؤد جلد۱ ص۱۴۰)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں خطاب فرمایا اور نماز کا طریقہ سکھایا اور سنت کی تعلیم دی اور فرمایا کہ صفیں درست کیا کرو۔ تم میں ایک امامت کا فریضہ انجام دے جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

امام ابو عوانہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے سہلؒ بن بحر جند سابوریؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہؒ بن رشیدؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو عبیدہ رح نے بیان کیا۔ وہ قتادہؒ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قرأ الامام فانصتوا واذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا آمین۔ (ابو عوانہ جلد ۲ ص۱۳۲)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین پڑھے تو تم آمین کہو۔

---

لہ عبداللہؒ بن رشیدؒ اور ابو عبیدہؒ کو علامہ سمعانیؒ مستقیم الحدیث لکھتے ہیں۔ (کتاب الانساب ص ۱۳۷)۔ مولانا ظفر احمد صاحبؒ لکھتے ہیں کہ سہلؒ بن بحرؒ کا ترجمہ مجھے نہیں مل سکا۔ لیکن کنز العمال جلد ۱ ص۳ میں لکھا ہے کہ صحیح ابو عوانہ کی تمام حدیثیں صحیح ہیں۔ (اعلاء السنن جلد ۴ ص ۴۹) اور تدریب الراوی ص۵۵ میں ابو عوانہ کو صحیح کتابوں میں شمار کیا ہے اور علامہ ذہبیؒ نے ابو عوانہ کو الصحیح المسند کے الفاظ سے بیان کیا ہے (تذکرہ جلد ۳ ص۲) راقم الحروف کہتا ہے کہ مبارک پوری صاحبؒ کو بھی اس کا اقرار ہے۔ چنانچہ وہ ایک سند کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ اور حافظ ابو عوانہؒ کی سند کا بھی صحیح ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا ہے۔ (بلفظہٖ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۱۸) محقق نیمویؒ نے اس کو متابعت میں پیش کیا تھا (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۸۵) اور مبارک پوری صاحبؒ نے تصحیح طلب کی تھی۔ (ابکار المنن ص ۱۵۲) مگر یہ عبارت خود ہی ان کا جواب ہے۔ خود اپنی پسند کے جواب سے بہتر جواب اور کیا ہو سکتا ہے؟ وکفی بنفسك الیوم علیك حسیباً۔ مولانا عبداللہ صاحب روپڑی مرحوم نے الکتاب المستطاب ص ۸۶ میں اور مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۱۶ اور ص ۲۱۷ میں ابو عبیدہؒ اور سہلؒ بن بحرؒ کے بارے میں ادھر ادھر کے راویوں کا نام لسان المیزان اور کتاب الکنیٰ دولابیؒ سے نقل کرکے ان کی جو تضعیف

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

ان تمام صحیح روایات سے معلوم ہوا کہ قرأت کرنا امام کا کام ہے اور مقتدیوں کا کام صرف خاموش رہنا اور انصات کرنا ہے اور آپؐ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ جب امام جہر کرے تو تم خاموش رہو بلکہ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور یہ مفہوم عبارۃ النص کے طور پر جہری اور سری سب نمازوں کو شامل ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث پر فریق ثانی کی طرف سے جو اعتراضات وارد کیے گئے ہیں۔ ان کو نقل کرکے ان کے جوابات بھی ہدیۂ ناظرین کردیے جائیں۔ تاکہ فنِ روایت اور درایت کے لحاظ سے اس حدیث کی حقیقت بھی آشکارا ہوجائے اور اعتراضات کی پوزیشن بھی واضح ہوجائے۔

پہلا اعتراض

حضرت امام بخاریؒ اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں سلیمان تیمیؒ مدلس ہیں اور وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس لیے حسبِ قاعدہ محدثین یہ روایت قابلِ استدلال نہیں ہوسکتی۔ (جزء القرأۃ ص ۵۶، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۸۴ وغیرہ)

جواب۔ یہ سوال بالکل سطحی قسم کا ہے۔

اولاً ـــ اس لیے کہ تمام محدثین کا اس بات پر اتفاق[1] ہے کہ مدلس راوی جب حدثنا وغیرہ الفاظ سے تحدیث کرے تو تدلیس کا الزام اس پر سے رفع ہوجاتا ہے اور ہم پہلے ابو عوانہ اور ابوداؤد کی صحیح سند کے ساتھ ان کی تحدیث (سلیمان تیمیؒ قال حدثنا قتادۃؒ) نقل کرچکے ہیں اور معتمرؒ بن سلیمانؒ پر بھی مدلس ہونے کا الزام ہے۔ مگر ابو عوانہ اور ابو داؤد کی سابق روایت میں وہ بھی سمعت فرماتے ہوئے تحدیث کرتے ہیں۔

---

(پچھلا صفحہ۔ حاشیہ) کی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ بھلا صحیح ابو عوانہ کے یہ ضعیف راوی کیسے ہوسکتے ہیں جو بتصریح محدثین صحیح ہے۔ ابو عوانہ کی سند میں جو راوی ہیں وہ بالکل ثقہ ہیں اور جن راویوں کی انھوں نے نشاندہی کی ہے وہ راوی ابو عوانہ کے ہرگز نہیں ہیں۔

[1] شرح نخبۃ الفکر ص ۵۳، تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۷۰، اور تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۲ وغیرہ میں محدثین کا یہ قاعدہ نقل کیا گیا ہے۔

وثانیاً ـ جملہ محدثین کا یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ اگر مدلس راوی کا کوئی متابع موجود ہو تو تدلیس کا عیب اور طعن اس سے اٹھ جاتا ہے۔ چنانچہ مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ تدلیس کا طعن متابعت سے اٹھ جاتا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۲) اور صحیح ابو عوانہؒ کی روایت میں ابو عبیدہؒ سلیمان تیمیؒ کے متابع ہیں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ مولانا محمد حسن صاحب محدث فیض پوریؒ فرماتے ہیں کہ صحیح ابو عوانہ کی مستقل سند میں ابو عبیدہ الحدادؒ سلیمان تیمی رحؒ کے متابع ہیں اور اس کی سند اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔ (فی غایۃ الصحۃ) (الدلیل المبین ص ۸۱)

علاوہ ازیں دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶ میں ان کے دو اور متابع موجود ہیں۔ عمرؒ بن عامر[1] اور سعیدؒ بن ابی عروبہ[2] جب سلیمان تیمیؒ خود تحدیث کرتے ہیں اور ان کے تین ثقہ راوی متابع موجود ہیں تو پھر اعتراض کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟

دوسرا اعتراض:

حضرت امام بخاریؒ، امام دارقطنیؒ اور امام ابوداؤدؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت محفوظ نہیں ہے۔

لم یجیٔ بہ الا سلیمان التیمیؒ فی هذا الحدیث۔ (جزء القرأۃ ص ۵۶ وکتاب الکنیٰ ص ۳۵، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ وابوداؤد جلد ۱ ص ۱۴۰)

کیونکہ سلیمان تیمیؒ کے بغیر اس حدیث میں یہ زیادت اور کسی سے مروی نہیں ہے۔

---

[1] عمرؒ بن عامرؒ ـ یہ مسلم کے رواۃ اور رجال میں تھے۔ امام ابن معینؒ اور محدث عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور امام احمدؒ ان کو ثقہ اور ثبت فی الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۴۶۷)

[2] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ اور احد الاعلام لکھتے ہیں۔ امام ابن معینؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۷) امام دارقطنیؒ (المتوفی ۳۸۵ھ) اور امام بیہقیؒ نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عمرؒ بن عامرؒ اور سعیدؒ بن ابی عروبہؒ کی سند میں سالمؒ بن نوحؒ واقع ہے۔ جو قوی نہیں ہے اس لیے یہ روایت متابعت کے قابل نہیں ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶) لیکن یہ اعتراض چنداں وزنی نہیں ہے۔ کیونکہ سالمؒ بن نوحؒ سے امام مسلمؒ (مثلاً جلد ۱ ص ۲۳۶،

**جواب۔۔** ان اکابر کا یہ عذر قابلِ سماعت نہیں ہے :

**اولاً :** اس لیے کہ سلیمان تیمیؒ[1] بلا اختلاف ثقہ اور ثبت، متقن اور حافظ تھے۔ (جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں) اور تمام محدثین کا اس امر میں اتفاق ہے کہ ثقہ کی زیادت قابل قبول ہے۔ چند نقول ملاحظہ فرمائیں۔

علامہ قسطلانیؒ (المتوفی ۹۲۳ھ) لکھتے ہیں کہ صحیح مسلک یہ ہے کہ ثقات کی زیادت مطلقاً قابل قبول ہے۔ (قسطلانی جلد ا صث) علامہ حازمیؒ (الشافعیؒ المتوفی ۵۸۴ھ) لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی کی زیادت مقبول ہے۔ (کتاب الاعتبار ص ۲) امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ اور حافظ راوی کی زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (کتاب العلل ۲ ص ۲۴۰) امام حاکمؒ کا بیان ہے کہ فقہائے اسلام کا اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ متون اور اسانید میں ثقات کی زیادت مقبول ہوگی۔ (مستدرک جلد ا ص ۳) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ محدث ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ حافظ متقن اور مشہور راوی کی زیادت کا انکار ہرگز نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی زیادت بہر حال قابل قبول ہوگی۔ لیکن اگر کوئی ایسا راوی جو اس کے ہم پایہ نہ ہو اور متواتر حدیث میں ایک جملہ زائد کرے تو وہ زیادت قابل قبول نہیں ہے۔ (محصلہ کتاب القراۃ ص ۹۵) لیکن سلیمان تیمیؒ تو دوسرے راویوں سے بڑے حافظ ہیں۔

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ص ۲۹۹، ص ۳۵۰، ص ۳۵۶، جلد ۲ ص ۱۸۶، ص ۲۲۴، ص ۲۹۵، ص ۳۴۴، ص ۳۹۷، ص ۳۹۸ وغیرہ میں) اور ابن خزیمہؒ اور ابن حبانؒ نے اپنے اپنے صحیح میں احتجاج کیا ہے۔ (جوہر النقی جلد ا ص ۱۵۲) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ما بحدیثہ بأس ان کی حدیث میں کوئی خرابی نہیں۔ ابو زرعہؒ ان کو لا بأس بہ اور صدوق کہتے ہیں۔ امام یحییؒ کہتے ہیں ما بأس بذلک ان میں کوئی خرابی نہیں۔ ابن عدیؒ ان کی حدیثوں کو اقرب الی الصواب کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ساجیؒ ان کو صدوق اور ثقہ کہتے ہیں۔ ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۴۳، ۳۴۴) فریق ثانی ان کا موازنہ ذرا محمد بن اسحاقؒ سے کر دیکھے جن کی روایت سے ان کا احتجاج ہے۔ ع : وبضدھا تتبین الاشیاء

[1] امام دارقطنیؒ نے تشہد کے باب میں وحدہ لا شریک لہ کی زیادت کو جس میں سلیمان تیمیؒ متفرد ہیں صحیح تسلیم کیا ہے۔ دیکھو دارقطنی جلد ا ص ۱۳۴

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ جمہور محدثین اور علماء فقہ و اصول اس بات پر متفق ہیں کہ ثقہ راوی کی زیادت اور تفرد مقبول ہے۔ (تلخیص المستدرک جلد ۱ ص ۳۱) علامہ ماردینیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۵) علامہ زیلعیؒ کا بیان ہے کہ ثقہ متقن اور حافظ راوی کی زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (زیلعی جلد ۱ ص ۳۳۶) حافظ ابن حجرؒ بھی اس کی تصریح کرتے ہیں۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۳۷) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے۔ (توجیہ النظر ص ۲۶۳) مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی جب تنہا کوئی زیادت نقل کرے تو وہ صحیح ہے اور اگر کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ اس زیادت کو بیان کرتا ہو تو اس کے صحیح ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔ (تعلیق المغنی جلد ۲ ص ۳۸)

نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وشک نیست کہ زیادت ثقہ مقبول است۔ (بدور الاہلہ ص ۵۶) مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۵) مولانا گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اور زیادت ثقہ کی باتفاق جملہ محدثین قدیم و جدید کہ جن میں خود بخاری علیہ الرحمۃ بھی ہیں صحیح و معتبر ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ (ہدایۃ المعتدی ص ۵)

ان تمام اقتباسات سے یہ بات یقیناً اور حتماً ثابت ہو جاتی ہے کہ سلیمان تیمیؒ (جو بلا نکیر الامام، الحافظ ثقہ، ثبت اور شیخ الاسلام تھے) کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بالکل صحیح اور معتبر ہے۔ اس کا انکار کرنا فن حدیث کے طے شدہ اصول سے انحراف کرنا ہے جو یقیناً مردود ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ

---

ے یہ سب بحث روایتی حیثیت سے تھی اور درایتی لحاظ سے بھی یہ زیادت بالکل صحیح ہے مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت اس وقت شاذ اور نا قابل قبول ہوتی ہے جب اصل روایت کے منافی ہو اگر اصل اور ما قبل کے منافی نہ ہو تو جمہور محققین کے نزدیک وہ زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (ابکار المنن ص ۴۲) اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ما قبل (انما جعل الامام لیؤتم به) کے ہرگز منافی نہیں ہے بلکہ اس کے عین مطابق ہے کیونکہ انصات کرنا اور خاموش رہنا اتمام اور اقتدا کے ہرگز منافی نہیں ہے بلکہ جو لوگ امام کے پیچھے قرأت کے وقت خاموشی اختیار نہیں کرتے وہ درحقیقت مؤتم اور مقتدی کہلانے کے مستحق نہیں ہیں اس لیے کہ ان کی امام کے پیچھے قرأت کرنا سراسر

والزیادة مقبولة والمفسر یقضی علی المبهم اذا رواه اهل الثبت ... اھ (بخاری ج۱ ص۲۸)

زیادت مقبول ہے اور مفسر روایت مبہم پر حاکم ہے جب کہ اہلِ ثبت اس کو روایت کریں۔

امام خطیب بغدادیؒ لکھتے ہیں کہ

قال الجمهور من الفقهاء واصحاب الحدیث زیادة الثقة مقبولة اذا انفرد بها ..... اھ (کفایة ص۴۲۴)

جمہور فقہاءؒ اور محدثینؒ یہ فرماتے ہیں کہ ثقہ راوی جب منفرد ہو تو اس کی زیادت قابل قبول ہے

اور مختلف اقوال و آراء نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

والذی نختارہ من هذه الاقوال ان الزیادة الواردة مقبولة علی کل الوجوه ومعمول بها اذا کان راویها عدلاً حافظا ومتقنا ضابطا ..... اھ (کفایہ ص۴۲۵)

ان اقوال میں سے جو قول ہم اختیار کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ زیادت جہاں بھی وارد ہو وہ بہر صورت مقبول اور قابلِ عمل ہے جب کہ اس کا راوی عادل حافظ اور متقن ضابطہ ہو۔

اور نواب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ونیز زیادت ثقہ مقبول است مطلقاً نزد جماہیر از اہلِ حدیث وفقہ واصول قاله النووی ..... اھ (هدایة السائل ص۱۹۱) اور علامہ محدث حسین بن محسن انصاریؒ نے شاذ اور معلل پر بڑی نفیس بحث کی ہے اور لکھتے ہیں کہ جب ثقہ راوی زیادت نقل کرے تو وہ مستقل حدیث کے حکم میں ہے اس کو رد کرنے کا کیا معنیٰ ہے (البیان المکمل ص ۱۰، المنضم مع الدارقطنی) اور امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ

ومذهب الجمهور من الفقهاء والمحدثین قبولها مطلقاً (تقریب النواوی مع تدریب الراوی ص۱۵۶)

جمہور فقہاءؒ اور محدثینؒ کا مذہب یہ ہے کہ زیادتِ ثقہ مطلقاً مقبول ہے۔

اور علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ

وقد ادعی ابن الطاهر الاتفاق علی هذا القول ..... اھ (تدریب الراوی ص۱۵۶)

اور ابن طاہرؒ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس قول پر سب کا اتفاق ہے۔

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) اقتدار کے خلاف ہے۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص۱۴۳)

مؤلف خیر الکلام ص ۲۸۸ میں ایک راوی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب ان کا ثقہ ہونا ثابت ہوا تو اس صورت میں ان کا تفرد کوئی مضر نہیں ہوگا۔ ۔ ۔ اھ

حافظ ابن حجرؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

وعلی تقدیر تفرد الاوزاعیؒ بذکرھا لا یستلزم ذٰلك تخطئته لانها تكون زيادة من ثقة حافظ غير منافية لرواية رفقته فتقبل ولا تكون شاذة ولا معنی لرد الروایات الصحیحة بهذه التعليلات الواهية۔ (فتح الباری جلد ۱، ص ۲۴۷ طبع مصر۔)

اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس زیادت کے ذکر کرنے میں اوزاعیؒ متفرد ہے تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ان کی خطا ہے کیونکہ یہ ثقہ اور حافظ کی زیادت ہے اور یہ اس کے باقی رفقاء کی روایت کے منافی نہیں ہے سو یہ قابل قبول ہے اور شاذ نہیں ہے اور صحیح روایات کو ان رکیک بہانوں سے (کہ یہ شاذ ہیں) ٹھکرانے کا کوئی معنیٰ نہیں ہے۔

اور قاضی شوکانیؒ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ (نیل الاوطار جلد ا صد ۱۹۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ولا یلتفت الی تعلیل الحدیث به اذا کان الرافع ثقة۔ (نیل جلد ا ص ۲۰۲)

اور شاذ کہکر روایت کو معلول قرار دینے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جا سکتی جب کہ رافع ثقہ ہے۔

حضرات محدثین کرامؒ، فقہاء عظامؒ اور ارباب اصول کا یہ اتفاقی اجماعی اور طے شدہ قاعدہ ہے کہ جب راوی ثقہ اور حافظ ہو اور وہ زیادت نقل کرے تو مطلقاً اس کی روایت مقبول ہے اور بحمد اللہ تعالیٰ سلیمان تیمیؒ ثقہ اور حافظ ہیں لہٰذا ان کی زیادت واذا قرأ فانصتوا بہر حال مقبول ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا (صہ ۴۱۵، صہ ۴۱۷ میں) اور اسی طرح قاضی قاضی مقبول احمد صاحب کا (ملاحظہ ہو الاعتصام صہ ۹ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

امام بیہقیؒ کی تقلید میں اس کو شاذ کہنا بالکل غلط اور قطعاً باطل ہے اور تمام اصول کے خلاف ہے۔ جس کی حیثیت ایک پرکاہ کی بھی نہیں ہے اور اصولِ حدیث کے پیش نظر اس کو کوئی سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اپنے جی کو خوش کرنے یا اپنے حواریوں کا غم ہلکا کرنے کے لیے وہ بڑے شوق سے اس کو شاذ کہتے پھریں۔

وثانیاً۔ اس زیادت کے نقل کرنے میں سلیمان تیمیؒ متفرد نہیں، بلکہ صحیح ابو عوانہ کی روایت

میں ابو عبیدہؒ بھی اس زیادت کو نقل میں سلیمان تیمیؒ کے ساتھ ہیں اور ابو عوانہؒ کی سند کا صحیح ہونا خود مبارک پوری صاحبؒ کو بھی مسلم ہے۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ نیز عمرؒ بن عامر اور سعیدؒ بن ابی عروبہؒ بھی اس زیادت کو بیان کرتے ہیں اور دونوں ثقہ ہیں اور ان کی سند علی شرط مسلم صحیح ہے کما مرّ۔ الغرض فریق ثانی کا یہ اعتراض سراسر باطل ہے اور یہ اس حدیث کی صحت پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ

وما اعله البخاري فليس بقادح في صحته (تنوع العبادات ص۵۹)

امام بخاریؒ (وغیرہ) نے اس حدیث کو معلول ٹھہرانے کی جو کوشش کی ہے تو اس سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

• الحاصل سلیمان تیمیؒ کی یہ روایت بلا شک و شبہ بالکل صحیح ہے اور اس میں ان کی غلطی بتلانا ان پر بہتان باندھنا ہے۔ امام احمدؒ سے کسی نے سوال کیا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ سلیمان تیمیؒ نے خطا کی ہے تو امام احمدؒ نے جواب دیا، جس شخص نے سلیمان تیمیؒ کی طرف خطا کی نسبت کی ہے وہ ان پر بہتان باندھتا ہے (الجوہر النقی جلد ۲ صـ۱۵۵) اس روایت میں اصل قصور اور خطا ان رواۃ کی ہے جنہوں نے یہ صحیح زیادت ترک کر دی ہے۔ فسامحھم اللہ تعالیٰ بعموم فضلہ۔

مؤلف خیر الکلام نے اپنے پیشرو حضرات کے نقش قدم پر چل کر واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دھینگا دھینگی غیر مقبول اور شاذ بنانے کی کوشش ناکام کی ہے۔ اور شاذ کی تعریف پر مطلقاً غور نہیں کیا اور غور کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ پھر تو قلعی کھل جاتی تھی اگرچہ انھوں نے صـ۲۱۸ میں شرح نخبہ اور مقدمہ ابن الصلاح وغیرہ سے شاذ کی تعریف نقل کی ہے لیکن لفظ یخالف فیہ الناس پر غور نہیں کیا شاذ کی تعریف سنیئے حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ

قال الشافعيؒ ليس الشاذ من الحديث ان يروى الثقة ما لا يرويه غيره هذا ليس بشاذ وانما الشاذ ان يروى الثقة حديثا يخالف فيه الناس

شاذ وہ حدیث نہیں ہے جس کو ثقہ روایت کرے اور دوسرے روایت نہ کرتے ہوں بلکہ شاذ وہ روایت ہے جس کو ثقہ روایت کرتا ہو مگر اس میں دوسرے لوگوں کی مخالفت کرے

هذا الشاذ من الحديث

یہ ہے شاذ۔

(معرفۃ علوم الحدیث ص۱۱۹)

امام مسلمؒ فرماتے ہیں کہ

وعلامة المنكر في حديث المحدث اذا ما عرضت روايته للحديث على رواية غيره من اهل الحفظ والرضى خالفت روايتهم اولم تكد توافقها فاذا كان الاغلب من حديثه كذلك كان مهجور الحديث غير مقبوله ولا مستعمله ..... اھ (مسلم جلد ۱ ص ۵)

اور محدث کی قابل انکار حدیث کی علامت یہ ہے کہ جب اس کی روایت دوسرے اہلِ حفظ اور پسندیدہ راویوں کی روایت پر پیش کی جائے تو اس کی روایت ان کی روایت کے مخالف ہو یا ممکن ہی نہیں کہ اس کے موافق ہو پس جب اس کی حدیث پر اغلب یہ ہو تو اس کی حدیث متروک اور غیر مقبول ہوگی اور قابل عمل نہ ہوگی۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ

لان الزيادة اما ان تكون لا تنافي بينها وبين رواية من لم يذكرها فهذه تقبل مطلقا لانها في حكم الحديث المستقل الذي يتفرد به الثقة ولا يرويه عن شيخه غيره واما ان تكون منافية بحيث يلزم من قبولها رد الرواية الاخرى فهذه هي التي يقع الترجيح بينها وبين معارضها فيقبل الراجح ويرد المرجوح ..... اھ

(شرح نخبۃ الفکر ص ۳۷)

کیونکہ زیادت یا تو ایسی ہوگی کہ اس میں اور دوسرے راویوں کی روایت میں جنھوں نے اس کو ذکر نہیں کیا منافاۃ نہ ہوگی تو ایسی زیادت مطلقاً مقبول ہے کیونکہ یہ مستقل حدیث کے حکم میں ہے جس کے بیان میں ثقہ راوی متفرد ہو اور اس کے شیخ سے اور کوئی روایت نہ کرتا ہو اور یا وہ زیادت ایسی ہوگی کہ وہ دوسرے راویوں کی روایت کے منافی ہوگی اس حیثیت سے کہ اس کے قبول کر لینے سے دوسری روایت کا رد لازم آتا ہو تو اس میں اور اس کی معارض میں ترجیح کا سوال ہوگا راجح کو قبول کیا جائے گا اور مرجوح کو رد کر دیا جائیگا۔

اور تدریب الراوی میں ہے۔

ثم يفسرون الشذوذ بمخالفة الثقة من هو اوثق منه والمنقول عن ائمة الحديث المتقدمين كابن مهدي ويحيي القطان واحمد وابن معين وابن المديني والبخاري وابي زرعة وابي حاتم والنسائي والدارقطني وغيرهم اعتبار الترجيح فيما يتعلق بالزيادة المنافية بحيث يلزم من قبولها رد الرواية الاخرى .... اھ

(تدريب الراوي ص ۱۵۷)

پھر حضرات محدثینؒ شذوذ کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ ثقہ راوی ثقہ تر راوی کی مخالفت کرے اور متقدمین ائمہ حدیث مثلاً ابن مہدیؒ یحییٰ القطانؒ، احمدؒ، ابن معینؒ، ابن المدینیؒ بخاریؒ، ابو زرعہؒ، ابو حاتمؒ، نسائیؒ اور دار قطنیؒ وغیرہ یہ فرماتے ہیں کہ اعتبار ترجیح کا اس منافی زیادت سے متعلق ہے جس کا قبول کر لینا دوسری روایت کے رد کو مستلزم ہو۔

اور توجیہ النظر میں ہے۔

وزيادة راوي الصحيح والحسن تقبل مطلقاً ان لم تكن منافية لرواية من لم يذكرها لانها حينئذٍ كالحديث المستقل الذي ينفرد به الثقة ولا يرويه عن شيخه غيره فان كانت منافيةً لها بحيث يلزم من قبولها رد الرواية الاخرى بحث عن الراجح منهما فان كان الراجح منهما رواية من لم يذكر تلك الزيادة لمزيد ضبطه او كثرة عدده او غير ذلك من موجبات الرجحان ردت تلك الزيادة وان كان الراجح

صحیح اور حسن کے راوی کی زیادت مطلقاً مقبول ہے اگر وہ ان راویوں کی روایت کے مخالف نہ ہو جنھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ اس وقت مستقل حدیث کے حکم میں ہے جس کو ثقہ راوی انفرادی طور پر بیان کرتا ہے اور اس کے شیخ سے کوئی اور اس کا راوی نہیں ہے۔ پس اگر وہ زیادت دوسری روایت کے جس میں زیادت نہیں ہے بایں طور منافی ہو کہ اس زیادت کے قبول کر لینے سے اس روایت کا رد لازم آتا ہو تو یہاں راجح و مرجوح کی بحث چلے گی۔ اگر راجح ان راویوں کی روایت ہے جنھوں نے اس کو ذکر نہیں کیا۔ مزید ضبط

منها روایة من ذکر تلك الزیادة قبلت ...... اھ

(توجیه النظر ص ۲۱۹ و ۲۲۰)

یا کثرۃ عدد یا ترجیح کے اور اسباب میں سے کوئی سبب ہو تو اس زیادت کو رد کر دیا جائیگا اور اگر راجح اس کی روایت ہے جس نے اس کو ذکر کیا ہے تو زیادت قبول کر لی جائے گی۔

ان تمام اقتباسات سے روز روشن کی طرح یہ بات ثابت ہو گئی کہ شاذ اور غیر مقبول روایت میں حضرات محدثین کرامؒ کے نزدیک ایک بنیادی شرط ہے وہ یہ کہ اس کی روایت باقی ثقات کی روایت کے مخالف اور منافی ہو اور مخالفت اور منافات بھی بایں طور کہ اس کے تسلیم کر لینے سے ان باقی ثقات کی روایت (جس کو وہ اپنے ثقہ شیخ سے صحیح اور متصل سند کیساتھ روایت کرتے ہیں اور ان میں وجوہ ترجیح بھی موجود ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔) کا رد لازم آتا ہو اور اس زیادت کی اصل حدیث کے ساتھ موافقت کی مطلقاً کوئی راہ نہ پیدا ہوتی ہو (اولم تکد توافقھا) لیکن یہاں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کا معاملہ ہرگز ایسا نہیں ہے کیونکہ اس کی اصل روایت سے قطعاً کوئی مخالفت اور منافات نہیں ہے بلکہ یہ تو حدیث کے اول حصہ کی مؤید ہے جیسا کہ ہم نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے جس کا کوئی جواب مؤلف خیر الکلام نے نہیں دیا بلکہ جواریوں کو مغالطہ دینے کے لیے یہ لکھ مارا ہے کہ قبول کرنے والوں نے شذوذ کا کوئی جواب نہیں دیا (ص ۴۲۲) ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت انما جعل الامام لیؤتم بہ کی عین مؤید ہے۔ اس کے منافی اور مخالف ہرگز نہیں اس لیے یہ کسی صورت میں شاذ اور غیر مقبول نہیں ہے۔ رہا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جو لوگ اس زیادتی کو بقیہ حدیث کے منافی قرار دیتے ہیں۔ ان کی تقریر یہ ہے کہ شروع حدیث میں یہ جملہ ہے انما جعل الامام لیؤتم بہ کہ امام کی پیروی کرو اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں یہ لفظ بھی ہے فلا تختلفوا علیہ۔ سنن کبریٰ جلد ۲ صـ ۱۵۶ اس کے ساتھ مخالفت نہ کرو یعنی جس طرح امام کرے اسی طرح کرو اس جملہ کا تقاضا یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے پڑھے (محصلہ صـ ۴۳۱) تو یہ سب ان کی غفلت کا نتیجہ ہے:

اوّلاً — اس لیے کہ حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت میں انما جعل الامام لیؤتم بہ کا حصہ عمرؒ بن عامر اور سعیدؒ بن ابی عروبہ کے طریق سے آتا ہے اور مؤلف خیر الکلام توص۲۱۴ میں ان کی حدیث کو شاذ کہتے ہیں۔ پھر بقول ان کے اس شاذ پہ بنیاد رکھنا کیونکر صحیح ہے؟ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس روایت کا راوی سالمؒ بن نوحؒ ہے جو مؤلف خیر الکلام کے نزدیک ضعیف ہے۔

وثانیاً — فلا تختلفوا علیہ کا جملہ محمدؒ بن عجلانؒ کی روایت میں ہے اور وہ ان کے نزدیک وہمی ہیں پھر اس کا کیا اعتبار؟

وثالثاً۔ اگر امام کی مخالفت کا یہی معنیٰ ہے تو مقتدی نہ صرف یہ کہ سورۃ فاتحہ ہی پڑھیں بلکہ ماذاد بھی پڑھیں اور جہر کے ساتھ پڑھیں اور ہر ایک امام کی طرح مصلی پر کھڑا ہو۔ کیونکہ جو امام کرتا ہے سو مقتدی بھی کریں فلا تختلفوا علیہ پر پورا عمل ہونا چاہیے۔ الغرض ان رکیک تر جیہات سے اس صحیح زیادت کا انکار اور اس کو شاذ کہنا سراسر باطل ہے۔

## تیسرا اعتراض

مُبارک پوری صاحبؒ (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں قتادہؒ مدلس ہے اور عنعنہ سے روایت کرتا ہے اور مدلس کی معنعن روایت قابلِ التفات نہیں ہوتی۔
(تحقیق الکلام جلد۲ ص ۸۱ وابکار المنن ص ۵۸ وغیرہ)

جواب: یہ اعتراض بھی باطل ہے:

اوّلاً — اس لیے کہ یہ روایت مسلمؒ کی ہے اور بخاریؒ و مسلمؒ کی ثقہ ذات سے مروی جملہ روایات کے صحیح ہونے پر اُمّت کا اجماع و اتفاق ہے۔ اگر صحیحین کی معنعن حدیثیں صحیح نہیں تو امت کا اتفاق اور اجماع کس چیز پر واقع ہوا ہے جبکہ راوی بھی سب ثقہ ہیں

وثانیاً — یہ روایت ابو عوانہؒ کی ہے اور باقرار مبارکپوری صاحبؒ انہوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا ہے۔ لہٰذا قتادہؒ کی اس سند کا صحیح ہونا ظاہر ہے۔

وثالثاً — محدثین کا اتفاق ہے کہ مدلس راوی کی تدلیس صحیحینؒ میں کسی طرح بھی مضر نہیں ہے

---

۱؎ صحیحین کی تدلیس کے مضر نہ ہونے کا یہ قاعدہ امام نوویؒ و قسطلانیؒ کے علاوہ علامہ سخاویؒ (المتوفی ۹۰۲ھ)
(باقی نوٹ اگلے صفحہ پہ)

چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ

وما فی الصحیحین من التدلیس فمحمول علی السماع من جهة اُخریٰ۔

صحیح بخاری ومسلم میں جو تدلیس واقع ہو تو وہ دوسرے دلائل سے سماعت پر محمول ہے۔

(مقدمہ ص ۱۸ وشرح مسلم جلد ۱ ص۳۳)

یعنی اگر صحیحین میں کوئی مدلس راوی عنعنہ سے روایت کرتا ہے تو محدثین کرامؒ کے نزدیک وہ ایسی ہے جیسے اس راوی نے حدثنا اور اخبرنا وغیرہ سے تحدیث کی ہو اور علامہ قسطلانیؒ لکھتے ہیں کہ امام اعمشؒ، قتادہؒ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ سے بخاری ومسلم میں جو روایتیں عنعنہ سے مروی ہیں وہ سماع پر محمول ہیں۔ اگرچہ ہمیں ان کی تحدیث پر اطلاع نہ ہو سکے۔ کیونکہ امام بخاریؒ ومسلم سے متعلق ہم یہی اچھا اور نیک گمان قائم کر سکتے ہیں۔ (قسطلانی جلد ۱ ص ۹) امام سبکیؒ نے علامہ مزیؒ سے سوال کیا کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے جو روایتیں عنعنہ کے ساتھ نقل کی ہیں کیا ان میں صراحت کے ساتھ تحدیث بھی ثابت ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ اکثر روایات میں اس کا ثبوت موجود نہیں ہے مگر ہمیں تحسین ظن کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ (تدریب الراوی ص ۵۹)

مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۲۰ میں یہ لکھ کر اپنا دل خوش کر لیا ہے کہ مگر یہ قاعدہ ان احادیث میں چلتا ہے جہاں تنقید نہ ہوئی ہو۔ یہ قاعدہ ہر جگہ جاری نہیں ہوتا۔۔۔ الخ مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہیئے کہ قاعدہ مذکورہ بخاری اور مسلم کی تمام مدلس راویوں سے متعلق ہے صحیحین کی کوئی مدلس روایت اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں اور ایسی کوئی تنقید ان پر نہیں ہو سکی جس سے ان کی مدلس روایت ضعیف ہو سکے لہذا صحیحین کے رواۃ کی تدلیس کی آڑ لے کر صحیح حدیث کا انکار کرنا قانونِ روایت اور فن حدیث کے بالکل خلاف ہے جو بہر صورت مردود ہے۔ ہاں اگر کوئی راوی ضعیف ہوتا تو معاملہ جدا ہوتا۔

ورابعاً ــــ قتادہؒ کا شمار طبقۂ اولیٰ کے ان مدلسین میں ہوتا ہے جن کی تدلیس کسی کتاب میں مضر

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) نے فتح المغیث ص ۷۷ میں اور امام سیوطیؒ نے تدریب الراوی ص ۱۴۴ میں اور محدث عبد القادر القرشیؒ (المتوفی ۷۷۵ھ) نے الجواہر المضیۃ جلد ۲ ص ۴۲۹ میں اور نواب صاحبؒ نے ہدایۃ السائل ص ۱۹۱ میں پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نہیں ہے۔ چنانچہ امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ مدلسین کا ایک گروہ وہ ہے جو اپنے جیسے یا اپنے سے بڑھ کر یا اپنے سے کچھ کم ثقہ راویوں سے روایت کرتا ہے، مگر وہ اس زمرہ سے خارج نہیں جن کی روایتیں قابل قبول ہوتی ہیں سوا ایسے۔ مدلسین میں ابو سفیان طلحہؒ بن نافعؒ اور قتادہؒ بن دعامہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۱۰۳) علامہ جزائریؒ علامہ ابن حزمؒ سے محدثین کا ضابطہ بیان کرتے ہوئے ان مدلسین کی فہرست بتاتے ہیں جن کی روایتیں باوجود تدلیس کے صحیح ہیں اور ان کی تدلیس سے صحت حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا چنانچہ لکھتے ہیں کہ

منھم کان جلۃ اصحاب الحدیث وائمۃ المسلمین کالحسن البصری وابی اسحاق السبیعی وقتادہ بن دعامۃ وعمرو بن دینار وسلیمٰن الاعمش وابی الزبیر وسفیان الثوری وسفیان بن عیینۃ۔ (توجیہ النظر ص ۲۵۱)

ان مدلسین میں جلیل القدر محدث اور مسلمانوں کے امام شامل ہیں جیسے حسن بصریؒ، ابو اسحاق السبیعیؒ قتادہ بن دعامہؒ، عمروؒ بن دینارؒ، سلیمٰن اعمشؒ، ابو الزبیرؒ سفیان ثوریؒ اور سفیان علیینہؒ وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ پہلے تو صحیحین میں کسی راوی کی تدلیس مضر نہیں۔ قتادہؒ کی ہو یا کسی اور راوی کی اور پھر قتادہؒ کا شمار محدثین کے نزدیک ان مدلسین میں ہوتا ہے جن کی تدلیس کسی محل اور کسی موقع پر مضر نہیں ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ امام دارقطنی رح نے جو یہ کہا ہے کہ قتادہ رح مدلس ہیں۔ لہٰذا یہ روایت متصل نہیں مردود ہے اس لیے کہ ولا شک عندنا ان مسلماً رحمہ اللہ تعالیٰ یعلم ھٰذہ القاعدۃ ویعلم تدلیس قتادۃؒ فلولا ثبوت سماعہ عنہ ولم یحتج بہ الی ان قال و نسبۂ الی مثل قتادۃ الذی محلہ من العدالۃ والحفظ والعلم والغایۃ العالیۃ (شرح مسلم ج ۱ ص ۲۰۹) ——— اور ہمارے نزدیک اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ امام مسلم رح یہ قاعدہ جانتے ہیں کہ مدلس کا عنعنہ قبول نہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ قتادہ رح مدلس ہیں۔ اگر امام مسلمؒ کے نزدیک قتادہؒ کا سماع ثابت نہ ہو تو وہ اس سے احتجاج نہ کرتے۔ (پھر آگے فرمایا) اور امام دارقطنیؒ نے قتادہؒ جیسی شخصیت کی طرف ایسی بات منسوب کی ہے جن کا مقام عدالت اور حفظ اور علم اور کمال کے انتہائی درجہ کو پہنچا ہوا ہے ——— یہ حضرات محدثین کرامؓ کا طے شدہ ضابطہ ہے۔ علامہ ابن حزمؒ کی ظاہریت نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کہا ہے اور امام حاکمؒ نے بھی

اس کی تصریح کی ہے۔ کما مرّ۔

وخامساً۔ ہم مبارکپوری صاحبؒ اور ان کے اتباع کے مشکور ہوں گے کہ وہ بخاریؒ[1] مسلمؒ[2] کی ان جملہ روایات پر جن میں قتادہؒ نے عنعنہ کیا ہے۔ خطِ تنسیخ کھینچ دیں اور یا ان کے غیر صحیح ہونے کا کھلا اعلان کر دیں ؎

من نگویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بیں وکار آساں کن

مؤلف خیر الکلام نے وہی پرانی رٹ لگائی ہے کہ قتادہؒ مدلس ہیں اور حافظ ابن حجرؒ نے ان کو اپنی کتاب طبقات المدلسین میں تیسرے درجہ کا مدلس کہا ہے جن کی روایت بدون تصریح سماع صحیح نہیں اور امام حاکمؒ کا قول مجمل ہے اور معرفت علوم الحدیث ص۱۰۱ میں ہے کہ سلیمان شاذکونی فرماتے ہیں کہ جو شخص حدیث پر عمل کرنا چاہے وہ اعمشؒ اور قتادہؒ کی وہی روایت لے جس میں وہ سماع کی تصریح کریں اور بخاری میں قتادہؒ کی جو معنعن روایتیں ہیں وہ امام شعبہؒ کے طریق سے ہیں۔ (محصلہ خیر الکلام ص۴۲، ص۴۲۱) مگر یہ باتیں نہایت کمزور اور ضعیف ہیں۔

اولاً۔۔۔ اس لیے کہ قتادہؒ کی تدلیس کے بارے میں امام حاکمؒ کا قول مجمل نہیں بڑا مفصل ہے۔ وہ ان کو طبقۂ اولیٰ کا مدلس بتاتے ہیں جس طبقہ کی تدلیس قطعاً مضر نہیں ہوتی اور یہ محدثین کے ہاں طے شدہ امر ہے اور ہم نے فتح المغیث، تدریب الراوی اور ہدایۃ السائل وغیرہ کے حوالے درج کر دیے ہیں کہ صحیحین کی تدلیس مضر نہیں ہے۔ اس کا یہ جواب جو مؤلف خیر الکلام نے دیا ہے کہ مگر یہ قاعدہ ان احادیث میں چلتا ہے جہاں تنقید نہ ہوئی ہو۔ یہ قاعدہ ہر جگہ جاری نہیں ہوتا اور حدیث زیر بحث پر تنقید ہو چکی ہے بلفظہٖ (ص۴۲) قطعاً باطل اور سراسر مردود ہے۔ یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ بخاری اور مسلم کی اُن روایتوں میں تدلیس مضر ہے جن پر تنقید ہوئی ہو۔۔۔ حوالہ درکار ہے مطلب ان کے نزدیک یہ ہُوا کہ بخاری

---

[1] مثلاً بخاریؒ جلد ۱ ص۱۰۳/۱، ص۱۸۳/۱، ص۳۲۵/۱، ص۴۶۱/۱، ص۷۸۶/۲، ص۷۹۰/۲، ص۷۹۱/۲، ص۷۹۴/۲، ص۸۳۴/۲، ص۸۳۵/۲ –

[2] مثلاً مسلم جلد ۱ ص۱۸۸، ص۱۹۲/۱، ص۱۹۳/۱، ص۲۵۵/۱، ص۲۵۷/۱، ص۲۳۶/۱، ص۲۳۷/۱، ص۴۱۹/۱، ص۴۲۰/۱ وغیرہ وغیرہ۔

اور مسلم کی سب روایتیں صحیح نہیں کیونکہ انکی بعض روایتوں پر تنقید ہو چکی ہے تو پھر پرویز صاحب اور مودودی صاحب کا کیا قصور ہے ؟ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ بخاری و مسلم کی سب روایتیں صحیح نہیں ہیں اور یہی فریق ثانی کے شیخ الحدیث صاحب کہہ رہے ہیں مگر کسی غیر مقلد کو اس پر واویلا مچانے کی توفیق نہیں ہوئی ؟ آخر کیوں ؟ اگر انکی رائے کے مطابق کوئی اور بھی صحیحین کی بعض روایتوں پر تنقید کرے تو انکو چین بجبین نہیں ہونا چاہیے۔ بلاشک حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے طبقات المدلسین میں قتادہ رح کو تیسرے طبقہ کا مدلس کہا ہے مگر آخر میں اس سے رجوع کر لیا ہے۔

چنانچہ قاضی شوکانی رح حافظ ابن حجر عسقلانی رح کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

ونقل عنہ انہ قال لست راضیاً عن شیء من تصانیفی لانها عملتها فی ابتداء الامر ثم لم یتهیأ لی من یحررها معی سوی شرح البخاری ومقدمته والمشتبه والتهذیب ولسان المیزان وروی عنہ فی موضع آخر انہ اثنی علی شرح البخاری والتعلیق والنخبة.... اھ (البدر الطالع ص۸۹ طبع اول ۱۳۴۸ھ)

حافظ ابن حجرؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں اپنی کسی تصنیف پر راضی نہیں ہوں کیونکہ وہ میں نے ابتدائی دور میں لکھی ہیں اور تحریر کرنیوالا رفیق بھی مجھے میسر نہ ہو سکا (اس لیے ان تصانیف میں سقم رہ گیا ہے) ہاں فتح الباری اس کا مقدمہ مشتبہ تہذیب اور لسان المیزان پر میں خوش ہوں اور ان سے دوسری جگہ مروی ہے کہ انہوں نے فتح الباری، تعلیق اور نخبہ کی بڑی تعریف کی ہے

اس سے معلوم ہوا کہ حافظ موصوف بغیر ان چند کتابوں کے جن میں فتح الباری بھی ہے اپنی اور کسی تصنیف پر نہ راضی ہیں اور نہ اعتماد کرتے ہیں کیونکہ زندگی کے ابتدائی دور میں وہ کتابیں لکھی ہیں جن میں علم و عقل خام ہوتے ہیں اور قابلِ اعتماد رفیق بھی ان کو نصیب نہیں ہو سکا۔ تاکہ اس کی امداد شامل ہو جاتی اور ان کی ابتدائی کتابوں میں طبقات المدلسین بھی ہے۔ بخلاف اس کے فتح الباری اور دیگر چند کتابوں پر جن کے نام اوپر بیان ہو چکے ہیں وہ بڑے راضی ہیں اور فتح الباری (مثلاً جلد ۲ ص ۲۰۲ وغیرہ) میں قتادہؒ کی معنعن روایت کو صحیح کہہ رہے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے سابق نظریہ سے رجوع کر لیا ہے۔ اور مؤلف خیر الکلام ص ۲۰۶ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں قتادہؒ ہے جو تیسرے طبقہ کے مدلسین سے ہے اور یہاں عن کے ساتھ روایت کرتا ہے مگر بعض علماء نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے..... الخ مؤلف مذکور نے اس روایت

سے استدلال کیا ہے اور اس کی صحت پر کوئی کلام نہیں کیا کیوں ؟ اس لیے کہ ع:

آخر کو ہم دونوں در جاناں پہ جا ملے

وثانیًا — حضرات محدثین عظام رحمہم اللہ کے ضابطہ پر تو مؤلف خیر الکلام مطمئن نہیں ہیں اور سلیمان شاذکونی کی لاتوں کا سہارا تلاش کرتے ہیں اور یہ بتانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے کہ وہ کون ہے ؟ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ فیہ نظر ابن معینؒ نے اس کو حدیث میں جھوٹا کہا۔ ابو حاتم رحمہ اللہ اس کو متروک الحدیث اور نسائیؒ لیس بثقہ کہتے ہیں اور صالح جزرہؒ فرماتے ہیں کان یکذب فی الحدیث کہ حدیث میں جھوٹ کہتا تھا اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ وہ شراب پیتا اور بیہودہ حرکتوں میں آلودہ تھا اور نیز فرمایا کہ درب دمیک میں شاذکونی سے بڑا جھوٹا اور کوئی داخل نہیں ہوا۔ بغویؒ فرماتے ہیں کہ رماہ الائمۃ بالکذب ائمہ حدیث نے اس کو جھوٹ سے متہم کیا ہے اور امام یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں کہ کان یضع الحدیث کہ وہ جعلی روایتیں بنایا کرتا تھا۔ امام ابو احمد الحاکمؒ اس کو متروک الحدیث اور امام ابن مہدیؒ اس کو خائب اور نامراد کہتے تھے۔ امام عبد الرزاقؒ نے اس کو عدو اللہ، کذاب اور خبیث کہا اور صالح جزرہؒ کہتے ہیں کہ آنًا فانًا سندیں گھڑ لیتا تھا اور صالح بن محمدؒ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ کذاب اور لونڈے بازی سے متہم تھا۔ (محصلہ لسان المیزان جلد ۳ ص ۸۴ تا ۸۷) یہ ہے مؤلف خیر الکلام کا وکیل لا حول ولا قوۃ الا باللہ امام بخاریؒ نے شعبہؒ کے طریق کے علاوہ بھی بغیر تحدیث اور سوائے متابعت کے قتادہؒ کی بہت سی روایتیں لی ہیں۔ مثلاً جلد ۱ ص ۷۶، ص ۸۱، ص ۸۲، ص ۱۳۸، ص ۱۴۰، ص ۱۵۲، ص ۱۶۷، ص ۱۷۸، ص ۲۵۷، ص ۲۷۸، ص ۳۲۵، ص ۳۳۰، ۳۴۱، ۳۴۳، ۳۸۳، ۳۸۵، ۴۰۱، ۴۶۱، ۴۸۱، ۴۸۷ وغیرہ وغیرہ۔ کیا ان تمام روایتوں کو ضعیف سمجھا جائے۔ مؤلف خیر الکلام ہوش میں آکر جواب دیں۔ نری لفاظی بیکار ہے۔

وثالثًا — امام دارقطنیؒ ایک سند اس طرح نقل کرتے ہیں: عن قتادۃ عن ابی غلاب عن حطان بن عبد اللہ الرقاشی . . . . الخ اور آخر میں لکھتے ہیں کہ وھذا اسناد متصل حسن (جلد ۱ ص ۱۳۴) یہاں قتادہؒ عن سے روایت کرتے ہیں لیکن امام دارقطنیؒ اس کو متصل اور حسن کہتے ہیں۔

لطیفہ : اس حدیث میں سلیمان تیمیؒ وحدہ لا شریك له کی زیادت نقل کرنے میں متفرد ہیں اور امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ خالفہ ھشام وسعید وابان وابو عوانۃ وغیرھم عن قتادۃ ... اھ کہ یہ سب راوی سلیمان تیمیؒ کی مخالفت ہیں۔ بایں ہمہ یہ روایت نہ معلل ہے اور نہ شاذ بلکہ متصل اور حسن ہے مگر افسوس کہ یہی سلیمان تیمیؒ جب واذا قرأ فانصتوا کی زیادت نقل کریں اور ان کے ثقہ متابع بھی موجود ہوں تو روایت فوراً شاذ ہو جائے آخر کیوں ؟

وسابعاً — تحدیث کبھی یوں ہوتی ہے کہ خود راوی کہتا ہے حدثنی فلاں یا سمعت فلاناً یا اسی قسم کے اور الفاظ استعمال کرتا ہے اور کبھی لفظ عن ہوتا ہے لیکن اوپر کا راوی حدثہ یا یحدثہ کہتا ہے یہ بھی تحدیث ہی ہوتی ہے اور واذا قرأ فانصتوا کی روایت میں قتادہؒ کی تحدیث موجود ہے لہٰذا ان کو مدلس کہہ کر ان کی روایت کو رد کرنا قطعاً باطل اور یقیناً مردود ہے۔ چنانچہ ابو داؤد اور ابو عوانہ میں یوں ہے کہ

المعتمرؒ قال سمعت ابی ثنا قتادۃ عن ابی غلاب یحدثہ عن حطان بن عبداللہ الرقاشی ... اھ (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۴۰، ابو عوانہ ج ۲ ص ۱۳۲)

معتمرؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ (سلیمان تیمیؒ) سے سنا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے قتادہؒ نے بیان کیا وہ ابو غلاب سے روایت کرتے ہیں انہوں نے قتادہؒ سے بطریق حطانؒ بن عبداللہ الرقاشیؒ حدیث بیان کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابو غلابؒ نے قتادہؒ سے حدیث بیان کی ہے۔ تحدیث اور کیا ہوتی ہے؟ اور مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

یحدثہ ای یحدث ابو غلاب قتادۃ عن حطان بن عبد اللہ الرقاشی ... اھ (بذل المجہود جلد ۲ ص ۱۲۱)

یعنی ابو غلابؒ نے قتادہؒ سے حطانؒ بن عبداللہ الرقاشیؒ کے طریق سے حدیث بیان کی ہے۔

اس لیے قتادہؒ کی تدلیس کا بہانہ بھی سراسر باطل ہے کیونکہ اس روایت میں تحدیث موجود ہے صرف غیر بالغ نظر لوگوں نے لفظ عن سے دھوکا کھایا اور دیا ہے۔ امام نوویؒ

لکھتے ہیں کہ

وکذا قال وحدّث وذکر وشبہہا فکلہ محمول علی الاتصال والسماع۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۱)

اور اسی طرح لفظ قال اور حدّث اور ذکر اور ان کی مانند اور الفاظ اتصال اور سماع پر محمول ہیں۔

لہٰذا اصول حدیث کے رُو سے قتادہؒ کی یہ روایت متصل اور صحیح ہے باقی خوئے بدرا بہانہ ہائے بسیار مؤرخِ اسلام علامہ عبد الرحمٰن بن خلدونؒ (المتوفی ۸۰۸ھ) بخاری اور مسلم کی صحت اور مزیّت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ومن اجل ہذا قیل فی الصحیحین بالاجماع علی قبولہما من جہۃ الاجماع علی صحۃ ما فیہما من الشروط المتفق علیہا فلا تاخذک ریبۃ فی ذلک فالقوم احق الناس بالظن الجمیل بہم۔

اور اسی واسطے کہا گیا کہ بخاری اور مسلم کی روایات کے قبول کرنے پر اجماع ہے اس لیے کہ جو صحت کی متفق علیہا شرطیں ان میں موجود ہیں ان پر اجماع ہو چکا ہے لہٰذا اس بارے میں ذرہ بھر شک نہ کر کیونکہ وہ حضرات تمام لوگوں میں ظنِ جمیل کے زیادہ مستحق ہیں۔

اور صحیح مسلم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

ثم جاء الامام مسلم بن الحجاج القشیری رحمہ اللہ تعالیٰ فالّف مسندہ الصحیح حذا فیہ حذو البخاری فی نقل المجمع علیہ۔۔۔اھ (مقدمۃ ا ص ۴۴۰)

پھر امام مسلمؒ بن الحجاج القشیریؒ آئے اور انھوں نے اپنا مسند صحیح تالیف کیا جس میں وہ امام بخاریؒ کے نقش قدم پر چلتے رہے اور مجمع علیہا روایتیں نقل کرتے رہے۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ

ولکن الشیخان لا یذکران الا حدیثاً قد تناظرا فیہ مشائخہما واجمعوا علی القول بہ والتصحیح لہ اھ (حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص ۱۳۴)

اور لیکن امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ صرف وہی حدیث ذکر کرتے ہیں جس میں انھوں نے اپنے اساتذہ سے بحث و مناظرہ کیا ہوتا ہے اور جس کے بیان کرنے اور تصحیح پر ان سب کا اجماع ہو چکا ہے

اور علامہ حسین بن محسنؒ لکھتے ہیں کہ

وقد حصل الاتفاق على الحکم بصحة ما فی الصحیحین غیر المستثنیٰ ...اھ

بے شک اس بات پر اتفاق حاصل ہو چکا ہے کہ بخاری اور مسلم میں تمام روایتیں بغیر استثناء کے صحیح ہیں۔

(البیان المکمل ص ۲)

حضرات محدثین کرامؒ کا یہ فیصلہ ہے لیکن غیر مقلدین حضرات کے شیخ الحدیث صاحب بخاریؒ اور مسلمؒ کی صحیح روایات کو بھی مودودی صاحب اور پرویز صاحب کی طرح تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ فَوا اسفا ـــــ ترجمان الحدیث ماہ نومبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۳۷ میں جو بات ہمارے حق میں لکھی ہے وہ خود ان حضرات پر سو فیصد فِٹ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"ہم ناظرین کرامؒ سے ایمان اور دیانت داری کا واسطہ دیکر پوچھتے ہیں کہ اگر محدثین اور رواۃ حدیث کے متعلق یہ رائے صحیح ہے جس کا اظہار یہ حضرات کر رہے ہیں تو از راہ انصاف بتلایا جائے کہ کیا محدثین کی امانت و دیانت محفوظ رہی ؟ منکرین حدیث نے آخر کونسا تیر مارا جس کے زخموں سے ہم پریشان ہیں؟"

چوتھا اعتراض ۔ مبارکپوری صاحب (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو امام بخاریؒ، ابوداؤدؒ، ابوحاتمؒ، ابن معینؒ، حاکمؒ، دارقطنیؒ، ابن خزیمہؒ، ذہلیؒ، ابو علی نیشاپوریؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے یہ زیادت صحیح نہیں ہو سکتی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۸۳)

جواب ۔ ان حضرات کا اس زیادت کو صحیح نہ تسلیم کرنا اس بات پر مبنی تھا کہ اس زیادت کے بیان کرنے میں سلیمان تیمیؒ متفرد ہیں، نیز قتادہؒ کی طرح وہ مدلس بھی ہیں اور ان باتوں کے تسلی بخش اور مسکت جوابات آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ لہٰذا اس زیادت کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ اور مبارک پوری صاحبؒ اور ان کے اتباع مردم شماری کے لحاظ سے حق و باطل، صحیح و غلط میں تمیز قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں تو وہ بھی سُن لیں:

حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو صحیح سمجھنے والے یہ حضرات ہیں:

۱۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ (مسند احمد ۲ ص ۳۸۶، تعلیق الحسن جلد ۲ ص ۸۶، فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۲۔ امام مسلمؒ (صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴، درایہ ص ۹۴)

۳- امام نسائیؒ (بہ حوالہ فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۴- امام ابن جریرؒ (تفسیر جلد ۹ ص ۱۱)

۵- علامہ ابن حزمؒ (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۶- امام منذریؒ (عون المعبود جلد ۱ ص ۲۳۵ تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۴، تحقیق الکلام ۲ ص ۳۸، نفحۃ العنبر ۷۹)

۷- حافظ ابن کثیرؒ (تفسیر جلد ۲ ص ۲۸۰)

۸- امام اسحاقؒ بن راہویہؒ (جوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۷ تنوع العبادات ص ۸۶)

۹- امام ابوبکرؒ بن اثرمؒ (فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۱۰- حافظ ابن حجرؒ (فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰۱)

۱۱- امام ابوزرعہ رازیؒ (مقدمہ فتح الباری ص ۳۴۵ قسطلانی وتدریب الراوی ص ۳۱ ومقدمہ مسلم ص ۱۳ وازالۂ ستر ص ۵۲)

۱۲- امام موفق الدینؒ ابن قدامہؒ (مغنی جلد ۱ ص ۴۹۰)

۱۳- امام شمس الدینؒ ابن قدامہؒ (شرح مقنع للکبیر جلد ۲ ص ۱۳)

۱۴- امام ابن خزیمہؒ (برہان العجائب ص ۱۰۴، نفحۃ العنبر ص ۷۹)۔

۱۵- امام ابوعمرؒ بن عبدالبرؒ (نفحۃ العنبر ص ۷۹)

۱۶- شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (فتاویٰ جلد ص ۴۱۲ وتنوع العبادات ص ۸۶)

۱۷- امام ابوعوانہ (کیونکہ باقرار مبارکپوری صاحبؒ انھوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا ہے اور حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ کی روایت متعدد اسانید سے انھوں نے صحیح میں درج کی ہے۔

۱۸- نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ (عون الباری جلد ۱ ص ۳۲۳)

۱۹- علامہ ماردینیؒ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۷)

۲۰- علامہ عینیؒ (عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۵۶)

۲۱- امام ابن معینؒ [1]

---

۱؎ امام مسلمؒ سے ایک سائل نے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے صحیح میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کی سند کیوں بیان نہیں کی جب کہ وہ بھی آپ کے نزدیک صحیح ہے تو امام موصوف نے جواب ارشاد فرمایا کہ

لیس کل شیئ عندی صحیح وضعتہ ھاھنا انما وضعت ھاھنا ما اجمعوا علیہ۔ (مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴)

میں نے ہر اس حدیث کو جو میرے نزدیک صحیح ہے۔ اپنے صحیح میں درج کرنے کا التزام نہیں کیا بلکہ میں نے تو صرف وہ روایتیں درج کی ہیں۔ جن پر محدثین کا اجماع واقع ہوا ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

۲۲- امام عثمانؒ بن ابی شیبہؒ ۲۴- امام علی بن المدینی رح

۲۳- امام سعید بن منصور خراسانی رح ۲۵- امام ابن صلاحؒ وغیرہ وغیرہ محدثینؒ و فقہاءؒ اس حدیث کی تصحیح کرتے ہیں۔ جب سو فیصدی حنفی و مالکی اور حنبلی اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں اور جب شوافع اور غیر مقلدین حضرات کا ذمہ دار منصف مزاج اور معتدبہ گروہ واذاقرأ فانصتوا کی زیادت کو صحیح سمجھتا ہے تو اس کے صحیح ہونے میں کیا شک ہے؟ اور یہ بھی طے شدہ قاعدہ ہے کہ اثبات[۱] نفی پر مقدم ہوتا ہے۔ تو پھر نہ معلوم اس زیادت کی صحت کا انکار کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر محض مردم شماری سے مبارک پوری صاحبؒ میدان جیتنا چاہتے ہیں تو اس میں بھی ان کی شکست یقینی ہے۔ رہا مبارکپوری صاحبؒ کا امام ابن خزیمہؒ کو اس زیادت کی صحت کے منکرین میں شمار کرنا تو یہ باطل ہے۔ کیونکہ برہان العجائب کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ امام

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) حافظ ابن صلاحؒ نے مقدمہ صفحہ ۹ میں اور امام سیوطیؒ نے تدریب الراوی صفحہ ۴۲ میں اور علامہ جزائریؒ نے توجیہ النظر ص ۲۴۰ میں اس کی تصریح کی ہے کہ امام مسلمؒ کی مراد ما اجمعوا علیہ کے جملہ سے یہ محدث ہیں۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ، امام یحییٰؒ بن معینؒ، امام عثمانؒ بن ابی شیبہؒ، امام سعیدؒ بن منصورؒ خراسانی اور حافظ ابن حجرؒ ان میں امام علیؒ بن المدینیؒ کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۲۰۳) اور امام ابن صلاحؒ فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو امام مسلم اپنے صحیح میں صحیح سمجھتے ہیں اس کا صحیح ہونا نفس الامر میں یقینی ہے۔ (غایۃ المأمول جلد ۱ ص ۶) اس لحاظ سے گویا یہ تمام ائمہ حدیث حضرت ابو موسٰی الاشعریؓ کی اس زیادت والی روایت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

[۱] اثبات کا نفی پر مقدم ہونا محدثین کا طے شدہ مسئلہ ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ اثبات کو نفی پر ترجیح ہوتی ہے۔ (شرح مسلم جلد ۲ صفحہ ۵۰)

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ المثبت اولیٰ من النافی۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۹۴) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ المثبت اولیٰ من النافی (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۴۱) امیر یمانیؒ لکھتے ہیں: والاثبات مقدم (سبل السلام جلد ۱ ص ۲۴۲) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اثبات مقدم است بر نفی (بدور الاہلہ ص ۳۷۹) مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ من اثبت مقدم علی من نفی۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ص ۱۹۱) مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ یہاں جرح ہی اثبات ہے۔ تصحیح اثبات نہیں ہے کیونکہ تصحیح ظاہر سند کے اعتبار سے ہے۔ اور

(حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

موصوفؒ اس زیادت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح امام ابن معینؒ کو بھی منکرین صحت میں شمار کرنا غلط ہے۔ کیونکہ نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ مسلم کی تمام مسند روایتوں کو صحیح سمجھتے تھے جن میں حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادت والی روایت بھی شامل ہے۔ علاوہ بریں امام ابن معینؒ اور امام ابو حاتمؒ نے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت پر کلام نہیں کیا بلکہ انھوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں اس زیادت پر کلام کیا ہے، جس کا ذکر عنقریب ہوگا۔ (دیکھیے کتاب العلل ابن ابی حاتم جلد ۱ ص ۱۶۴ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹ و بغیۃ الالمعی جلد ۲ ص ۱۷) اس لیے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں اس زیادت کے انکار کرنے والوں میں ان کا شمار کرنا جہالت اور غفلت پر مبنی ہے۔

ووٹوں کی دنیا میں بھی دیکھ لیجیے کہ اس زیادت کے صحیح تسلیم کرنے والے زیادہ ہیں یا اس کے غلط قرار دینے والے : ع —— چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

## پانچواں اعتراض

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ اور حافظ ابو علیؒ کہتے ہیں کہ حضرت قتادہؒ کے جملہ تلامذہ میں سے سلیمان تیمیؒ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو نقل کرنے میں متفرد ہیں اور ائمہ حفاظ کی تضعیف

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) تضعیف شذوذ پر مطلع ہونے کی بنا پر بس جرح ہی اثبات ہے۔ (ص ۴۲۲) محض جی بہلانے کا ایک بہانہ ہے، ادائیگی کا بہانہ ہے، اس شعبدہ بازی سے اثبات کو نفی اور نفی کو اثبات بنا دینا کون تسلیم کرتا ہے؟ تصحیح صرف ظاہر سند کے لحاظ نہیں بلکہ ٹھوس اصول کے اعتبار سے ہے اور جرح کا مفہوم یہاں یہ ہے کہ روایت صحیح نہیں اور نفی کیا ہوتی ہے؟

[2] برہان العجائب مولانا محمد بشیر سہسوانیؒ (المتوفی ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء) غیر مقلد کی تالیف ہے۔

[1] امام مسلم کی ایک عبارت ملاحظہ کیجیے جس سے امام بیہقیؒ نے اصل مضمون کا حلیہ بگاڑ دیا ہے:

| | |
|---|---|
| وفی حدیث جریرؒ عن سلیمان التیمیؒ عن قتادۃؒ من الزیادۃ واذا قرأ فانصتوا ولیس فی حدیث احد منھم فان اللہ عز وجل | جریرؒ سلیمان تیمیؒ کے طریق سے قتادہؒ سے روایت کرتے ہیں اور اس میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بھی موجود ہے اور کسی کی روایت میں یہ مضمون نہیں ہے |

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی تصحیح پر مقدم ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) قال علی لسان نبیہٖ صلی اللّٰہ علیہ وسلم سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ الا فی روایۃ ابی کامل وحدہ عن ابی عوانۃ (مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴)

کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان پر سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کا حکم دیا ہے مگر یہ مضمون صرف ابو کامل کی روایت میں ہے جس کو وہ ابو عوانہ سے روایت کرتے ہیں۔

اس عبارت کو آپ اچھی طرح دیکھ لیں اور پھر امام بیہقی رح کے اس ادعاء کی داد دیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا لیس فی حدیث احد منھم (کتاب القرأۃ ص ۸۷) واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ان میں سے کسی کی روایت میں نہیں ہے۔ امام مسلمؒ کے قول ولیس فی حدیث احد منھم کا تعلق ماقبل واذا قرأ فانصتوا سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق مابعد فان اللّٰہ قال علی لسان نبیہ کے ساتھ ہے اور یہ مضمون صرف ابو کاملؒ کی روایت میں ہے اور کسی نے اس کو نقل نہیں کیا۔ مگر امام بیہقی رح ولیس فی حدیث احد منھم کا تعلق ماقبل واذا قرأ فانصتوا کے ساتھ جوڑ کر خود غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں اور دوسروں کو مغالطہ دے رہے ہیں فسامحہ اللّٰہ تعالیٰ بعموم فضلہ والعصمۃ بید اللّٰہ تعالیٰ۔ امام بیہقی رح ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ بعض علماء نے آیت کی تفسیر میں زیدؒ بن اسلمؒ کا قول نقل کیا ہے لیکن اس نے پوری عبارت نقل نہیں کی اور اس کا یہی وتیرہ ہے کہ عبارات میں سے وہ صرف اس حصہ کو نقل کر دیتا ہے جو اس کے مفید مطلب ہو سکتا ہے اور باقی عبارت چھوڑ دیتا ہے تاکہ دیکھنے والا غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ یہ ناقل کی دلیل ہے اور وہ اپنے دل میں یہ نہیں سوچتا کہ علیم بذات الصدور اس کے اس فعل سے واقف ہے اور بسا اوقات اس کی کتاب کو پڑھنے والا اس کی تلبیس پر مطلع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کے ساتھ ایسی مغالطہ آفرینی سے محفوظ رکھے۔ (کتاب القرأۃ ص ۹۴) مگر امام بیہقی رح دوسروں کی شکایت کرتے کرتے خود اس کے مرتکب ہو گئے ہیں۔ والمعصوم من عصمہ اللہ تعالیٰ۔ سہ

آپ ہی خود اپنے جور وجفا کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی۔

مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۲۸ میں غلط فہمی کے عنوان سے یہ بے مغز بات کہی ہے کہ امام بیہقی رح کی غلطی نہیں معترض کی غلطی ہے اور پھر آگے لکھا ہے کہ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ عبارت امام مسلمؒ کی ہو اور کچھ امام بیہقیؒ نے اپنی طرف سے کہ دی ہو۔ (محصلہ) مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہئیے کہ ادھر ادھر کی باتیں حقیقت پر پردہ نہیں ڈال

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وان سیماو لم یروها مسندۃ فی صحیحہ (نووی شرح مسلم جلد ا ص ۱۷۴) خصوصاً جب کہ اس روایت کو امام مسلمؒ نے اپنے صحیح میں باسند پیش بھی نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت مُسلم کی مسند روایتوں میں شامل نہیں ہے۔

جواب ۔ یہ بات جانے دیجئے کہ اس زیادت کے نقل کرنے میں سلیمان تیمیؒ متفرد ہیں یا کوئی اور بھی اس کو بیان کرتا ہے؟ اور یہ بات بھی جانے دیجئے کہ حفاظ حدیث اس کی تصحیح پر متفق ہیں یا تضعیف پر؟ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ حدیث جو حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور جس میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ہے۔ امام مسلمؒ کی مسند روایتوں میں ہے یا غیر مسند میں؟ امام نوویؒ کا یہ خیال کہ یہ مسند نہیں باطل اور مردود ہے۔ حافظ ابن حجرؒ اور قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ وھو حدیث صحیح اخرجہ مسلم من حدیث ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (فتح الباری جلد ۲ ص ۱۹۲ و نیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۰۷) حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ کی یہ روایت صحیح ہے اور امام مسلمؒ نے اس کی تخریج کی ہے۔ فریق ثانی اصولِ حدیث کی کتابوں کی طرف مراجعت کرکے دیکھ لے کہ محدثین کی اصطلاح میں تخریج کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اور کوئی محدث جب کسی سند کے ساتھ روایت بیان کرتا ہے اور اسی سند کے رواۃ میں سے کسی کی زیادت کو بیان کرتا ہے تو اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ مسند ہوتی ہے یا غیر مسند؟

علاوہ بریں اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ روایت امام مسلمؒ نے باسند پیش نہیں کی تو کیا ابو عوانہؒ اور ابو داؤدؒ وغیرہ نے بھی اس کو مسند روایت نہیں کیا؟ اور کیا کسی حدیث کی تصحیح اس میں ہی منحصر ہے کہ امام مسلمؒ اسے باسند نقل کریں تو صحیح ہوگی ورنہ ضعیف ہوگی؟ الغرض حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت امام مسلمؒ کی مسند روایتوں میں شامل ہے۔ اور امام نوویؒ کا یہ کھلا قصور ہے کہ اس کو غیر مسند قرار دیتے ہیں۔ یہی وہ عبارت ہے جس سے مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) سکتیں۔ بفضلہ تعالیٰ عربی دان کثرت سے موجود ہیں کسی ثالث عربی دان سے دریافت کرلیں کہ غلطی امام بیہقیؒ کی ہے یا بقول مؤلف مذکور معترض کی خواہ مخواہ کا تعصب اور جرات نہ بن سکتی ہو اس کو بھی بنا ڈالنا علماء کی شان کے خلاف ہے۔

امرتسری کو غلط فہمی ہوئی۔ اور علی رؤس الاشہاد ان کو شکست فاش ہوئی تھی۔ اس زیادت کے صحیح ہونے میں ذرا برابر شک وشبہ نہیں۔ البتہ۔ ع

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

## چھٹا اعتراض:

حافظ ابن حجرؒ، امیر یمانیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں۔ کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت صحیح ہے مگر اس سے مراد ما زاد علی الفاتحہ کی قرآت ہے۔ یعنی جب امام اور تم (مقتدی) سورۂ فاتحہ کی قرآت سے فارغ ہو جاؤ تو امام قرآت کرے اور تم خاموش رہو کیونکہ واذا قرأ فانصتوا عام ہے اور حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سورۂ فاتحہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۶، فتح الباری جلد ۲ ص ۱۹۲، سبل السلام جلد ۱ ص ۲۴۵)

**جواب:** ان حضرات کی یہ توجیہ اور تاویل قطعاً باطل ہے۔ اس لیے کہ مسلم اور ابو عوانہ وغیرہ کے حوالہ سے صحیح روایت ان الفاظ کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی جا چکی ہے۔

واذا قرأ فانصتوا واذا قال غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ فقولوا۔ آمین

کہ جب امام قرآت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

یہ عقدہ تو فریق ثانی ہی حل کرے گا کہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین سے قبل وہ کون سی قرآت ہے جس میں امام کا فریضہ قرآۃ کرنا اور مقتدیوں کا وظیفہ خاموش رہنا بتلایا گیا ہے؟ شاید ان کے نزدیک[1] اس اثنا میں سورۂ یٰسین کی قرآت سنت ہو جس کی امام قرآت کرتا رہے اور اس وقت مقتدی خاموش رہیں؟ اس صحیح حدیث کو پیش نظر رکھ کر بخوبی یہ

---

[1] مؤلف خیر الکلام لفظ قرآت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اثر اگرچہ مطلق ہے مگر قرآت بالاجماع چونکہ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے اس واسطے اس اثر سے فاتحہ خلف الامام کا پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔ (صفحہ ۵۲۱) اس اعتبار سے مقتدی کو سورۂ فاتحہ کی قرآۃ کے وقت اوّلاً و بالذات خاموش رہنا ضروری ہے کیونکہ بالاجماع قرآت یہاں ہی سے شروع ہوتی ہے۔

اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ تاویل قطعی طور پر باطل اور مردود ہے کیونکہ واذا قرأ فانصتوا کے حکم میں مقتدیوں کے لیے سورۂ فاتحہ کی قرأت کی ممانعت اولاً اور بالذات ہے اور قرآن کریم کی بقیہ سورتوں کی ممانعت ثانیاً اور بالتبع ہے۔ فریق ثانی کے سطحی قسم کے لوگ عموماً یہ مطالبہ کیا کرتے ہیں کہ ہمیں ایسی صحیح روایت بتلاؤ جس میں سورۂ فاتحہ کی قرأت کی مقتدیوں کے لیے ممانعت آئی ہو۔ سو طلبۂ کرام کو مسلم اور ابو عوانہ کی یہ صحیح حدیث پیش نظر رکھنی چاہیے اور حدیث نمبر ۲ وغیرہ ملاحظہ کریں اور اگر بالفرض اس حدیث میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت نہ بھی[1] مذکور ہوتب بھی یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ قرأت کرنا امام کا کام ہے نہ کہ مقتدیوں کا اس زیادت کے بغیر روایت کا مضمون یہ ہوگا۔ جب تم نماز پڑھنا چاہو تو اپنی صفیں درست کرلو۔ اور ایک تم میں سے امام بنے۔ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھے تو تم آمین کہو۔ اگر مقتدیوں پر بھی سورۂ فاتحہ کی قرأت لازم ہوتی تو اذا قال غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کے بجائے اذا قلتم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ ہوتا جیسا کہ فقولوا آمین میں قولوا جمع کا صیغہ ہے حالانکہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ پڑھنے کی نسبت صرف امام کی طرف ہوئی ہے اور یہ اس امر کی بین دلیل ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھنا صرف امام کا کام ہے۔ مقتدیوں کا کام صرف خاموش رہنا اور انصات کرنا ہے۔ ہاں البتہ آمین کہنے میں مقتدی برابر کے شریک ہیں اور صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۷۶ کی ایک روایت میں اس طرح آتا ہے

کہ اذا قال القاری غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فقال من خلفہ آمین الحدیث

کہ جب پڑھنے والا غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو جو اس کے پیچھے ہیں وہ آمین کہیں اس روایت میں شارع نے امام کو قاری اور پڑھنے والا کہا ہے اگر سب کے لیے قرأۃ لازم ہوتی تو صرف امام ہی قاری نہ ہوتا۔ (الدلیل المبین ص ۲۸۹) رہا حضرت عبادہؓ کی روایت کا حوالہ دینا تو اپنے مقام پر آئے گا کہ قرأت سورۂ فاتحہ برائے مقتدی کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا اس صحیح روایت سے اس کا تعارض قائم کرنا اور پھر اس کی تاویل اور توجیہ کرنا انصاف سے بعید تر ہے۔ سہ

---

[1] یہ روایت بخاری جلد ۱ ص ۱۰۸، نسائی جلد ۱ ص ۱۳۲ اور طیالسی صفحہ ۳۳۶ وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔

یہ کاوشیں بے سبب ہیں کیسی، کدورتوں کی کچھ انتہا بھی
زبان رکھتے ہیں ہم بھی آخر کبھی تو پوچھو، سوال کیا ہے؟

مؤلف خیر الکلام نے (ص ۴۲۳ وص ۴۲۴ میں) یہ کہ کر جان چھڑانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ معترض نے یہ سمجھا ہے کہ دونوں جملوں میں ترتیب ہے حالانکہ واؤ ترتیب کے لیے نہیں ہوتی جیسے مرزائی لفظ مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ میں ترتیب ثابت کرنے میں غلطی کرتے ہیں اسی طرح معترض نے بھی غلطی کی ہے اور دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ میں فانصتوا کا جملہ ولا الضالین کے بعد ہے مگر سند میں محمد بن یونس ہے جو ضعیف ہے۔ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر اس سے انصات کے محل کی تعیین ہوتی ہے (محصلہ) اور قاضی مقبول احمد صاحب نے الاعتصام ۲۶ راکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۸ میں بزعم خویش قرآن وحدیث کی چند مثالیں دے کر آخر میں یہ کہا ہے کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ واؤ ہمیشہ ترتیب کے لیے نہیں ہوتی اور اس زیر بحث حدیث میں بھی ترتیب نہیں ہے تو مولانا موصوف کا طلبہ کو نصیحت کرنا محض طفل تسلی ہے اور اس فقرہ سے ما زاد علی الفاتحہ مراد لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اھ

**الجواب**: یہ جو کچھ کہا گیا ہے بالکل بے جان ہے:

**اوّلاً**۔۔۔ اس لیے کہ اگرچہ جمہور نحاۃ وغیرہ اس کے قائل ہیں کہ حرف واؤ ترتیب کا فائدہ نہیں دیتا لیکن بعض اکابر ائمہ یہ فرماتے ہیں کہ اس میں ترتیب ہوتی ہے چنانچہ علم نحو کی مشہور کتاب مغنی اللبیب میں ہے کہ

وقول بعضهم ان معناها الجمع المطلق غير سديد لتقييد الجمع بقيد الاطلاق وانما هي للجمع لا بقيد وقول السيرافي ان النحويين واللغويين اجمعوا على انها لا تفيد الترتيب مردود بل قال بافادتها اياه قطربؒ والربعيؒ والفراءؒ وثعلبؒ

اور بعض کا یہ کہنا کہ حرف واؤ کا معنی جمع مطلق ہے درست نہیں ہے کیونکہ جمع کے ساتھ اطلاق کی قید لگ گئی ہے حالانکہ یہ بغیر قید کے جمع کے لیے ہے اور سیرافیؒ کا یہ کہنا کہ جملہ نحوی اور لغوی اس امر پر متفق ہیں کہ واؤ ترتیب کا فائدہ نہیں دیتی بالکل مردود ہے کیونکہ قطربؒ، ربعیؒ، فراءؒ

| | |
|---|---|
| وابوعمرو الزاهد وهشام والشافعی ونقل الامام فی البرھان عن بعض الحنفیۃ انھا للمعیۃ ... اھ (جلد ۲ ص ۱۳۱) | ثعلبؒ، ابو عمرو الزاہدؒ، ہشامؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ترتیب کا فائدہ دیتی ہے اور امام نے برہان میں بعض حنفیوں سے نقل کیا ہے کہ واؤ معیت کے لیے ہے۔ |

اور علامہ رضی لکھتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| ونقل بعضھم عن الفراء والکسائی وثعلب والربعی وابن درستویہ و بہ قال بعض الفقھاء انھا للترتیب ... اھ (رضی جلد ۲ ص ۳۰۶) | بعض نے فراءؒ، کسائیؒ، ثعلبؒ، ربعیؒ اور درستویہؒ سے نقل کیا ہے اور اسی کے بعض فقہاء قائل ہیں کہ حرف واؤ ترتیب کے لیے ہے۔ |

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ بہت سے فقہاء شافعیہ اور بعض نحویوںؒ کا یہی مذہب ہے کہ حرف واؤ ترتیب کو چاہتا ہے (محصلہ شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۳۲) اس سے معلوم ہوا کہ حرف واؤ کو ترتیب کے لیے ماننے والے بڑے بڑے ائمہ ہیں جن میں امام شافعیؒ وغیرہ بھی ہیں۔ لہٰذا معترض کو استدلال میں مرزائیوں سے تشبیہ دے کر اپنے دلِ ماؤف کی بھڑاس نکالنا اور حواریوں کو خوش کرنے کی بے جا سعی کرنا علمی دنیا میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔

وثانیاً۔ جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ حرف واؤ ترتیب کے لیے نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ترتیب ضروری اور واجب نہیں یہ کب کہا ہے کہ ترتیب ناجائز اور حرام ہے؟ کسی سُنّی عالم نے حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ کی یہ روایت پیش کی تھی کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بقید حیات تھے اور ہم یوں کہا کرتے تھے۔ ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ۔ (ترمذی جلد ۲ ص ۲۱۲ و قال حسن صحیح) یعنی اس ترتیب سے ہم ان کا تذکرہ کیا کرتے تھے تو اس پر ایک رافضی بدحواس ہو کر بولا کہ حرف واؤ ترتیب کے لیے نہیں ہوتا۔ سُنّی عالم بولا کہ ترتیب ناجائز اور حرام بھی تو نہیں ہے۔

وثالثاً۔ حدیث زیر بحث کے تین جملے ہیں: فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا آمین تو مؤلف خیر الکلام وغیرہ

---

۱؎ اور ابن رشدؒ نے نحاۃ کوفیہ کا یہی مسلک نقل کیا ہے کہ واو میں ترتیب ہوتی ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۱۶)

کے ذہن کے مطابق واذا قرأ فانصتوا اور واذا قال غیر المغضوب علیھم ..... الخ جو حرف واو کے ساتھ مذکور ہیں فاذا کبر فکبروا سے پہلے بھی ہو سکتے ہیں تو مطلب یہ ہو گا کہ امام کے تکبیر کہنے سے پہلے ہی تم خاموش رہا کرو اور غیر المغضوب ..... الخ پڑھا کرو اس لحاظ سے ماقبل التکبیر میں بھی انصات کی صورت نکل آئی جو فریق ثانی کو بڑی مفید رہے گی اور امام بھی تکبیر سے پہلے ہی غیر المغضوب علیھم ..... الخ پڑھ لیا کرے گا اور مقتدی بھی آمین کہہ لیا کریں گے کیونکہ حرف واو ترتیب کو نہیں چاہتا اس طرح انشاء اللہ تعالیٰ سب مسئلے حل ہو جائیں گے۔

ورابعاً۔ دارقطنی کی روایت کے متعلق خود مؤلف خیر الکلام نے ضعیف ہونے کا اقرار کیا ہے پھر اس سے تعیین محل کا سہارا بالکل بیکار ہے انتہائی تعجب ہے کہ صحیح ابو عوانہ اور صحیح مسلم کے ثقہ راویوں کی متابعت تو مؤلف کے نزدیک کالعدم ہے مگر محمد بن یونس (جس کے بارے میں مولانا شمس الحق صاحب غیر مقلد لکھتے ہیں کہ ھو ضعیف لا یحتج بہ (تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۵) کی روایت سے تعیین محلِ انصات ضرور ہو سکتا ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! آپ نے ملاحظہ کیا کہ فریقِ ثانی کس طرح بے جان اور بے وزن دلیلوں کا سہارا لیتا ہے۔

دوسری حدیث:

اِمام نسائی[۱] فرماتے ہیں کہ ہم سے جارودؒ بن معاذ ترمذیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو خالد الاحمرؒ[۲] نے بیان کیا۔ وہ محمد بن عجلانؒ[۳] سے روایت کرتے ہیں اور وہ زید بن اسلمؒ[۴]

---

[۱] امام نسائیؒ (المتوفی ۳۰۳ھ) جن کی کتاب سنن نسائی صحاح ستہ میں تیسرے درجہ پر مانی جاتی ہے۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الامام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۱)

[۲] امام نسائی رحؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مستقیم الحدیث ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۵۳) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تقریب ص ۶۴)

[۳] امام وکیعؒ ابن معینؒ اور ابن مدینیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ لا باس بہ اور ابو ہشام رفاعیؒ ثقہ اور امین کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں عجلیؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۲۲ و تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۸۱) علامہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابو صالحؒ[1] سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا اللھم ربنا ولک الحمد۔
(نسائی ج ۱ ص ۱۰۷)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتدار کی جائے سو جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللھم ربنا لک الحمد کہو۔

---

(باقی پچھلے صفحے کے حاشیے) ذہبیؒ ان کو الحافظ الصدوق اور مشہور محدث لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ا ص ۲۵۲) امام ترمذیؒ ان کو ثقہ اور مامون فی الحدیث کہتے ہیں۔ (ترمذی جلد ا ص ۶۷ وکتاب العلل جلد ۲ ص ۲۳۷) امام بیہقیؒ ان کو ثقات میں شمار کرتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ص ۴) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام فقیہہ اور عابد تھے۔ (تہذیب الاسماء قسم دوم جلد ا ص ۸۷) ابن عماد حنبلیؒ کا بیان ہے کہ وہ عابد پابند شریعت اور صداقت شعار تھے۔ (شذرات الذہب جلد ا ص ۲۲۴) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور القدوہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ا ص ۱۵) امام احمدؒ سفیانؒ بن عیینہؒ ابن معینؒ عجلیؒ ابو حاتمؒ نسائیؒ اور ابو زرعہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوبؒ بن شیبہؒ ان کو صدوق وسط کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ساجیؒ ان کو اہلِ صدق میں شمار کرتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو عابد ناسک اور فقیہ بتاتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۴۴) مولانا شمس الحقؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ (تعلیق المغنی جلد ا ص ۱۲۴ و عون المعبود جلد ا ص ۲۳۵) اور خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تاریخ جلد ۲ ص ۳۰۴)

۵ زیدؒ بن اسلم کو علامہ ذہبیؒ الامام اور الفقیہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ص ۱۲۴) امام احمدؒ ابو زرعہ، ابو حاتم، محمدؒ بن سعدؒ، نسائیؒ، ابن خراشؒ۔ اور یعقوبؒ بن شیبہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۹۶)

[1] ابو صالحؒ کا نام ذکوانؒ تھا۔ امام احمدؒ ان کو ثقہ اجل الناس اور اوثق الناس کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ا ص ۸۳) امام ابن معینؒ، ابو حاتمؒ، ابو زرعہ، ابن سعدؒ، ساجیؒ اور عجلیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محدث حربیؒ اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۱۹) حضرت ابو ہریرہؓ جلیل القدر
(باقی اگلے صفحہ پر)

اس صحیح روایت[1] سے بھی معلوم ہوا کہ تمام نمازوں میں امام کا وظیفہ قرأۃ کرنا اور مقتدیوں کا فریضہ خاموش رہنا ہے۔ اس حدیث پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ ملاحظہ کیجئے اور ساتھ ہی ان کے جوابات بھی دیکھ لیجئے۔

**پہلا اعتراض:**

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ[3]۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ اور مبارکپوری صاحب رحمۃ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت نقل کرنے میں ابو خالد الاحمر رحمۃ اللہ متفرد ہیں لہٰذا یہ زیادت قابل قبول نہیں۔ (جزء القرأۃ ص ۵۶، کتاب القرأۃ ص ۹۰، ابکار المنن ص ۱۵۲ اور مؤلف خیر الکلام نے صفحہ ۴۳۲ اور ۴۳۴ میں اس روایت کو شاذ کہ کر گلو خلاصی چاہی ہے اور قاضی مقبول احمد صاحب نے بھی اس کو شاذ کہ کر اپنے دل کو تسکین دی ہے۔ (ملاحظہ ہو الاعتصام ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۱۰ کالم ۱)

**جواب۔** اس زیادت کے رد کرنے کا یہ بہانہ محض بے کار ہے۔

---

(پچھلے صفحے کا باقی) صحابی ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب رحمۃ اللہ اس سند کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ رجال اسنادہ ثقات۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

[1] یہ روایت ابن ماجہ ص ۹۱، ابوداؤد جلد ۱ ص ۸۹، مسند احمد ۴ ص ۴۱۵، دار قطنی جلد ۱ ص ۱۲۴، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶، محلی جلد ۳ ص ۲۴۰، جزء القرأۃ ص ۵۶، کتاب القرأۃ ص ۹۱، ابن جریر جلد ۹ ص ۱۱۰، ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۳، الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۶، تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۴، عون المعبود جلد ۱ ص ۲۳۵، درایہ ص ۹۴، زیلعی جلد ۲ ص ۱۶، مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴، آثار السنن جلد ۲ ص ۸۷، ابکار المنن ص ۱۵۳، اعلاء السنن جلد ۴ ص ۵۵، دلیل الطالب ص ۲۹۴، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۳، بذل المجہود جلد ۲ ص ۵۵ اور فتح الملہم ص ۲۲ وغیرہ میں مروی ہے۔

[2] نواب صدیق حسن خان صاحب رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ در حدیث ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ است واذا قرأ فانصتوا پس حظ مؤتم انصات و استماع قرأت امام است و انصات خاص بجہریہ نیست بلکہ شامل سریہ ہم است پس واجب سکوت باشد مطلقاً نزد قرأت الخ (ہدایۃ السائل ص ۱۹۳)

[3] امام بخاری رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ لم یتابع علیہ مبارک پوری صاحب رحمۃ اللہ ایک سند کی تحقیق میں لکھتے (باقی اگلے صفحہ پر)

اوّلاً[1] — اس لیے کہ جب ابوخالدن الاحمرؒ بلا اختلاف ثقہ اور ثبت ہیں تو پھر ان کی زیادت کیوں قابل قبول نہ ہوگی؟

ثانیاً[2] — اس زیادت کے بیان[1] کرنے میں ابوخالدن الاحمرؒ متفرد نہیں بلکہ محمدؒ بن سعد انصاری اشہلیؒ بھی اس زیادت کو نقل کرتے ہیں۔ اور اس روایت کے باقی وہی راوی ہیں جن کی توثیق عرض کردی گئی ہے۔ البتہ محمدؒ بن عبداللہؒ بن مبارکؒ کا ذکر نہیں ہوا۔ اور ہیں وہ بھی ثقہ، نواب صدیق حسن خانصاحبؒ لکھتے ہیں کہ ابوخالدؒ از ثقاتِ اثبات است، بخاریؒ و مسلمؒ بوئے احتجاج کردہ اند۔ دریں صورت تفرد ش مضر نیست، و نیز وسے نہ تنہا بایں زیادت متفرد است، بلکہ ابوسعید محمدؒ بن سعد انصاریؒ نیز تابع او بریں زیادت بودہ است۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

غرضیکہ یہ زیادت بھی سابق کی طرح بالکل صحیح ہے اور اس کے غیر صحیح ہونے کا ادنیٰ احتمال بھی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسرا اعتراض:

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ محمدؒ بن عجلانؒ میں کچھ کلام اور مقال ہے۔ نیز وہ مدلس ہے۔

---

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ہیں کہ امام بخاریؒ کا محمدؒ بن عبداللہؒ بن الحسنؒ سے متعلق لایتابع علیہ کہنا ہرگز مضر نہیں کیونکہ محمدؒ مذکور ثقہ تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ا ص ۲۳۱) کیا ہم بھی مبارک پوری صاحب سے اس انصاف کی امید رکھ سکتے ہیں۔

[1] یہ روایت نسائی جلد ا ص ۱۰۷، دار قطنی جلد ا ص ۱۲۴، عون المعبود جلد ا ص ۲۳۵، نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۶ اور تعلیق المغنی جلد ا ص ۱۲۴ وغیرہ میں مذکور ہے۔

[2] امام نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ا ص ۱۰۱) دار قطنیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ا ص ۱۲۵) زیلعیؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (جلد ۲ ص ۱۶) ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۲۵۴) مولانا شمس الحقؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (عون المعبود جلد ا ص ۲۳۵ و تعلیق المغنی جلد ا ص ۱۲۴)

[3] حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور حافظ تھے (تقریب ص ۳۲۷) الحاصل اس روایت کے بھی جملہ راوی ثقہ ہیں۔ اور اصول حدیث کی رو سے یہ روایت اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔

اس لیے یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔ (ابکار المنن صد ۱۵۲)

**جواب** ۔ مبارک پوری صاحبؒ ان میں مقال کا شاید مطلب ہی نہیں سمجھے۔ رہی ان کی تدلیس تو وہ بھی مفروغ عنہ ہے۔

اوّلاً ۔۔۔ بقول بعض یہ مکحولؒ کے درجہ کے مدلس تھے۔ مگر فریقِ ثانی مکحولؒ کی تدلیس سے صرفِ نظر کر جاتا ہے۔ ۱

ثانیاً ۔۔۔ اگر ان کی تدلیس مضر ہوتی تو امام بخاریؒ اور ابو داؤدؒ وغیرہ ضرور اس کا تذکرہ کرتے مگر وہ صرف ابو خالدن الاحمر کے تفرد کی شکایت کرتے ہیں۔

ثالثاً ۔۔۔ دیگر محدثینؒ کو عموماً اور علامہ ذہبیؒ کو خصوصاً یہ قاعدہ معلوم ہے لیکن وہ محمدؒ بن عجلانؒ کی متعدد معنعن حدیثوں اور روایتوں کو صحیح کہتے ہوئے تصحیح کرتے ہیں۔ (مثلاً تلخیص مستدرک جلد ۱ صد ۱۳ وغیرہ)

رابعاً ۔۔۔ محدثینؒ اور محققینؒ کے صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ محمدؒ بن عجلانؒ، قتادہؒ، سفیانؒ ثوریؒ اور حسن بصریؒ وغیرہ کی طرح ان مدلسین میں شامل ہیں جن کی تدلیس کسی صورت میں مضر نہیں ہے۔

خامساً ۔۔۔ محمدؒ بن عجلانؒ کے دو متابع بھی موجود ہیں۔ خارجہؒ بن مصعبؒ اور یحییٰؒ بن علاءؒ (دیکھیے سنن الکبریٰ جلد ۲ صد ۱۵۱) اور گو یہ کمزور اور ضعیف ہیں لیکن متابعت میں پیش کرنے پر مبارک پوری صاحبؒ کو بھی کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ اس کا اقرار کرتے ہیں۔

---

۱ بعض لوگوں نے ان میں یہ کلام کیا ہے کہ امام بخاریؒ و مسلمؒ نے ان سے احتجاج نہیں کیا۔ لیکن یہ اعتراض باطل ہے۔ اوّلاً۔ اس لیے کہ ثقہ اور ثبت راوی کے لیے یہ شرط نہیں کہ ان سے امام بخاریؒ و مسلمؒ نے ضرور احتجاج کیا ہو۔ ثانیاً ۔ امام مسلمؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے (مستدرک جلد ۱ صد ۱۳، بذل المجہود جلد ۲ ص ۵۵ اور مسلم جلد ۲ صد ۳۱ وغیرہ ملاحظہ کر لیجیے) محمدؒ بن عجلانؒ بطریق سعید مقبریؒ عن ابی ہریرہؓ کی بعض روایتوں پر کچھ کلام کیا گیا ہے (کتاب العلل ترمذی جلد ۲ صد ۲۳ و تہذیب التہذیب جلد ۹ صد ۳۴۱) لیکن وہ بھی صرف چند روایتیں ہیں اور علامہ ذہبیؒ نے ان کا جواب بھی دے دیا ہے (میزان جلد ۳ صد ۱۰۲) مگر ہم نے جو سند پیش کی ہے وہ سعید مقبریؒ کے طریق سے نہیں بلکہ زیدؒ بن اسلمؒ کے طریق سے ہے۔

۲ دیکھئے ابکار المنن صد ۱۳۱/۱۲۹ اور دیگر محدثینؒ بھی اس قاعدہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

سادساً — جرح کرنے والے جرح پر بھی متفق نہیں ہیں۔ بعض ابو خالدؒ کا تفرد بتاتے ہیں اور بعض محمد بن عجلانؒ کی تدلیس اس سے بھی جرح کمزور ہو جاتی ہے۔ (اعلاء السنن جلد ۴ صفحہ ۵۹)

سابعاً — اگر محمدؒ بن عجلانؒ میں واقعی کوئی کلام ہوتا۔ یا ان کی تدلیس مضر ہوتی تو حضرات محدثین کرامؒ کی ایک بہت بڑی جماعت اس حدیث کی ہرگز تصحیح نہ کرتی، حالانکہ اس حدیث کی ذیل کے ائمہ حدیث تصحیح کرتے ہیں:

۱۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ (الجوہر النقی جلد ۲ صفحہ ۱۵۷) ۲۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (جلد ۱ صفحہ ۱۷۴)

۳۔ علامہ ابن حزمؒ (محلی جلد ۳ صفحہ ۲۴۰) ۴۔ امام نسائیؒ " (جلد ۱ صفحہ ۱۰۷)

۵۔ دارقطنیؒ (جلد ۱ صفحہ ۱۲۴) ۶۔ ابن جریرؒ " (تفسیر جلد ۹ صفحہ ۱۱۱)

۷۔ حافظ ابو عمرؒ بن عبدالبر (جوہر النقی جلد ۲ صفحہ ۱۵۷) ۸۔ حافظ ابن کثیرؒ (تفسیر جلد صفحہ ۶۲۳)

۹۔ علامہ ماردینیؒ (جوہر النقی جلد ۲ صفحہ ۱۵۷) ۱۰۔ امام منذریؒ (زیلعی جلد ۲ صفحہ ۱۶ و تعلیق المغنی

۱۱۔ علامہ جمال الدینؒ (نصب الرایہ جلد ۲ صفحہ ۱۶) جلد ۱ صفحہ ۱۲۴)

۱۲۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ (عون المعبود ۱۳۔ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ

جلد ۱ صفحہ ۲۳۵، تعلیق المغنی جلد ۱ صفحہ ۱۲۴) (دلیل الطالب صفحہ ۲۹۴)

بلکہ نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

وھذا الحدیث مما ثبت عند اھل السنن وصححہ جماعۃ من الائمۃ۔

(دلیل الطالب صفحہ ۲۹۴)

یہ حدیث اربابِ سنن کے نزدیک ثابت اور محقق ہو چکی ہے اور ائمہ حدیث کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس کی تصحیح کی ہے۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا حوالہ باب اوّل میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ بڑی شد و مد سے واذا قرأ فانصتوا کی روایت اور اس میں زیادت کو صحیح ثابت کرتے ہیں، علامہ ابن حزم رح

---

(بقیہ پچھلا صفحہ) ملاحظہ ہو میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۳ و مقدمہ نووی ص ۱۶ و کتاب القراۃ ص ۱۲۹ و تدریب الراوی ص ۸۰، اور اعلاء السنن ص ۴۲، اور لکھا ہے وھذا مجمع بین المحدثین مگر یہ یاد رکھیے کہ اصل راوی صرف مدلس ہو ضعیف اور کمزور نہ ہو۔ ورنہ متابعت بے سود ہو گی۔

لکھتے ہیں کہ بعض کا خیال ہے کہ اس زیادت میں محمدؒ بن عجلانؒ نے خطا کی ہے۔ مگر ہم ثقہ راوی کے بارے میں کسی واضح برہان کے بغیر یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ بہر حال سند کے لحاظ سے یہ زیادت بالکل صحیح ہے (محلی ابن حزم جلد ۳ ص ۲۴۲) انصاف سے فرمائیے کہ کسی حدیث کی تصحیح کے لیے اس سے بڑھ کر حضرات محدثین کرامؒ کے پاس اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ مگر ؎

آنکھیں اگر ہیں بند تو پھر دن بھی رات ہے

اس میں بھلا قصور ہے کیا آفتاب کا۔

الحاصل حضرات ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت بھی اور اس کی پوری سند بالکل صحیح اور بے غبار ہے اور محض تعصب کی وجہ سے اس کو شاذ کہکر رد کرنا بے سود ہے۔

تیسری حدیث: امام بیہقیؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبداللہؒ[2] نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے جعفر خلدیؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے الحسنؒ بن علیؒ بن شبیب المعمریؒ[4]

---

[1] امام بیہقیؒ کا ترجمہ باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے۔

[2] حافظ ابو عبداللہ الحاکمؒ صاحب مستدرک کا ترجمہ بھی باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے۔

[3] جعفرؒ بن محمدؒ بن نصیر الخلدیؒ، علامہ خطیبؒ ان کو ثقہ، صادق، دیندار اور فاضل لکھتے ہیں (تاریخ خطیب جلد ۷ ص ۲۲۶)

[4] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، العلامہ اور البارع لکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ حفظ اور فہم سے بہرہ ور تھے۔ امام دارقطنیؒ ان کو صدوق اور حافظ کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۲۱۵) ابن عدیؒ ان کو کثیر الحدیث اور امام ربانی کہتے ہیں۔ (ایضاً) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ تمام محدثین ان کے عادل ضابطہ اور صاحب فضیلت ہونے پر متفق ہو چکے ہیں۔ موسیٰؒ بن ہارونؒ کا بیان ہے۔ کہ وہ اوثق الناس اور اثبت الناس تھے اور ان کی یہ خوبی تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ محدث عبدان اہوازیؒ کا بیان ہے۔ کہ میں نے معمریؒ جیسا محدث تمام روئے زمین پر نہیں دیکھا۔ (لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۲۱ تا ۲۲۵ اور علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ علم کا ظرف تھے فہم و حفظ سے متصف تھے۔ ان کی احادیث میں کچھ

نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد بن مقدامؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے طفاویؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ایوبؒ نے بیان کیا۔ وہ زہریؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا قرأ الامام فانصتوا۔ (کتاب القراءۃ ص۹۲)

کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب امام قراۃ کرے تو تم خاموش رہو۔

اِس روایت میں بھی مقتدی کا وظیفہ (تمام نمازوں میں) خاموشی اور امام کا فریضہ قراۃ بتلائی گئی ہے اور اگر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جاتے تو اس روایت پر بھی کوئی معقول اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ گو امام بیہقیؒ نے یہ فرمایا ہے کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بیان کرنے میں المعمریؒ منفرد ہیں۔ لیکن جب معمریؒ ثقہ ثبت اور الحافظ اور الامام ہیں تو ان کی یہ صحیح روایت اور زیادتِ بیان کس طرح رد کی جا سکتی ہے؟ معمریؒ کے طریق سے ایک روایت کی امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ دونوں علی شرط الشیخین تصحیح کرتے ہیں (مستدرک جلد ا ص ۳۵۸) مؤلف خیر الکلام نے ص۴۳۵ اور ۴۳۶ میں یہ لکھا ہے کہ معمریؒ

---

(بقیہ پچھلا صفحہ) غرائب اور افراد بھی تھے۔ دارقطنی فرماتے ہیں کہ وہ صدوق اور حافظ تھے، ان پر جرح موسیٰؒ بن ہارونؒ نے از روئے عداوت کی ہے۔ (بغدادی جلد ۷ ص ۳۷۰)

۱؎ امام ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث اور صداقت شعار کہتے ہیں۔ محدث صالح جزرہؒ، مسلمہؒ بن قاسمؒ ابن عبد البرؒ اور دیگر محدثین ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن خزیمہؒ ان کو دانا محدث کہتے ہیں۔ نسائیؒ لا بأس بہ اور ابن عدیؒ صدوق کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ا ص ۸۱) علامہ ذہبیؒ ان کو احد الاثبات المسندین لکھتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ا ص۴۲)

۲؎ علامہ ذہبیؒ ان کو مشہور محدث اور ثقہ لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۳ ص۸۹) امام ابن معینؒ ان کو لیس بہ بأس اور ابن مدینیؒ ثقہ کہتے ہیں اور ابو داؤدؒ اور ابو حاتمؒ لیس بہ بأس سے ان کی توثیق کرتے ہیں ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں دارقطنیؒ کا بیان ہے کہ بخاریؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ تمام متقدمین ان کی ثقاہت پر متفق ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۰۹)

۳؎ امام احمدؒ ابن معینؒ، ابو زرعہؒ، نسائیؒ، ابن سعدؒ، دارقطنیؒ اور ابو داؤدؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ

(باقی اگلے صفحہ پر)

صاحبِ غرائب و افراد ہیں اور بعض محدثینؒ نے ان کو کذاب کہا ہے۔ عبدانؒ کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ حسد سے کہا ہے اور بغدادیوں کی طرح یہ بھی موقوف کو مرفوع کردیا کرتا تھا اور حدیث میں اضافے کرنے کی ان کی عادت تھی۔ (محصلہ خیر الکلام بحوالہ لسان المیزان)

**الجواب**: بخاری اور مسلم میں ایسے متعدد راوی موجود ہیں۔ مؤلف خیر الکلام کا شوق ہو تو ہم ماشاء اللہ تعالیٰ با حوالہ عرض کر سکتے ہیں اس لیے صاحبِ غرائب و افراد ہونا اصول حدیث کے لحاظ سے کوئی جرح نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے محض عداوت اور دشمنی کی وجہ سے ان پر جرح کی ہے اور کبھی یہ کہا کہ یہ موقوف کو مرفوع کر دیتے ہیں اور کبھی یہ کہا کہ یہ اضافے کرتے ہیں اور ان کے بڑے دشمن اور معاند موسیٰؒ بن ہارونؒ نے ان کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادت پر بھی انکار کیا تھا (ملاحظہ ہو لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۲۴) اور ان کی تقلید کرتے ہوئے لوگ اس پر جرح کرتے اور اس زیادت کو انکار کرتے ہیں جب محدثینؒ کے سامنے حقیقت حال کھل گئی تو انھوں نے بالآخر یہ فیصلہ کیا چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ

فاستقر الحال آخرا علیٰ توثیقہ فان غایة ماقیل فیه انه حدث باحادیث لم یتابع علیها وقد علمت من کلام الدارقطنیؒ انه رجع عنها فان کان قد اخطأ فیها کماقال خصمهٗ فقد رجع عنها وان کان مصیبا بها کماکان یدعی فذاك ارفع له واللہ اعلم۔

(لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۲۵)

پس آخر میں بات ان کی توثیق پر پکی ہوئی ہے زیادہ سے زیادہ ان کے بارے میں جو کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایسی حدیثیں بیان کرتے ہیں جن میں ان کی متابعت نہیں پائی گئی لیکن تم امام دارقطنیؒ کے کلام سے معلوم کرچکے ہو کہ انھوں نے رجوع کر لیا تھا سو اگر واقعی انھوں نے ان احادیث میں خطا کی تھی جیسا کہ ان کا خصم کہہ رہا ہے تو اس سے ان کا رجوع ثابت ہے اور اگر وہ مصیب تھے جیسا کہ ان کا دعویٰ تھا تو یہ ان کی شان کو اور اونچا کرنے کا سبب ہے۔

---

(بقیہ پچھلا صفحہ) ان کو صالح الحدیث اور ابن عبد البرؒ ثقہ اور حافظ کہتے تھے۔ ابن حبان ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۴۱۲)

[۱] ان کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور صحابی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ معمرؒ ثقہ ہیں اور ثبت بھی۔ اور ان کی یہ زیادت جو واذا قرأ فانصتوا سے وارد ہوئی ہے بالکل صحیح ہے کیونکہ دوسری اسانید میں ثقہ راویوں سے بھی یہ مروی ہے اور قرآت خلف الامام انصات کے بالکل خلاف ہے اور حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ کی روایتیں باب سوم میں آئیں گی کہ وہ بھی امام کے پیچھے سب یا بعض نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے اور شاذ مقبول کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مستقل حدیث ہو جس کو ثقہ راوی بیان اور روایت کرتا ہو انصاف کی دنیا میں اس کے رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں اور کسی حافظ کی قرآنِ کریم میں غلطی سے کوئی جملہ بڑھا دینا یہ شاذ مردود کی مثال ہے اس کو مؤلف خیر الکلام اپنے پاس ہی رکھیں۔ بات ثقہ راویوں کی زیادت کی ہو رہی ہے۔ الغرض واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بالکل صحیح ہے ایک رتی شک اس کی صحت میں نہیں ہے۔ قرآن کریم کی آیت میں فاستمعوا وانصتوا کا حکم تھا اور حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ بن مالک کی صحیح اور مرفوع روایتوں میں بھی اس کی تصریح ہے کہ واذا قرأ الامام فانصتوا اور ایک ایک سند کا صحیح ہونا بھی آپ معلوم کر آئے ہیں۔ اب ان کے حجت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وحدیث صحیح حجت است برامت در رنگ حجیت کتاب عزیز۔ (دلیل الطالب صفحہ ۸۸۰) اور لکھتے ہیں کہ اصل در امر[1] وجوب فعل مامور بہ است۔

(بدور الاہلہ ص ۲۲)

اور نیز تحریر فرماتے ہیں کہ امر لشئی نہی است از اضداد او۔ (بدور الاہلہ ص ۳۴۸) الغرض مقتدی کے لیے استماع اور انصات کے وجوب کا حکم اور امام کے پیچھے قرأت کرنے کے ممنوع اور منہی عنہ ہونے کا حکم قرآن کریم اور صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ دیکھیے فریق ثانی

---

[1] ارباب اصول کا اس امر پر تقریباً اتفاق ہے کہ امر مطلق کا مفاد وجوب ہے، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: "وامرہ المطلق علی الایجاب" (القواعد النورانیۃ الفقہیہ، طبع مصر ص ۵۲، لشیخ الاسلام) یعنی صاحبِ شرع کا امر مطلق وجوب پر محمول ہوتا ہے، شیخ الاسلام ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں: "وظاہر الامر الوجوب" (احکام الاحکام جلد ۱ ص ۳۵) امر ظاہری طور پر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ صیغۂ امر بے صارف محمول بر وجوب است۔

(افادۃ الشیوخ ص ۱۰۶)

مانتا ہے یا نہیں۔ کہیں وہ یہ نہ ارشاد فرما دے کہ ؎

یہ سب شوچ کر دل لگا یا ہے ناصح!

نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں۔

قرآن کریم کی آیت اور حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت ابو ہریرۃ رض و حضرت انس رض بن مالک کی پیش کردہ صحیح روایتیں اپنے عموم الفاظ کے اعتبار سے سری اور جہری سب نمازوں کو شامل ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ امام کے پیچھے اقتداء کر لینے کے بعد مقتدی کو سوائے استماع، انصات اور خاموش رہنے کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اب بعض ایسی روایتیں پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں خاص طور پر جہری نمازوں میں مقتدیوں کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کی سخت تنبیہ اور ممانعت آئی ہے۔ اور بعض روایتیں وہ بھی ہیں جن میں جہری نمازوں کی کوئی قید مذکور نہیں ہے بلکہ وہ سب نمازوں کو شامل ہیں۔

چوتھی حدیث۔ حضرت امام مالک رح، امام ابن شہاب زہری رح سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابن اکیمہ لیثی رح سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ حضرت ابو ہریرہ رض سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

---

لہ حضرت امام مالک اور امام ابن شہاب زہری رح دونوں کا ترجمہ مقدمہ ......... میں نقل کیا جا چکا ہے اور حضرت ابو ہریرہ رض صحابی ہیں۔ ابن اکیمہ لیثی رح کا نام عمارہ تھا۔ امام ابو حاتم رح اور یحییٰ بن سعید ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام یعقوب رح بن سفیان ان کا مشہور تابعین میں شمار کرتے ہیں۔ ابن حبان رح ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۴۱۱) امام بستی رح فرماتے ہیں کہ ابن اکیمہ اور ان کے بھائی دونوں ثقہ ہیں۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۸ و مرقات جلد ۱ ص ۵۴۲) شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح لکھتے ہیں کہ ابو حاتم رازی رح ان کو صحیح الحدیث اور حدیثہ مقبول لکھتے ہیں۔ ابو حاتم بستی رح کا بیان ہے کہ ان سے ان کے پوتے عمر بن مسلم، امام زہری اور سعید بن ابی ہلال نے روایت کی ہے۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۵) حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں۔ (تقریب ۲۷۶) مبارکپوری صاحب رح لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور اوساط تابعین میں تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۴) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی کی یہ شرط نہیں کہ اس سے روایت کرنے والے ایک سے زیادہ ہوں۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصرف من صلوٰۃ جهر فیها بالقرآۃ فقال هل قرأ معی منکم احد انفا فقال رجل نعم انا یا رسول اللہ قال فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی اقول مالی انازع القرآن فانتهی الناس عن القراۃ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک جہری نماز سے فارغ ہوئے اور یہ ارشاد فرمایا۔ کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرآت کی ہے؟ ایک شخص بولا۔ جی ہاں یا رسول اللہ! میں نے قرآت کی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا جبھی تو میں (اپنے دل میں) کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآن کریم کی قرآت میں منازعت اور رہا تھا پائی کیوں ہو رہی ہے؟ اس ارشاد کے بعد جن نمازوں میں آپ جہر سے

---

(بقیہ پچھلا صفحہ) جیسے ابن اکیمہ لیثی رحمۃ اللہ علیہ ثقہ ہیں۔ حالانکہ امام زہریؒ کے علاوہ اور کسی نے ان سے روایت نہیں کی۔ (ابکار المنن ص ۹۱) امام ابن معینؒ کا بیان ہے کہ ابن اکیمہؒ کی توثیق کے لیے یہی ایک دلیل کافی ہے کہ امام زہریؒ جیسے جلیل القدر امام ان سے روایت کرتے ہیں۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۸) حافظ ابن کثیرؒ اس حدیث کی امام ترمذیؒ اور ابو حاتم سے تحسین اور تصحیح نقل کرتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ۳ ص ۲۲۳) مولانا میر صاحبؒ ایک حدیث کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ یہ موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مسند روایت ہے جس کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ (بلفظہ تفسیر واضح البیان ص ۲۲۰)

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ نے جو یہ کہا ہے کہ ابن اکیمہ لیثیؒ ثقہ ہیں۔ مگر امام زہریؒ کے علاوہ اور کسی نے ان سے روایت نہیں کی تو یہ ان کا وہم ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ کا حوالہ پہلے نقل ہو چکا ہے کہ ان سے ان کے پوتے عمرؒ بن مسلمؒ (ان کی روایت صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۶۰ میں ہے ملاحظہ کیجیے) امام زہریؒ اور سعیدؒ بن ابی ہلالؒ نے روایت کی ہے۔ علاوہ ازیں ان سے ایک چوتھے راوی بھی ہیں۔ چنانچہ مستدرک جلد ۳ ص ۲۴۸ میں ہے عن ابی الحویرث عن عمارۃ بن اکیمۃ اللیثیؒ..... الخ ابوالحویرث کا نام عبدالرحمٰنؒ بن معاویہؒ تھا۔ ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۱۱۸) ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۲۷۲) لہٰذا علامہ ذہبیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ کی رائے صحیح نہیں ہے۔ ع خذ ماتراہ ودع شیئاً سمعت بہ۔

وسلم فیما جہر فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالقرأۃ حین سمعوا ذلک من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (موطا امام مالک ص ۲۹، ۳۰)

قرأت کیا کرتے تھے۔ لوگوں نے آپ کے پیچھے قرأت ترک کردی تھی۔

یہ روایت موطا امام مالک کے علاوہ حدیث کی دیگر معتبر[ل] اور مستند کتابوں میں مذکور ہے جس کے صحیح ہونے میں قطعاً کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت میں یہ روایت قطعی ہے۔

یہ واقعہ صبح کی نماز کا ہے۔ (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۷ و ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰ وغیرہ) جس میں تقریباً تمام حضرات صحابہ کرامؓ موجود ہوں گے، مگر ان میں آپ کے پیچھے قرأت کرنے والا صرف ایک شخص تھا اور آپ نے ان دیگر حضرات کو کچھ بھی نہیں کہا جنھوں نے قرأت نہیں کی تھی بلکہ اسی کو ڈانٹ ڈپٹ کی جس نے قرأت کی تھی اور حضرات صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے اس کا حوالہ نہیں دیا کہ حضرت آپ نے تو قرأت کرنے کا خود حکم دیا ہے۔ پھر کیا ممانعت کا کوئی جدید حکم آیا ہے؟ اور محال ہے کہ آپ نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کا حکم دیا ہو اور اس پر عمل کرنے والا صرف ایک ہی شخص ہو اور آپ نے قیام، رکوع، سجود اور قعدہ وغیرہ کو نیز تسبیح، تحمید اور تشہد کو ناگوار نہیں فرمایا۔ اگر ناگوار گزری ہے تو صرف مقتدی کی قرأت، جہری نمازوں میں اس سے بڑھ کر امام کے پیچھے قرأت کے منع ہونے کا اور کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے؟ مؤلف خیر الکلام کا (ص ۴۳۷ میں) یہ کہنا کہ اگرچہ حدیث میں لفظ مطلق قرأت ہے کہ جہری نمازوں میں قرأت سے باز آ گئے مگر قرائن کی

---

ل یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۱۰۶، ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰، ترمذی جلد ۱ ص ۴۲، ابن ماجہ ص ۶۱، مسند احمد جلد ۲ ص ۳۰۱، محلی جلد ۳ ص ۲۴۰، جزء القرأۃ ص ۵۵، ۲۲، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۷، کتاب القرأۃ ص ۹۹، کتاب الاعتبار ص ۹۷، الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۸، ابن کثیر جلد ۳ ص ۲۲۳، مرقات جلد ۱ ص ۵۳۴، فتاوی ابن تیمیہ ۲ ص ۱۴۹، عقیدۃ محمدیہ جلد ۲ ص ۱۸۹، فتح الملہم ۲ ص ۲۳، بذل المجہود ۲ ص ۵۷، تحقیق الکلام ۲ ص ۱۲۵، ابکار المنن ص ۱۵۵، فصل الخطاب ص ۳۳، اور اعلاء السنن جلد ۴ ص ۸۷ وغیرہ کتابوں میں مذکور ہے۔

بنا پر مطلق کی تقیید ہو سکتی ہے الخ بالکل ایک بے وقعت بات اور مطلب پرستی کے لیے صرف ایک بہانہ ہے جس کو ماننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے اور یہی بے سود بہانہ قاضی مقبول احمد صاحب نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو الاعتصام ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء صنا) اور انھوں نے اس مطلق قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر محمول کر کے بالکل ایک اور غیر معقول بات کہی ہے جو طفل تسلی سے بڑھ کر نہیں ہے۔ امام ابوبکر الرازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت جہر اور سر دونوں پر دلالت کرتی ہے کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر اور سر کا کوئی فرق بیان نہیں کیا۔ ہاں البتہ راوی نے اس کی تاویل یہ کی اور وہ یہ سمجھے کہ یہ جہر سے متعلق ہے۔ (محصلہ احکام القرآن جلد ۳ صا۵)

فریق ثانی کی طرف سے اس روایت پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کو ان کے جوابات کے ساتھ ملاحظہ کر لیجئے:۔

پہلا اعتراض: امام بیہقیؒ، علامہ حازمیؒ، علامہ ابن حزمؒ، امام نوویؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ ابن اکیمہ لیثی مجہول ہے۔ بنابریں یہ روایت قابلِ التفات نہیں۔ (سنن الکبریٰ ج۲ ص ۱۵۹، کتاب القرأۃ ص ۹۹، کتاب الاعتبار ص ۹۸، محلی جلد ۳ ص ۲۴۰، شرح مہذب جلد ۳ ص ۳۶۸ و ابکار المنن ص ۱۵۵ وغیرہ)

جواب: ان اکابر کا یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔ اوّلاً:۔ پوری تشریح کے ساتھ ابن اکیمہؒ کی توثیق نقل کی جا چکی ہے۔ اور باقرار میر صاحبؒ و مبارکپوری صاحبؒ موطا کی مسند روایت پر کلام نہیں کیا جا سکتا۔ اور ابن اکیمہؒ ثقہ تھے۔ پھر بھی اعتراض کیے جانا انصاف سے بالکل منافی ہے۔

ثانیاً:۔ حضرات محدثین کرامؒ کا یہ ضابطہ ہے کہ اگر کسی راوی کی دیگر محدثینؒ توثیق کریں (بلکہ اس سے روایت کرنے والا بھی اگر وہ اہلِ توثیق سے ہو خود توثیق کرے) تو اس پر جہالت کا الزام نہیں رہتا۔ وہ ثقہ اور عادل راویوں کی صف میں آجاتا ہے۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۷۰ و غنیۃ الالمعی ص ۵۲ ۳، مولانا شمس الحقؒ المنضم مع معجم الصغیر للطبرانیؒ) اور ابن اکیمہؒ کو دیگر محدثینؒ بھی ثقہ کہتے ہیں۔ اور امام زہریؒ (جن کا اہلِ توثیق میں پایہ بہت بلند تھا) بھی توثیق کرتے ہیں۔ اور چار راوی ان سے فن حدیث میں روایت کرتے ہیں۔ اندریں حالات ان کو مجہول کہتے جانا انصاف کا خون کرنا ہے۔

ثالثاً:۔ مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اگر کسی راوی پر جہالت کا الزام ہو اور امام ابن

حبانؒ اس کی توثیق کردیں۔ تو جہالت کا الزام رفع ہو جاتا ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۳۱) اور ابن اکیمہؒ کو ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ غرضیکہ کسی راوی سے متعلق ثقہ، ثبت اور عادل ہونے کے جتنے قواعد محدثین کرامؒ کے نزدیک ثابت ہیں۔ وہ تمام ابن اکیمہؒ میں پائے جاتے ہیں۔ اور جہالت سے نکلنے کا کوئی ضابطہ ایسا نہیں جو ان میں نہ پایا جاتا ہو۔ پھر فریق ثانی ہی انصاف سے فرمادے کہ ابن اکیمہؒ نے وہ کون سا جرم کیا ہے کہ ان کے لیے جہالت کے چکر سے نکلنے کے لیے کوئی دروازہ نہیں کھلتا۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ توثیق کا نام ہی جہالت ہے۔ ع

نام ان کا رکھ لیا ہے آسماں تحریریں

الحاصل فن حدیث کے لحاظ سے اس حدیث کے صحیح اور معتبر ہونے میں مطلقاً کوئی کلام نہیں ہے۔ رہا اس حدیث کا حضرت ابوہریرہؓ کے موقوف اثر (اقرأ بھا فی نفسک) سے معارضہ کرنا تو اس کی بحث اپنے مقام پر آجائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

**دوسرا اعتراض** ۔ حضرت امام بخاریؒ، امام بیہقیؒ، امام نوویؒ، مولانا ابو عبد الرحمٰن محمد عبد اللہؒ اور مبارکپوریؒ صاحب وغیرہ لکھتے ہیں کہ فانتھی الناس عن القرأۃ حین سمعوا ذلک من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان نہیں کیا بلکہ یہ حضرت امام زہریؒ کا بیان ہے۔ اور امام زہریؒ کی عادت تھی کہ مرفوع حدیث میں اپنا قول ملا دیا کرتے تھے۔ اور اس دعویٰ کی دو دلیلیں ہیں۔ **اوّل** ۔ امام لیث بن سعدؒ اور ابن جریجؒ فانتھی الناس الخ کا ٹکڑا اپنی روایت میں بیان نہیں کرتے۔ **دوم** ۔ امام اوزاعیؒ، امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| قال الزھری فاتعظ الناس فلم یکونوا یقرأون۔ (جزء القرأۃ ص ۲۳، ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۸) | امام زہریؒ نے فرمایا کہ اس قول سے لوگوں نے نصیحت حاصل کرلی اور امام کے پیچھے قرأت ترک کردی۔ |

اس سے ثابت ہوا کہ یہ جملہ امام زہریؒ کا مدرج ہے اور یہ حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ نے یہ بات تو اچھی طرح محفوظ رکھی ہے (کہ فانتھی الناس الخ امام زہری کا مدرج ہے، مگر شومئ قسمت کہ) الا وانہ لم یحفظ اسنادہ۔ لیکن وہ اس کی سند محفوظ نہیں ..... رکھ سکے۔

(جزء القرآۃ ص ۲۳، کتاب القرآۃ ص ۶۹ وسنن الکبریٰ جلد۲ ص ۱۵۸، شرح مہذب ص ۳۷۰، عقیدۂ محمدیہ جلد۲ ص ۱۹۰ وغیرہ واللفظ للبیہقیؒ)

جواب - اِن حضرات کا یہ کہنا کہ یہ قول امام زہریؒ کا ہے اور مطلب یہ ہے کہ تابعینؒ نے امام کے پیچھے قرأت ترک کردی تھی..... محض دفع الوقتی پر مبنی ہے اور اصول کے لحاظ سے یہ غلط ہے۔

اوّلاً - اس لیے کہ امام بیہقیؒ کا بیان ہے کہ جو جملہ حدیث مرفوع کے ساتھ بیان ہو وہ مرفوع ہی ہوگا۔ اِلّا یہ کہ اس کے مدرج ہونے پر قاطع دلیل قائم ہو۔ (تلخیص الجبیر ص ۱۲۶) اور کمزور سند اور محض احتمال سے اوراج ثابت نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ محض احتمال سے ادراج ثابت نہیں ہوسکتا۔ (فتح الباری جلد۱۱ ص ۴۲۵) اور اس کے مدرج ہونے کی کوئی عقلی اور نقلی صحیح دلیل موجود نہیں ہے۔

ثانیاً - امام بیہقیؒ[1]، علامہ حازمیؒ[2]، حافظ ابن حجرؒ[3] اور امام نوویؒ[4] لکھتے ہیں۔ واللفظ لہ۔

وبیّنا انّ الصحیح بل الصواب الذی علیہ الفقہاء والاصولیون ومحققوا المحدثون انہ اذا روی الحدیث مرفوعًا وموقوفًا او موصولًا ومرسلًا حکم بالرفع والوصل لانہا زیادۃ ثقۃ وسواء کان الرافع والواصل اکثر اواقل فی الحفظ والعدد۔ (شرح مسلم جلد۱ ص ۲۵۶)

ہم بیان کر آئے ہیں کہ صحیح بلکہ خالص حق بات یہ ہے جس پر فقہاء، علماءِ اصول اور محقق محدثین متفق ہیں کہ جب کوئی حدیث مرفوع اور موقوف روایت کی گئی ہو۔ یا موصول اور مرسل بیان ہوئی ہو تو اس صورت میں حدیث مرفوع اور متصل ہی سمجھی جائے گی چاہے رفع اور وصل کرنے والے حفظ اور عدد میں زیادہ ہوں یا کم حدیث بہرحال مرفوع ہوگی۔

علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں کہ اگر ایک ہی ثقہ راوی سے معاً دو مسئلوں میں اختلاف پیدا ہو کہ

---

[1] کتاب القرآۃ ص ۴۶

[2] کتاب الاعتبار ص ۱۲

[3] تلخیص الجبیر ص ۱۲۶

[4] شرح مسلم جلد۱ ص ۲۵۶ - اور امام نوویؒ نے جلد۱ ص ۲۸۲ و جلد۱ ص ۲۴۲ و جلد۲ ص ۴۰ میں بھی اس کا ذکر کیا ہے اور جلد۱ ص ۲۸۲ میں حضرت امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کا خاص طور پر نام ذکر کیا ہے۔

کسی وقت وہ موصول بیان کرتا ہے اور کسی وقت مرسل یا کسی وقت وہ مرفوع بیان کرتا ہے
اور کسی وقت موقوف۔ تو صحیح قول کی بنا پر اس کے موصول اور مرفوع ہونے کا حکم کیا جائے گا نہ
کہ مرسل اور موقوف ہونے کا۔ (شرح الفیہ جلد ا ص ۸۳)
نواب صاحب لکھتے ہیں کہ اذا کان الواصل ثقۃ فھو مقبول۔ (دلیل الطالب صفحہ ۲۷)
اور نیز فرماتے ہیں کہ
اختلافے کہ در رفع ووقف او ست قادح در حجیت نہ باشد چہ رفع زیادت است
(ایضاً صفحہ ۱۴۴)

اور نیز لکھتے ہیں کہ قال شیخنا و برکتنا الشوکانیؒ وھو الحسن اذا جاءت الزیادۃ من طریق
الثقۃ۔ (ایضاً ص ۴۶۱) امام زہریؒ کی ثقاہت اور عدالت بھی بالاتفاق مسلم ہے۔ اس لیے
اس طے شدہ قاعدہ کے رو سے یہ جملہ بھی مرفوع ہی ہوگا۔
ثالثاً۔ امام ابوداؤدؒ، ابن ابی السرحؒ[1] سے روایت کرتے ہیں وہ معمرؒ[2] سے اور وہ امام زہریؒ
سے وہ فرماتے ہیں کہ

قال ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ فانتھی الناس۔ (ابوداؤد جلد ا ص ۱۲۰) کہ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا۔ لوگوں نے قرأت ترک کردی تھی۔

---

[1] ابن ابی السرحؒ کا نام احمد بن عمروؒ بن عبداللہؒ بن عمروؒ بن السرح تھا۔ محدث علیؒ بن الحسنؒ بن خلفؒ کا بیان ہے
کہ وہ ثقہ ثبت اور صالح تھے۔ ابوزرعہؒ اور ابوحاتمؒ لا بأس بہ سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابن
یونسؒ ان کو فقیہ اور من الصالحین الاثبات کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب
جلد ا ص ۶۴) جب یہ ثقہ اور ثبت ہیں تو امام ابوداؤدؒ کے باقی چار اساتذہ اگر اس کو نقل نہیں کرتے تو نہ
کریں زیادت ثقہ مطلقاً مقبول ہے۔ اس لیے مؤلف خیر الکلام کا یہ عذر لنگ بھی قابل سماعت نہیں
ہے اور اسی طرح لیث بن سعدؒ وغیرہ کا اس جملہ کو نکال دینا اور امام زہریؒ کا سانس پھولنے یا کھانسی
وغیرہ کی وجہ سے اس کو آہستہ پڑھنا بھی ہرگز ادراج کی دلیل نہیں ہے۔
[2] معمرؒ بن راشد کو علامہ ذہبیؒ الامام الحجہ احد الاعلام اور عالم یمن لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ا ص ۱۷۱)
حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۶۰) امام احمدؒ بن حنبلؒ سے سوال کیا گیا کہ امام
(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اس صحیح روایت سے معلوم ہوگیا کہ یہ حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے۔ نہ یہ کہ امام زہریؒ کا مدرج ہے۔ جب معمرؒ کا اثبت الناس فی الزہریؒ ہونا محدثین کا طے شدہ قاعدہ ہے۔ تو امام لیثؒ بن سعدؒ اور ابن جریجؒ کا اس جملہ کو نہ نقل کرنا اس کے مدرج ہونے کی ہرگز دلیل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس میں صحیح اور صواب بات معمرؒ ہی کی ہوگی خصوصاً جبکہ وہ مثبت بھی ہیں۔

رابعاً۔ گو امام اوزاعیؒ بہت بڑے محدث فقیہ اور امام تھے۔ لیکن کتب الرجال میں اس کی تصریح موجود ہے کہ امام زہریؒ سے جو روایت وہ کرتے ہیں وہ حجت نہیں ہو سکتی حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ کی امام زہریؒ اور یحییٰؒ بن ابی کثیرؒ سے جملہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں۔ (کتاب الانصاف ص ۱۰۲ و کتاب العلم ص ۱۰۲) امام ابن معینؒ کا بیان ہے کہ اوزاعیؒ فی الزہری لیس بذاك (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۲۴۱) کہ امام اوزاعیؒ زہریؒ سے روایت کرنے میں قابل اعتبار نہیں ہیں۔ امام یعقوبؒ بن شیبہؒ کا بیان ہے کہ امام اوزاعیؒ ثقہ اور ثبت تھے۔ لیکن انکی زہریؒ سے جملہ روایتیں کمزور اور ضعیف ہیں۔ (ایضاً) یہ راوی ضعیف نسبتاً نہیں ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۴۰ میں لکھا ہے۔ اور دھوکہ دیا ہے بلکہ یہ محدثینؒ کی تصریح کے مطابق زہریؒ کی روایت میں حقیقتہً ضعیف ہے۔ انصاف شرط ہے کہ امام معمرؒ کی روایت کو (جو اثبت الناس فی الزہریؒ ہیں) چھوڑ کر امام اوزاعیؒ کی روایت کو (جن کی زہریؒ

---

(بقیہ پچھلا صفحہ) زہریؒ کے تلامذہ میں سے زیادہ ثبت کون ہے؟ فرمایا معمرؒ اثبت الناس فی الزہریؒ۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۵۵) امام ابن معینؒ کا بیان ہے کہ معمرؒ اثبت الناس فی الزہریؒ۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۷۹) لہٰذا زہریؒ کی سب سے زیادہ معتبر اور مستند روایت صرف معمرؒ بن راشدؒ کے طریق ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس متصل حدیث کو مرسل کہنا، جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۳۹ میں کہا ہے بالکل باطل اور مردود ہے۔ اور قاضی مقبول احمد صاحب نے اسے موقوف صحابی اور فہم صحابی کہہ کر گلو خلاصی چاہی ہے جو انتہائی جہالت ہے۔ یہ فہم صحابی نہیں یہ روایت حدیث ہے کہ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تو اس کے نتیجے میں لوگ ہر قسم کی قرأت سے بالکل باز آگئے۔ یہ روایت ہے نہ کہ فہم صحابی۔ اس لئے یہ حدیث بالکل صحیح اور قابل قبول ہے۔ البتہ نہ ماننے کا کوئی علاج نہیں۔

کے طریق سے تمام روایتیں کمزور اور ضعیف ہیں۔) کیونکر ترجیح دی جاسکتی ہے؟ امام بیہقی رحؒ پر امام اوزاعیؒ کی یہ نوازش ہوتی ہے کہ اتنا تو وہ یاد رکھ سکے ہیں کہ یہ جملہ مرفوع حدیث میں نہیں ہے۔ مگر سند محفوظ نہیں رکھ سکے۔ امام بیہقی علیہ الرحمۃ کو کیا مصیبت درپیش ہے کہ وہ ان لایعنی اور بے سند باتوں اور تار عنکبوت سے معمرؒ کی صحیح روایت کو رد کر کے اصول شکنی کرتے ہیں؟ مگر سچ ہے ایک غلطی کے درست کرنے کے لیے متعدد[1] غلطیوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔

خامسًا۔ اگر یہ جملہ بالفرض حضرت ابوہریرہؓ کا نہ ہو بلکہ امام زہریؒ کا ہو۔ تب بھی کامیابی اور فتح جمہور ہی کی ہوگی۔ فریق ثانی کو بغیر حرماں نصیبی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحؒ لکھتے ہیں کہ اگر بالفرض فانتھی الناس الخ کو امام زہریؒ کا مدرج ہی تسلیم کر لیا جائے۔ تب بھی یہ اس بات کی ایک بہت بڑی وزنی دلیل ہوگی کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام زہریؒ اپنے وقت میں سنت اور حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ اگر امام کے پیچھے قرأت کرنا ضروری ہوتا تو یہ مسئلہ امام زہریؒ سے کیسے مخفی رہ سکتا تھا؟ جب امام زہریؒ یہ فرماتے ہیں کہ جہری نمازوں میں لوگوں نے قرأت ترک کردی تھی۔ تو یہ اس بات کی کھلی اور معقول دلیل ہے کہ حضرات صحابہؓ و تابعینؒ امام کے پیچھے قرأۃ نہیں کیا کرتے تھے اور اسی پر امام موصوفؒ نے ان کو عامل پایا (فتاوٰی جلد ۲ ص ۱۴۵)

سادسًا۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ فریق ثانی اس جملہ کو امام زہریؒ کا مدرج تسلیم کرتا ہے۔ اگر یہ جملہ (فانتھی الناس الخ) سرے سے اس حدیث میں نہ ہو اور روایت مالی انازع القرآن پر ہی ختم ہو جائے (جیسا کہ امام لیثؒ بن سعدؒ وغیرہ کی روایت یہیں ختم ہوتی ہے) تو پھر بھی یہ حدیث جمہور کی دلیل ہے۔ کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے قرأت کرنیوالا

---

[1] مثلاً یہ کہ صحیح اور ضعیف حدیث کا تعارض ہو تو صحیح قابل اخذ اور ضعیف متروک ہوگی۔ ثقہ کی زیادت[2] مقبول ہوگی۔ واصل[3] اور رافع کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ مثبت[4] کو نافی پر ترجیح ہوگی۔ امام[5] معمرؒ اثبت الناس فی الزھری رحؒ ہیں۔ امام اوزاعیؒ[6] فی الزھری لیس بذاک وغیرہ وغیرہ تمام طے شدہ قواعد کو محض ایک غلط بات کو درست کرنے کے لیے ٹھکرایا جا رہا ہے۔ فواعجباہ واسفا۔

صرف ایک ہی شخص تھا اور اس کو بھی آپ نے گوارا نہ فرمایا۔ پہلے آپ نے نماز سے فارغ ہو کر فوراً سوال کیا۔ اور پھر اس شخص کے اقرار کرنے کے بعد مالی انازع القرآن کے جملہ سے اس کی قرأت کو ناپسند کرتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ فرمائی اگر فانتھی الناس کا جملہ سرے سے نہ ہو تو کیا اس تنبیہ کے بعد بھی اس کا حضرات صحابہ کرامؓ سے احتمال ہے کہ وہ باقاعدہ امام کے پیچھے قرأت کرتے رہے ؟ حَاشَا وَ کَلَّا۔ راقم کہتا ہے کہ اگر اس حدیث میں اور کچھ بھی نہ ہوتا صرف یہی جملہ ہوتا۔ ھل قرأ معی منکم احدٌ[1] تو پھر بھی یہ جمہور کی دلیل کے لیے کافی ہوتا، حالانکہ جملہ فانتھی الناس حضرت ابوہریرہؓ کا ارشاد ہے، جیسا کہ بسند صحیح آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

اصلی بات یہ ہے کہ امام زہریؒ کے فانتھی الناس الخ کے مضمون کے سمجھنے میں فریق ثانی کو غلطی[2] واقع ہے جس کے سبب انھوں نے پیچ در پیچ غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور ایک بے بنیاد

---

[1] آپؐ نے ھل قرأ ارشاد فرمایا ہے۔ ھل جھر نہیں فرمایا جس سے سورۃ فاتحہ کی قرأت ہر طرح سے ممنوع ہو گی۔ اس لیے ھل قرأ کو جہر پر حمل کرنا یا ھل قرأ کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا جیسا کہ امام بیہقیؒ وغیرہ نے کیا ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹ وغیرہ) یقیناً باطل اور مردود ہے اور تحمل النصوص علی ظواھرھا کے خلاف ایسا مطلب مراد لینا ہرگز صحیح نہیں۔ رہا یہ سوال کہ اگر پڑھنے والے نے آہستہ قرأت کی تھی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو کیسے علم ہوا ؟ تو یہ بڑی سطحی قسم کی بات ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ آپ کو نماز کی حالت میں ایک مخصوص کیفیت حاصل تھی جس سے آپ مقتدیوں کے رکوع و سجود اور خشوع کو ملاحظہ کر لیتے تھے۔ (مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۷۸) ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہے جو اچھی طرح وضو کر کے نہیں آتے جس کی وجہ سے ہم پر قرآن کریم کی قرأۃ ملتبس ہو جاتی ہے (نسائی جلد ۱ ص ۱۱۱) حافظ ابن کثیرؒ اسی مضمون کی ایک اور روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ اسناد حسن و متن حسن۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ مقتدیوں کے وضو کے نقصان سے متاثر ہوتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز سے (صحتہً و فساداً) وابستہ اور متعلق ہوتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۴۲۱) لہٰذا مقتدی کی آہستہ قرأت سے آپ کا متاثر ہونا بعید نہ تھا۔ اس لیے نماز کی حالت میں آپ کی طبیعت لطیف تر اور شفاف تر ہو جاتی تھی۔

[2] امام زہریؒ مرفوع حدیث بیان کر رہے تھے جس میں فانتھی الناس الخ کا جملہ بھی تھا۔ امام موصوفؒ

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور پادر ہوا بات کی درستی کے لیے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔

**تیسرا اعتراض:** مُبارک پُوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے امام کے پیچھے صرف جہری نمازوں میں قرأت کی ممانعت آئی ہے۔ حالانکہ تم سری اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے منکر ہو۔ لہٰذا تمہارا دعویٰ عام اور دلیل خاص ہے۔ (تحقیق الکلام وغیرہ)

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) کے شاگرد کثرت تھے۔ ایک نے یہ جملہ براہِ راست امام زہریؒ سے نہ سنا تو رفیقِ سبق سے پوچھا کہ امام زہریؒ نے کیا فرمایا تھا۔ وہ بولے فانتھی الناس الخ کہا تھا۔ اس سے بعض کو یہ دھوکہ ہوا کہ شاید یہ جملہ امام زہری کا مدرج ہے۔ حالانکہ یہ جملہ بھی مرفوع حدیث میں موجود تھا۔ (فتح الملہم جلد۲ ص ۲۳ و اعلاء السنن جلد۴ ص ۸۸) چنانچہ روایت یوں ہے کہ

وقال عبد الله بن محمد الزهری من بينهم قال سفيان وتكلم الزهری بكلمة لم اسمعها فقال معمر انه قال فانتهى الناس الخ

(ابوداؤد جلد۱ ص ۱۲۰، کتاب القرأۃ ص ۹۹، سنن الکبریٰ ۲ ص ۱۵۸)

اپنے ساتھیوں میں سے عبد اللہؒ بن محمدؒ نے یہ بیان کیا کہ سفیانؒ نے فرمایا کہ امام زہریؒ نے ایک کلمہ بیان کیا لیکن میں خود ان سے نہ سن سکا۔ میں نے پوچھا کہ انھوں نے کیا فرمایا ہے؟ امام معمرؒ نے فرمایا کہ زہریؒ نے فانتھی الناس الخ کا جملہ بیان کیا ہے۔

اور کتب احادیث میں اس کی متعدد نظیریں موجود ہیں۔ مثلاً زہیرؒ کا بیان ہے کہ ابو الزبیرؒ حدیث بیان کر رہے تھے۔ ایک جملہ میں نہ سن سکا۔ وہ جملہ مجھے میرے رفیقِ درس یاسین زیاتؒ نے بتایا۔ (طیالسی ص۲۴۰) حضرت جابرؓ بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حدیث ارشاد فرما رہے تھے لیکن ایک جملہ میں نہ سن سکا۔ میں نے اپنے رفیق سے پوچھا تو اس نے مجھے بتلایا (ترمذی جلد۲ ص۴۵، ابوداؤد جلد۲ ص۲۳۲، طیالسی ص۱۰۱، بغدادی جلد۱ ص۱۹۶) حضرت عبد اللہ بن قرطؓ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حدیث بیان کی مگر ایک خفیف سا کلمہ میں نہ سن سکا۔ میں نے پہلو میں اپنے رفیق سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا (مستدرک جلد۴ ص۲۲۱) حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حدیث بیان کی لیکن ایک جملہ اہل مجلس کے رونے اور شور و غل کی وجہ سے میں نہ سُن سکی۔ میرے قریب جو صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے وہ جملہ مجھے بتایا۔ (نسائی جلد۱ ص۲۲۴ و مشکوٰۃ جلد۱ ص۲۶) اور یہ تمام جملے مرفوع حدیث کے ساتھ تھے۔ یہی حال فانتھی الناس الخ کے جملہ کا ہوا ہے۔

جواب: یہ ٹھیک ہے کہ جمہور اہلِ اسلام تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے عدم جواز کے قائل ہیں لیکن یہ دعویٰ کس نے کیا ہے کہ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے عدم جوازِ قرأۃ کی دلیل صرف یہی ایک حدیث ہے۔ ہاں جہری نمازوں میں عدم جواز قرأۃ خلف الامام کی ایک دلیل یہ روایت بھی ہے باقی سری نمازوں کے لیے قرآن کریم کی آیت۔ حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ بن مالک کی حدیث واذا قرء فانصتوا پہلے بیان ہو چکی ہے۔ بقیہ دلائل اپنے مقام پر بیان ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ نقد تو وصول کر لیجئے۔ اور ادھار کے منتظر رہیے۔ دنیا بامید قائم است۔

باقی امام بیہقیؒ وغیرہ کا ابن اکیمہؒ کی روایت کا علاءؒ بن عبدالرحمنؒ کی روایت سے معارضہ کر کے علاءؒ بن عبدالرحمنؒ کی روایت کو ترجیح دینا سو یقیناً مردود ہے، جس کی پوری تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز اور یہ بات بھی اپنے مقام پر انشاء اللہ تعالیٰ باحوالہ آئے گی کہ حضرت ابوہریرہؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ حضرت ابوہریرہؓ کا فتویٰ جہری نمازوں کو بھی شامل ہے بالکل بے کار ہے۔

**پانچویں حدیث۔** امام عبداللہؒ[1] فرماتے ہیں کہ مجھ سے والد ماجد امام احمدؒ بن حنبلؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یعقوبؒ بن ابراہیمؒ[2] نے بیان کیا۔ وہ محمدؒ بن عبداللہؒ[3] بن مسلمؒ سے روایت کرتے ہیں

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۱۳) امام احمدؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

[2] علامہ ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۳۸۰) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحافظ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۰۶)

[3] امام احمدؒ ان کو صالح الحدیث اور لا باس بہ کہتے ہیں۔ ابن معینؒ ایک روایت میں ان کو صالح کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ ان کی روایتیں لکھی جا سکتی ہیں۔ امام ابوداؤدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ مجھے ان کی کسی حدیث میں خرابی معلوم نہیں اور میں نے ان کی کوئی حدیث منکر نہیں دیکھی۔ واقدیؒ ان کو کثیر الحدیث اور صالح کہتے ہیں۔ یہ صحاح ستہ کے راوی ہیں (اور یہ بالکل ایک ظاہر امر ہے کہ صحاح ستہ کے راوی میں اگر کوئی کمزوری ہو تو قابل برداشت ہوتی ہے جبکہ مقابلہ میں کوئی ثقہ راوی نہ ہو) صحیح بخاری میں ان کی دو حدیثیں ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۲۷۹) امام زہریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے۔

وہ امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے عبدالرحمٰن بن ہرمزؒ[1] نے بیان کیا۔ وہ عبداللہ بن بحینہؓ[2] سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

هل قرأ احد منكم معى انفا قالوا نعم قال انى اقول مالى انازع القرآن فانتهى الناس عن القرأة معه حين قال ذلك۔

(مسند احمد جلد ۵ ص ۳۴۵)

کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی ہے؟ حضرات صحابہ کرامؓ نے عرض کیا جی حضرت قرأت کی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تب ہی تو میں (دل میں) کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآنِ کریم کی قرأت میں منازعت اور کشمکش کیوں کی جارہی ہے؟ آپ کا یہ ارشاد جب سنا تو لوگوں نے آپ کے پیچھے قرأت ترک کردی۔

امام ابوبکر ہیثمیؒ (المتوفی ۸۰۷ھ) اس حدیث[3] کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ رواه احمد ورجال احمد رجال الصحيح۔ (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۰۹) یہ روایت امام احمدؒ نے بیان کی ہے اور امام احمدؒ کی سند کے تمام راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ اس کے آگے علامہ ہیثمیؒ نے امام بزارؒ کا وہ اعتراض نقل کیا ہے جو عنقریب آرہا ہے۔ الغرض سند کے لحاظ سے یہ روایت بھی صحیح ہے۔ اور اس میں جہری نماز کی کوئی قید بھی مذکور نہیں ہے۔ لہٰذا یہ روایت جہری اور سری تمام نمازوں کو شامل ہے۔ گویا اس روایت کے پیشِ نظر حضرات صحابہ کرامؓ نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے تمام نمازوں میں قرأت ترک کردی تھی۔ (ملاحظہ ہو احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۲ للجصاص الرازیؒ) اور اگر اس روایت میں جہر کی قید بھی ہو جیسا کہ مجمع الزوائد جلد ۲ صـ۱۱۰

---

[1] امام ذہبیؒ ان کو الحافظ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ۱ ص ۹۱)

[2] بحینہ اُن کی والدہ کا نام تھا (نووی ۱ ص ۲۱۱، طبقات ابن سعد جلد ۴ قسم دوم صفحہ ۳۰) والد کا نام مالک تھا۔ (صحیح مسلم ۱ صـ۲۱۱) مدینہ سے تیس ۳۰ میل دور مقام ریم میں متوطن ہوگئے تھے (استیعاب جلد ۱ ص ۳۵۱) اور جلیل القدر و فضلائے صحابہؓ میں ان کا شمار تھا۔ (اصابہ جلد ۴ ص ۱۴۱) المتوفی ۵۵ھ

[3] یہ روایت سنن الکبریٰ جلد ۲ صـ۱۵۸ اور کتاب القرأۃ صـ۹۵ وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔

کی ایک روایت میں ہے صلّی صلوٰۃ یجھر فیھا الخ تب بھی جہری نمازوں میں ترکِ قرأۃ خلف الامام پر سابق روایات کی طرح یہ صریح دلیل ہے۔ اس روایت پر امام بزارؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں محمدؒ بن عبداللہؒ بن مسلم نے خطا کی ہے۔ اصل روایت عن ابن اکیمہ عن ابی ھریرۃؓ الخ تھی۔ لیکن انھوں نے عن ابن بحینہ کردی ہے۔ اور پھر محض لفظوں کے ذریعہ یوں رعب جمانے کی سعی کی ہے کہ ھٰذا خطأ لا شك فیه ولا ارتیاب۔ (سنن الکبریٰ ۲ ص ۱۵۹ وغیرہ) لیکن محض ظن اور اٹکل سے ایسے لا یعنی اور بیکار اعتراض کون سنتا ہے؟ کیا ابن اکیمہؒ اور حضرت ابوہریرہؓ کے علاوہ عبداللہ بن بحینہؓ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ترک قرأت خلف الامام کی روایت نقل کرنے کے مجاز نہیں تھے؟ اور کیا امام احمدؒ بن حنبلؒ اور علامہ ہیثمیؒ وغیرہ کو یہ غلطی اور خطا معلوم نہ ہوسکی؟ نہ تو اس میں اندراج کی غلطی سے انتقال سند ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۴۱ میں کہا ہے اور نہ یہ روایت ضعیف ہے۔ وعلیٰ سبیل التنزل اگر یہ روایت عن ابن اکیمہؒ عن ابی ھریرہؓ ہی ہو۔ تب بھی یہ صحیح روایت پہلی روایت کی مؤید ہوگی اور اس کا صحیح ہونا آپ معلوم ہی کرچکے ہیں۔ حالانکہ یہ روایت عبداللہؓ ابن بحینہؓ ہی سے مروی ہے۔ امام معمرؒ اور سفیانؒ بن عیینہ کی زہریؒ عن ابن اکیمہ الخ کی روایت اپنے مقام پر صحیح ہے۔ نہ تو دونوں میں تعارض ہے اور نہ اختلاف۔ رہا اس روایت میں قرأ کو جہر پر حمل کرنا یا اس میں قرأت کو ما زاد علی الفاتحۃ پر محمول کرنا جیسا کہ امام بیہقیؒ نے کیا ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹) تو محض فرسودہ اور بے حقیقت تاویل ہے۔ اور خالص سینہ زوری پر محمول ہے۔ فسامحه اللہ تعالیٰ بعموم فضله۔

---

لہ علامہ ہیثمیؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس روایت کے جملہ راوی بخاری کے راوی ہیں۔ اگر اس روایت کو ابن اکیمہؒ سے تسلیم کیا جائے تو ابن اکیمہ بخاری کے راوی نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کا رجاله رجال الصحیح کہنا ہی امام بزارؒ کی تردید کے لیے کافی ہے اور اپنے وقت میں اگر علامہ ہیثمیؒ کو صحت اور سقم کی پرکھ نہیں تو اور کس کو تھی؟ مؤلف خیر الکلام کا ہیثمیؒ پر اعتراض بے سود ہے اگرچہ مسند احمد کی بعض روایتیں ضعیف و کمزور ہیں مگر یہ سند بالکل صحیح ہے کیونکہ اس کے جملہ راوی بخاری کے راوی ہیں۔

چھٹی حدیث : امام بزار[1] فرماتے کہ ہم سے محمد[2] بن بشار اور عمرو بن علی[3] نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو احمد[4] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یونس[5] بن ابی اسحاق نے اپنے باپ سے بیان کیا۔ وہ ابو الاحوص[6] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا :

---

[1] صاحب مسند احمد بن عمرو بن عبد الخالق (المتوفی ۲۹۲ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور العلامہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۰۴)

[2] حافظ ابن حجرؒ ان کو الحافظ اور عجلیؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ صدوق اور نسائیؒ لا باس کہتے ہیں۔ مسلمہ بن قاسمؒ ان کو ثقہ اور مشہور کہتے ہیں۔ دار قطنیؒ ان کو من الحفاظ والاثبات کہتے ہیں ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۷۲) عمرو بن علیؒ کو امام ابو زرعہؒ من فرسان الحدیث اور دار قطنیؒ من الحفاظ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ مسلمہ بن قاسمؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۸۲)

[3] ان کا نام محمد بن عبد اللہ بن الزبیرؒ تھا۔ امام ابن نمیرؒ ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ بندارؒ کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بڑا حافظ نہیں دیکھا۔ محدث ابو زرعہؒ اور ابن خراشؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں امام ابو حاتمؒ ان کو حافظ الحدیث کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ لیس بہ بأس ابن قانعؒ ثقہ اور ابن سعدؒ ان کو صدوق اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۹ ص ۲۵۵)

[4] امام ابن معینؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ حسن الحدیث اور نسائیؒ لا بأس بہ کہتے ہیں۔ عجلیؒ ان کو جائز الحدیث کہتے ہیں اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ص ۴۳۴)

[5] ابو اسحاق السبیعیؒ علامہ ابن ناصر الدینؒ ان کو بڑے حافظ اور ائمہ دین میں شمار کرتے ہیں (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۱۷۴) امام نوویؒ لکھتے ہیں ان کی توثیق جلالت اور ثنا پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۲ ص ۱۷۲) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور احد الاعلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۰۸) امام احمدؒ ابن معینؒ، نسائیؒ، عجلیؒ اور ابو حاتمؒ وغیرہ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۶۵)

[6] ان کا نام عوف بن مالکؒ بن نضلہ تھا۔ امام ابن سعدؒ اور ابن معینؒ، ابن سعدؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۸ ص ۱۶۹) حضرت ابن مسعودؓ جلیل القدر صحابی تھے جن کے کچھ مناقب باب اول میں بیان ہو چکے ہیں۔

کانوا یقرؤن خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال خلطتم علیّ القرآن۔ (احکام القرآن جلد ۳ ص۵۱ و طحاوی جلد ۱ ص۱۰۶، الجوہر النقی جلد ۲ ص۱۶۲)

کہ لوگ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے قرأت کرتے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے مجھ پر قرآن مجید کی قرأت خلط ملط کر دی ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے پیچھے قرأت کرنے والوں کی قرأت کو گوارا نہ فرمایا اور مخصوص لہجہ میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے تنبیہ فرمائی اور اس میں چونکہ جہری نماز کی قید نہیں۔ اس لیے سب نمازوں کو یہ روایت شامل ہو گی۔ اور آہستہ قرأت کرنے بلکہ مقتدیوں کے عدم تکمیل وضو سے آپ کا متاثر ہونا پہلے نقل ہو چکا ہے۔ علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں کہ یہ روایت مسند احمد، مسند ابو یعلیٰ اور مسند بزار میں مروی ہے۔ اور مسند احمد کی روایت کے جملہ راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ (مجمع الزوائد جلد ۲ ص۱۱۱) علامہ ماردینیؒ لکھتے ہیں کہ وھذا اسناد جیّد کہ یہ عمدہ اور کھری سند ہے۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص۱۶۲) اور قرأت چونکہ مطلق ہے اس لیے سورۂ فاتحہ اور قرآن کریم کی جملہ سورتوں کی قرأت کو شامل ہے کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے جہر اور سرّ کا کوئی فرق بیان نہیں فرمایا۔ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۱)

اس روایت میں قرأ کو جہر پر یا قرأت کو ما زاد علی الفاتحۃ پر بجبر محمول کرنا جیسا کہ امام بیہقیؒ کی تقلید میں کرنے والوں نے (جن میں قاضی مقبول احمد صاحب بھی ہیں) کیا ہے بالکل غلط ہے ایسی لایعنی تاویلات کو کون مانتا ہے؟

بعض طرق میں اس کا ذکر آتا ہے کہ حضرات صحابہؓ آپ کے پیچھے جہر سے قرأت کرتے تھے مگر فیجھرون کے الفاظ سنداً ومعناً محل نظر ہیں۔ یہ روایت دارقطنی جلد ۱ ص ۱۳۰ میں ہے، لیکن پوری سند یوں ہے: عن یونس بن ابی اسحٰق عن الاحوص..... الخ اور گو تعلیق المغنی میں کہا ہے: اسنادہ حسن مگر مؤلف خیر الکلام کے اصول سے یہ صحیح نہیں ہے وہ لکھتے ہیں کہ

اس کی سند میں ابو اسحاق سبیعیؒ ہیں حافظ ابن حجرؒ نے ان کو تیسرے طبقہ کے مدلسین

میں شمار کیا ہے۔ طبقات المدلسین صـ ۱۳ اور اس طبقہ کی روایات بدون تصریح سماع مقبول نہیں ہوتیں ..... الخ (خیر الکلام صـ ۲۶۸) بقول ان کے یہ نہ تو صحیح ہے اور نہ مقبول علاوہ ازیں امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یونسؒ کی اپنے والد سے روایت ضعیف ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۴۳۴) اور مؤلف خیر الکلام نے ص ۱۹۰ میں لکھا کہ بعض اہل علم ابو اسحاقؒ کو اکے اختلاط کی وجہ سے چھوڑ چکے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۲۹۲) لہٰذا متروک کی روایت کا کیا اعتبار۔ کم از کم ان کو اپنے پیش کردہ اصول کا خیال تو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

**ساتویں حدیث:** امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الحسن علیؒ[1] بن احمد حمامی مقریؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمدؒ[2] بن سلیمان فقیہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابراہیم[3] بن ہیثمؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے آدمؒ[4] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ

---

[1] علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ صادق دیندار، فاضل اور حسن الاعتقاد تھے۔ (بغدادی جلد ۱۱ صـ ۳۲۹) مؤلف خیر الکلام نے (صـ ۴۴۷ میں) یہ کہا ہے کہ ابن ابی الفوارسؒ کہتے ہیں ضعیف جداً سخت ضعیف ہے۔ میزان جلد ۲ صـ ۲۱۷، اور لسان المیزان جلد ۴ صـ ۱۹۴) مگر یہ ان کی جہالت ہے کیونکہ جن کی تضعیف ابن ابی الفوارسؒ نے کی ہے وہ علیؒ بن احمد بن ابی قیس المقری الرفاعی.... ...... الخ ہیں جن کی وفات ۳۵۲ھ میں ہوتی ہے۔ دیکھئے لسان جلد ۴ صـ ۱۹۴ وغیرہ اور زیر بحث سند میں علیؒ بن احمد بن عمرؒ بن حفصؒ ابو الحسن المقری المعروف بابن الحمامیؒ ہیں جن کی وفات ۴۱۷ھ میں ہوئی (دیکھئے بغدادی جلد ۱۱ صـ ۳۳۱) اس لیے مؤلف خیر الکلام کا صـ ۴۴۷ میں یہ کہنا کہ پھر یہ حدیث بالکل منکر شاذ اور ضعیف ہے۔ انتہیٰ بلفظہ قطعاً باطل اور مردود ہے۔

[2] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، الفقیہ اور شیخ العلماء لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ صـ ۶۹)

[3] امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (بحوالہ الجوہر النقی جلد ۱ صـ ۱۰) دارقطنیؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں (جلد ۱ صـ ۱۸) ابن عدیؒ ان کو مستقیم الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ۱ ص ۱۲۳) خطیبؒ ان کو ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۶ صـ ۲۰۶)

[4] آدمؒ ابن ابی ایاسؒ، امام ابو داؤدؒ، ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ اور

(باقی اگلے صفحہ پہ)

ہم سے ابن ابی ذئبؒ[1] نے بیان کیا۔ وہ محمدؒ[2] بن عمروؒ سے اور وہ محمد بن عبدالرحمٰن[3] بن ثوبانؒ سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

ما کان من صلوۃ یجھر فیھا الامام بالقراءۃ فلیس لاحد ان یقرأ معہ۔ (کتاب القراۃ ص ۹۹، وص ۱۲۲ طبع اشرف پریس)

جس نماز میں امام جہر سے قرأت کرتا ہو۔ اس نماز میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ امام کے ساتھ قرأت کرے۔

یہ روایت بھی اس بات کو واشگاف کرتی ہے کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے کسی مقتدی کو اس کی گنجایش نہیں ہے کہ وہ امام کے پیچھے کسی قسم کی قرأت کرے۔ امام بیہقیؒ نے قرأت سے جہر اور ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت مراد لی ہے۔ لیکن یہ قطعاً غلط ہے۔ جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مامور من اللہ تھے۔ اور آپ کو فاصدع بما تؤمر کا حکم تھا۔ مطلق قرأت اور سورۂ فاتحہ کی مقید قرأت میں نیز نفسِ قرأت اور جہر بالقراۃ میں آپ اچھی طرح فرق جانتے تھے۔ پھر نہ معلوم آپ نے اتنی رازداری اور کنایہ سے کام کیوں لیا؟ آپ نے یہ کیوں نہ فرمادیا کہ فلیس لاحد ان یجھر معہ اور یہ کیوں نہ فرمادیا: فلیس لاحد ان یقرأ معہ غیر سورۃ الفاتحۃ آپ کے الفاظ تو یہ ہیں فلیس لاحد ان یقرأ معہ کسی کو یہ حق نہیں کہ امام کے ساتھ کسی قسم کی قرأت کرے۔ آپ کے مطلق حکم کو بلا دلیل مقید کر دینا

---

(بقیہ گزشتہ صفحہ) مامون کہتے ہیں۔ نسائیؒ لا بأس بہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۹۲)

[1] ثقہ، فقیہ اور فاضل تھے۔ (تقریب ص ۳۲۹)

[2] امام ابو زرعہؒ، نسائیؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ اور صالح الحدیث کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۹ ص ۳۷۴)

[3] ابن سعدؒ، ابو زرعہؒ، نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ وہ تابعینؒ میں تھے اور ایسے ثقہ تھے کہ ان کے مثل سے سوال نہیں ہو سکتا۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۹ ص ۲۹۴) حضرت ابوہریرہؓ مشہور صحابی تھے۔ غرضیکہ اس روایت کا ایک ایک راوی ثقہ اور ثبت ہے۔

اور مطلق قرأت کو مقید قرأت پر بغیر کسی حجت کے حمل کرنا سینہ زوری نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک اور بات اس روایت کے بارے میں امام بیہقیؒ سے نکلی ہے، وہ بھی بہت ہی عجیب ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ روایت منکر ہے۔ اگر کوئی روایت صرف امام بیہقیؒ کے منکر کہنے سے منکر ہو جایا کرتی ہے تو پھر ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔ لیکن اصول حدیث کے لحاظ سے یہ روایت کسی طرح منکر نہیں ہے۔ حضرات محدثین کرامؒ کی اصطلاح میں منکر وہ روایت ہوتی ہے جس کی سند میں کوئی ایسا راوی موجود ہو جو فاحش غلطی اور کثرتِ خطا کا مرتکب ہوا ہو۔ یا اپنے سے زیادہ کسی ثقہ راوی کی مخالفت کرتا ہو۔ (دیکھیے شرح نخبۃ الفکر ص ۵۵ و ۵۹ وغیرہ) لیکن اس روایت کے تمام راوی ثقہ اور ثبت ہیں۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور اس روایت میں کوئی ایسا راوی موجود نہیں جو کسی ثقہ راوی کی مخالفت کر رہا ہو۔ اگر امام بیہقیؒ کی مراد اس روایت کو علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی روایت کے خلاف بتانا ہے۔ تو اس کی حقیقت بھی عنقریب آشکارا ہو جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔ اندریں حالات اس کو منکر کہنا اصول کے خلاف ہے جو کسی طرح مسموع نہیں ہو سکتا۔ اور باقرار مبارکپوری صاحبؒ یہ نقل ہو چکا ہے کہ امام بیہقیؒ کا کوئی قول بلا دلیل حجت نہیں ہو سکتا۔ مؤلف خیر الکلام (ص ۴۴۶ میں) لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے طبیعت نفرت کرتی ہے۔ کیونکہ جو صحیح روایات حضرت ابوہریرہؓ سے وارد ہیں یہ بوجہ ان کے خلاف ہونے کے شاذ ہے۔۔۔ الخ اگر امام بیہقیؒ کی طبیعت صحیح حدیث کو نہیں مانتی تو نہ مانے۔ صحیح حدیث کو ماننے والے بھی دنیا میں بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں اور حضرت ابوہریرہؓ سے جہری نمازوں میں کوئی روایت خلف الامام قرأت کی ثابت نہیں ہے۔ جیسا کہ بیان ہوگا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) لہٰذا اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

**آٹھویں روایت:** امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبداللہؒ[1] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوبکرؒ بن اسحاق الفقیہ اور ابوبکرؒ بن عبداللہؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے

[1] امام ابو عبداللہؒ کا ترجمہ باب اول میں گزر چکا ہے۔ ابوبکرؒ بن اسحاق الفقیہؒ اور ابوبکرؒ بن عبداللہؒ کی سند ڈبل ہے مگر مزید تسلی اور تسکین کے لیے (کیونکہ ابوبکر الفقیہ تو مشہور امام ہیں) ابوبکر بن عبداللہ کا ترجمہ سن لیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الامام، الاوحد، المعدل اور محدث نیشاپور لکھتے ہیں۔ (المتوفی ۳۸۸ھ) (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۰۴)

ہیں کہ ہم سے احمدؒ بن بشرؒ بن سعد المرثدیؒ اور حسنؒ[1] بن سفیانؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم سے فضیلؒ[2] بن عبدالوہابؒ اور محمدؒ بن خالدؒ بن عبداللہ الواسطیؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم سے خالدؒ[3] بن عبداللہ الطحانؒ نے بیان کیا۔ وہ عبدالرحمنؒ[4] بن اسحاقؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ سعید مقبریؒ[5] سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ سے وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

۱ سند کی یہ کڑی بھی ڈبل ہے۔ اور حسنؒ بن سفیانؒ کا ترجمہ باب اوّل میں امام زہریؒ کے اثر میں نقل ہو چکا ہے کہ وہ جلیل القدر امام تھے۔

۲ یہ کڑی بھی ڈبل ہے۔ امام ابن معینؒ کہتے ہیں کہ فضیلؒ ثقہ اور لا بأس بہ تھے۔ محدث عبدالرحمنؒ اپنے والد سے ان کی توثیق نقل کرتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۱۲ ص ۳۹۳) ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور ابو بکر بزارؒ لیس بہ بأس کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۲۹۳)

۳ امام احمدؒ، ابن سعدؒ، ابو زرعہؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ اور صحیح الحدیث کہتے ہیں۔ امام ترمذیؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں۔ محمدؒ بن عمارؒ ان کو اثبت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً ۳ ص ۱۰۱) امام احمدؒ ان کو من افاضل المسلمین کہتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۸ ص ۲۹۴) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الامام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۳۹)

۴ امام احمدؒ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں۔ ابن معینؒ ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوبؒ بن شیبہؒ صالح اور یعقوبؒ بن سفیانؒ لا بأس بہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ حسن الحدیث کہتے ہیں۔ ابو داؤدؒ ثقہ کہتے ہیں۔ نسائیؒ (جلد ۲ ص ۱۱۱ میں) لیس بہ بأس کہتے ہیں۔ ابن خزیمہ بھی لیس بہ بأس کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ صالح الحدیث اور ساجیؒ صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کی توثیق کرتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ ترمذیؒ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ان کی توثیق کی ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۱۳۸) مؤلف خیر الکلام ص ۸۸ میں لکھتے ہیں کہ ابن معینؒ نے ان کو ضعیف کہا اور امام احمدؒ نے منکر الحدیث کہا یہ جرحیں اگرچہ مبہم ہیں مگر ان سے راوی مرتبہ سے گر جاتا ہے اھ (محصلہ) **الجواب**: امام ابن معینؒ نے ان کو ثقہ کہا ہے اور امام احمدؒ نے ان کو صرف ابو الزنادؒ کی روایت میں منکر کہا ہے اور یہ روایت سعید مقبریؒ سے ہے اور لطف یہ ہے کہ خود مؤلف مذکور جرح کو مبہم کہتے ہیں اور خیر الکلام ص ۱۸۷ میں لکھا ہے کہ پھر اس پہ جو جرحیں کی گئی ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

كل صلوة لا يقرأ فيها بام الكتاب فهي خداج الا صلوة خلف امام۔ (کتاب القرأة ص ۱۳۵، طبع دهلی و ص ۱۷۱ طبع اشرف پریس)

کہ ہر وہ نماز جس میں سُورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو وہ نماز ناقص ہوتی ہے، مگر ہاں وہ نماز اس سے مستثنیٰ ہے جو امام کے پیچھے پڑھی جائے۔

اس روایت میں خلف امام اور ام الکتاب کی قید خاص طور پر ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ اور یہ بھی کہ آپ نے تمام نمازوں میں سُورۃ فاتحہ کی قرأت کو ضروری اور لازم ٹھہرایا ہے۔ مگر مقتدی کے لئے اس کی قرأت کی مطلقاً گنجائش نہیں چھوڑی اور امام بیہقیؒ وغیرہ جہاں قرأت سے ما زاد علی الفاتحہ مراد لے کر گلو خلاصی کیا کرتے ہیں۔ یہ روایت ان کی اس تاویل کو بھی باطل ٹھہراتی ہے۔ کیونکہ اس میں خاص طور پر ام الکتاب کی قید موجود ہے جو نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اور اس صحیح روایت سے بھی فریق ثانی کا یہ مطالبہ آسانی سے پورا ہو جاتا ہے کہ امام کے پیچھے سُورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کی ایک ہی صحیح صریح مرفوع حدیث پیش کرو۔

---

(بقیہ پچھلا صفحہ) مفسر نہیں محدثین اور اصول فقہ والوں کے ہاں اس قسم کی جرح مقبول نہیں ہوتی اور امام احمدؒ کی اصطلاح منکر الحدیث کے بارے میں بالکل جدا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ان ابن حنبلؒ يطلق على من يغرب على اقرانه في الحديث اى يأتي بالغرائب انه منكر الحديث ... انتهى (هامش تدریب الراوی ص ۲۳۴) امام احمدؒ بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جو راوی اپنے باقی ساتھیوں سے متفرد ہو کر کوئی غریب حدیث بیان کرے تو وہ منکر الحدیث ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ غریب حدیث صحیح بھی ہو سکتی ہے۔ کما لا یخفی۔ یہ یاد رہے کہ اس سند میں راوی عبد الرحمٰنؒ بن اسحاقؒ المدنی ہیں جو کہ رجال مسلم میں سے ہیں نہ کہ الواسطی جن پر امام بیہقیؒ نے امام ابن معینؒ اور امام احمدؒ کا کلام نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب القرأۃ ص طبع دہلی) کیونکہ المدنی سے خالدؒ بن عبد اللہ الطحان الواسطیؒ کی اور المدنی کی سعید مقبریؒ سے روایت ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۱۳۷) مگر الواسطی اس پوزیشن میں نہیں۔ امام بیہقیؒ غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔ (فصل الخطاب ص) اور اسی عبد الرحمٰنؒ بن اسحاقؒ سے فریق ثانی ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۲۱ کی روایت فانتهى الناس کے مرسل ہونے پر استدلال کرتا ہے۔ (فصل الخطاب ص ۸۰ للعلامۃ الکشمیریؒ)

ے علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، المحدث اور ثقہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱۰) غرضیکہ حضرت ابو ہریرہؓ تک تمام روات ثقہ اور ثبت ہیں۔

**اعتراض:** بیہقیؒ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اصل روایت میں اذا صلوٰۃ خلف امام کا جملہ نہیں ہے جیسا کہ علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کا موقوف اثر نقل کیا ہے اور اس میں یہ جملہ مذکور نہیں ہے اور یہ خالد الطحانؒ کی خطاء ہے کہ وہ یہ جملہ زائد کرکے حدیث کا مطلب بگاڑ رہے ہیں

(کتاب القرأۃ ص ۱۳۵ محصلہ)

**جواب:** یہ اعتراض چنداں وقعت نہیں رکھتا: اولاً: اس لیے کہ مرفوع حدیث کو موقوف اثر کے تابع بناکر مطلب لینا خلافِ اصول ہے۔ وثانیاً: اس کی بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ کہ اعتبار راوی کی مرفوع حدیث کا ہوتا ہے۔ اس کی اپنی ذاتی رائے کا اعتبار نہیں ہوتا۔ وثالثاً: خالد الطحانؒ بالاتفاق ثقہ اور ثبت تھے۔ اور ثقہ کی زیادت بالاتفاق مقبول ہوتی ہے تو پھر نہ معلوم یہ غدر اور غلطی ان کے سر کیسے تھوپی جاسکتی ہے؟ ورابعاً: الزامی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر واقعی اس حدیث کے مضمون میں غلطی واقع ہوئی ہے تو کیوں نہ ہو کہ اذا صلوٰۃ خلف امام کی زیادت صحیح ہو۔ اور علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی روایت میں غلطی اور خطا کی وجہ سے یہ زیادت چھوٹ چکی ہو۔ اور اس زیادت کے ترک کردینے یا چھوٹ جانے کی وجہ سے حدیث کا مضمون بدل گیا ہو بلکہ قرین انصاف بھی یہی بات ہے کہ غلطی خالد الطحانؒ کی نہ ہو جو ثقہ اور ثبت تھے بلکہ یہ غلطی اور خطاء علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی ہو۔ کیونکہ ان پر کتب رجال میں کلام اور جرح کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبرؒ اور علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معینؒ فرماتے تھے لیس حدیثہ بحجۃ کہ علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی حدیث حجت نہیں ہوسکتی، ابن عدیؒ ان کو لیس بالقوی کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ ان کی بعض حدیثیں منکر ہوتی ہیں۔ ابوزرعہؒ کا بیان ہے کہ وہ کوئی زیادہ قوی نہ تھے، امام ابوداؤدؒ کا بیان ہے کہ محدثین نے ان کی صیام شعبان کی حدیث ان کے مناکیر میں شامل کی ہے، محدث خلیلیؒ کا بیان ہے کہ ان کی ایسی روایتیں بھی ہیں۔ جن میں ان کا کوئی متابع نہیں ہے۔ (دیکھئے کتاب الانصاف ص ۱۶ میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۱۲ اور تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۱۸۶) اس لیے قرین قیاس اور مبنی بر انصاف صرف یہی بات ہے کہ اس زیادت کے ترک کرنے میں غلطی علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی ہے اور یہ روایت ان کی منکر روایتوں میں شمار ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا ص ۱۸۷ میں یہ کہنا کہ علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ پر جرح مبہم ہے، اور نور الانوار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جرح مبہم اثر انداز نہیں ہوتی۔ پس وہ ثقہ ٹھہرے۔

امام مسلمؒ نے ان سے استشہاد کیا ہے، لہٰذا ان کے ہاں بھی ثقہ تھے۔ اور اُمت نے مسلم کی روایات کو جن پر تنقید نہیں ہوئی صحیح کہا ہے لہٰذا بالاجماع صحیح ہوتی۔ (محصلہ) محض تسکین قلب کا سامان ہے امام ابن معینؒ نے ان پر مفسر جرح کی ہے اور جرح مبہم سے بھی مؤلف مذکور کے نزدیک راوی گر جاتا ہے اور اس پر ابن معینؒ وغیرہ نے تنقید کی ہے۔ لہٰذا یہ کسی طرح صحیح نہیں یہ ان کی غلطی ہے اور خالد الطحانؒ کی زیادت بلاشک و شبہ صحیح ہے کیونکہ وہ ثقہ ثبت صحیح الحدیث اور اثبت ہیں۔ الغرض یہ روایت بالکل صحیح ہے نہ اس میں خالد الطحانؒ کا وہم ہے اور نہ عبدالرحمٰنؒ بن اسحٰق کا، جیسا کہ امام بیہقیؒ وغیرہ نے کہا ہے۔ امام مسلمؒ نے مقدمہ میں یہ تبلایا ہے کہ وہ استشہاد میں متکلم فیہ راوی کو بھی لے لیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ص۴) ۔ لہٰذا ان کا مسلم میں آجانا جبکہ ان پر تنقید بھی ہوئی ہے ثقاہت کا ثبوت نہیں ہے۔

**نویں حدیث:** امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوالحسن[۱] علی بن احمدؒ بن عبدانؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد[۲] بن عبید الصفارؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمد[۳] بن غالبؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابوعمرؒ[۴] نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ہمامؒ[۵] نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے زیاد[۶] الاعلمؒ نے بیان کیا۔ وہ حسنؒ[۷] سے روایت کرتے ہیں

---

۱ علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (بغدادی جلد ۱۱ ص ۳۲۹)

۲ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقہ لکھتے ہیں۔ دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۸۷)

۳ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الامام کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ص ۱۷۲) دارقطنیؒ ان کو ثقہ اور مامون اور حافظ ابن حجرؒ ان کو الحافظ کہتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ۵ ص ۳۳۷) اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً ص ۳۳۸) نیز امام دارقطنیؒ نے ان کو مکثر مجود اور حافظ ابن حجرؒ نے متقن کہا ہے۔ (ایضاً)

۴ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور العلامۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۶۷)

۵ ذہبیؒ ان کو الامام، الحجۃ اور الحافظ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۸۸)

۶ امام احمدؒ، ابن معینؒ، ابوداؤدؒ، نسائیؒ اور ابن سعدؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابوزرعہؒ ان کو شیخ کہتے اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۶۲)

۷ امام حسن بصریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

اور وہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے :

انه دخل المسجد والنبی صلی اللہ علیہ وسلم راکع فرکع قبل ان یصل الی الصف فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم زادک اللہ حرصا ولا تعد۔

(سنن الکبری جلد ۲ ص ۹۰)

وہ کہتے ہیں کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رکوع میں چلے گئے تھے۔ چنانچہ صف میں ملنے سے قبل ہی وہ (تکبیر تحریمہ ادا کر کے[3]) رکوع میں چلے گئے اور آہستہ آہستہ چلتے چلتے صف میں مل گئے۔ آپ[4] نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تجھے نیکی کرنے پر اور حریص کرے پھر ایسا نہ کرنا۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ بغیر سورۂ فاتحہ پڑھے۔ رکوع میں شامل ہو گئے تھے۔ مع ہٰذا ان کی اس رکعت کو اور ان کی اس نماز کو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مکمل اور صحیح سمجھا۔ اور ان کو اعادۂ نماز کا حکم نہیں دیا اور یہ دعویٰ کہ انھوں نے وہ رکعت دوبارہ پڑھی تھی بالکل بے بنیاد بات ہے بلکہ ایک توجیہ[4] کے لحاظ سے عدم اعادہ کا صریح حکم ارشاد فرمایا۔ اگر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہر رکعت

---

[1] ان کا نام نفیعؓ بن الحارث تھا جنگِ طائف کے دن مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ فضلائے صحابہؓ میں تھے۔ بصرہ میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ اور وہیں ۴۹ھ میں وفات پائی۔ (مقدمہ تجرید البخاری ص ۳)

[2] یہ روایت صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۰۸ و مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۹۹ و زیلعی جلد ۲ ص ۳۹ و مسند احمد، ابو داؤد جلد ۱ ص ۹۹ و نسائی جلد ۱ ص ۱ اور الجامع الصغیر للسیوطی مع الشرح جلد ۲ ص ۲۷ وغیرہ میں بھی موجود ہے یہ بخاری شریف کی روایت ہے جس کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ اور مزید تسلی کے لیے ہم نے سنن الکبریٰ کے روات کی توثیق بھی نقل کر دی ہے۔

[3] یہ جملہ بین القوسین اور بریکٹ میں تھا کتابت کی غلطی کی وجہ سے قوس رہ گئے تھے۔ یہ حدیث کے ترجمہ میں داخل نہیں ہے۔ جیسا کہ الاعتصام ۲ نومبر ۱۹۶۲ء ص ۱۴ میں اس کو غلط ترجمہ اور اضافہ کہکر پھبتی اڑانے کی بے جا سعی کی گئی ہے۔ اور چونکہ تکبیر تحریمہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک فرض ہے۔ اس لیے بین القوسین اس کا اضافہ کیا گیا ہے۔ حدیث مسئی الصلوٰۃ میں جو صحیح اور مشہور حدیث ہے ثم کبر ثم اقرأ کی تصریح موجود ہے اور حافظ ابن رشدؒ لکھتے ہیں کہ فمفهوم هذا ان التكبيرة الاولى هي الفرض فقط (بدایۃ المجتہد جلد ۱ ص ۱۱۸) اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ فرض صرف تکبیر تحریمہ ہی ہے۔

(حاشیہ نمبر ۴ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

میں رکن اور ضروری ہے تو حضرت ابوبکرہؓ کی نماز کیسے صحیح ہو گئی تھی؟ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرہؓ کے رکوع میں شریک ہونے کو بنظر کراہت نہیں دیکھا جیسا کہ قاضی مقبول احمد صاحب نے سمجھا ہے۔ (دیکھئے الاعتصام ۱۶ر نومبر ۱۹۶۲ء صہ) بلکہ بحالت رکوع چل کر صف سے ملنے کو پسند نہیں فرمایا اور دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ اس سے صاف اور واضح طور پر معلوم ہوا کہ مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کی قرأت ضروری نہیں ہے۔ وہو المطلوب۔

مؤلف خیر الکلام نے کہا ہے کہ قرأت خلف الامام کو ضروری قرار دینے والوں کے دو قول ہیں ایک یہ کہ رکوع کی حالت میں اگر امام کو پائے تو اس رکعت میں فاتحہ فرض نہیں ہوتی ...... الخ (صہ ۴۵) لہٰذا یہ حضرات تو ہمارے ہمنوا ہوئے۔ رہے دوسرے حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ وہ رکعت اس کی شمار نہ ہوگی تو اس کا جواب انشاء اللہ تعالیٰ اپنے مقام پر آئے گا اور اس حکم میں حضرت ابوبکرہؓ کی خصوصیت بھی نہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے اور اسی حدیث سے جمہور اہل اسلام اور حضرات ائمہ

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ نمبر ۲) بعض محدثین اس کو لاَ تَعُدْ پڑھتے ہیں۔ یعنی نماز کے لیے دوڑ کر نہ چلا کرو۔ بلکہ اطمینان اور وقار سے چلو اور بعض اس کو لاَ تَعْدُ پڑھتے ہیں۔ یعنی پھر جماعت میں تاخیر اور تنہا صف کے پیچھے نماز شروع کرنے کی حرکت نہ کرنا اور بعض اس کو لاَ تُعِدْ پڑھتے ہیں۔ یعنی تمہاری نماز بالکل صحیح ہے۔ نماز کا اعادہ نہ کرو۔ امام نوویؒ نے (حاشیہ مشکوٰۃ صہ ۹۹ ملاحظہ کریں) اور حافظ ابن حجرؒ نے لاَ تُعِدْ کو بھی نقل کیا ہے۔ (دیکھئے فتح الباری جلد ۲ ص ۲۱۴) قاضی شوکانیؒ اور نواب صدیق حسن خانصاحبؒ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ نے دوبارہ نماز پڑھی اور اس کا اعادہ کیا اور انھوں نے طبرانی کی اس روایت سے استدلال کیا ہے صل ما ادرکت واقض ما سبقك (امام الکلام ص ۵۱) لیکن حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ نے غیث الغمام از ص ۴۶ تا ص ۵۰ میں اس کا عقلاً و نقلاً خوب رد کیا ہے۔ وہ بحث وہاں ہی ملاحظہ کریں یہاں اتنی بات پیش نظر رکھیں کہ طبرانی کی روایت کی سند کیا ہے؟ اور اگر سند صحیح بھی ثابت ہو جائے تو اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جو کارروائی تم نے کی پھر ایسا نہ کرنا بلکہ جو حصہ نماز کا تمہیں جماعت کے ساتھ مل جائے اس کو جماعت کے ساتھ پڑھو اور جو چھوٹ جائے اس کو جماعت کے بعد اکیلے پڑھو۔ اس سے یہ ثابت کرنا کہ اس نماز کے اعادہ کا حکم دیا خالص کم فہمی ہے۔

ے امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ بڑی محنت اور مشقت سے رکوع میں ملنے کی کوشش کیا کرتے تھے اور یہ اس کی واضح

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اربعہؒ نے مدرک رکوع کے مدرک رکعت ہونے پر استدلال اور احتجاج کیا ہے جس کی پوری تفصیل اپنے محل میں بیان ہو گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ علامہ ابن حزمؒ ایک موقع پر حضرت ابوبکرہؓ کی ایک روایت سے یوں استدلال کرتے ہیں کہ

فهذا آخر فعل رسول الله صلی الله علیه وسلم کان ابوبکرۃؓ شهده وانما کان اسلامه یوم الطائف بعد فتح مکة وبعد حنین۔ (محلی جلد ۲ جلد ۳ ص ۲۷۴)

یہ فعل اور عمل آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا آخری عمل ہے کیونکہ اس میں ابوبکرہؓ موجود اور حاضر تھے۔ اور وہ فتح مکہ اور حنین کے بعد طائف کے دن مشرف باسلام ہوئے تھے۔

اس صحیح اور مرفوع حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ امام کے ساتھ رکوع میں ملنے والے کی وہ رکعت صحیح ہے۔ اگر اس پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہوتا، جیسا کہ فریق ثانی کا زعم ہے تو یقیناً اس رکعت کا اعتبار نہ ہوتا اور فریق ثانی کے دعویٰ کے مطابق کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ (بلفظہ جیسا کہ سخن ہائے گفتنی میں عرض کیا جا چکا ہے) یہ نماز بھی کالعدم اور باطل ہونی چاہیئے تھی۔ عیاذاً باللہ تعالیٰ۔

تکبیر تحریمہ میں احناف کے نزدیک اتنا قیام جس میں تکبیر تحریمہ ادا ہو سکے فرض ہے۔ جب فرض ہے تو حضرت ابوبکرہؓ پر یہ فرض کیسے مخفی رہا پس لازمی امر ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ نے بحالت قیام ہی تکبیر تحریمہ ادا کی ہو گی، مؤلف خیر الکلام کا (ص ۴۵۳) میں یہ کہنا کہ ابوبکرہؓ نے قیام میں تکبیر کہہ کر رکوع کیا ہو گا۔ ایک فرضی

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) دلیل ہے کہ مدرک رکوع مدرک رکعت ہے۔ ورنہ یہ اکابر اس کی زحمت ہرگز گوارا نہ کرتے (بمعناہ) اور امام بیہقیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے ایک مرفوع روایت بھی نقل کی ہے کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا۔ اس نے وہ رکعت پالی۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۹۰) اس روایت کی سند میں یحییٰؒ بن ابی سلیمانؒ ہے جو متکلم فیہ ہے لیکن امام حاکم اور علامہ ذہبیؒ ان کی ایک سند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ صحیح ولم یذکر بجرح (مستدرک جلد ۱ ص ۲۷۳) اور دوسرے مقام پر امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقات بصریین میں تھے۔ اور علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (مستدرک جلد ۱ ص ۲۱۶) اسی مضمون کی ایک اور مرفوع حدیث بھی امام بیہقیؒ نے نقل کی ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ اور ان کے ساتھیوں کا بھی اسی پر عمل تھا۔ (ادب المفرد ص ۱۵۳)

بات ہے۔ بالکل غلط ہے۔ یہ فرضی بات نہیں ایک واضح اور کھلی حقیقت ہے اور اس کا انکار کرنا بے سود ہے۔

**دسویں حدیث:** امام ابن ماجہؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے علی بن محمدؒ[2] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے وکیعؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ اسرائیلؒ[4] سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابو اسحاقؒ[5] (السبیعیؒ) سے اور وہ ارقم بن شرحبیل[6] سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے (ایک طویل حدیث میں جس کا ضروری خلاصہ یہ ہے) روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت ابو بکرؓ کو آپ نے امامت سپرد کی۔ تاکہ وہ لوگوں کو نماز پڑھایا کریں۔ ایک مرتبہ آپؐ کو خیال ہوا کہ میں با جماعت نماز ادا کروں۔ پہلے آپؐ کو تکلیف زیادہ تھی۔ پھر جب مرض میں تخفیف ہوئی۔ تو آپؐ دو آدمیوں کے سہارے پر آہستہ آہستہ چل کر مسجد میں پہنچے

---

[1] امام ابن ماجہؒ صاحب السنن (المتوفی ۲۷۳ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر لکھتے ہیں۔ ابو یعلی الخلیلیؒ ان کو ثقہ کبیر اور متفق علیہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۸۹)

[2] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الحافظ، الثبت، محدث اور عالم قزوین تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ صہ ۲۹)

[3] وکیعؒ، الامام، الحافظ، الثبت، محدث العراق اور احد الائمۃ الاعلام تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۸۲) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ حافظ اور عابد لکھتے ہیں۔ (تقریب ص ۳۸۵)

[4] حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے بلاوجہ لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے۔ (ایضاً صہ ۳۲) امام احمدؒ، عجلیؒ، یعقوبؒ بن شیبہؒ، ابو حاتمؒ، ابن نمیرؒ، ابن سعدؒ اور نسائیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۲) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، الحجۃ، صالح، خداترس اور علم کا ظرف تھے۔ جن لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے۔ ان کا قول مردود ہے۔ امام بخاریؒ و مسلمؒ نے اُن سے احتجاج کیا ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۹)

[5] ان کا ترجمہ حدیث نمبر ۶ میں نقل ہو چکا ہے۔

[6] محدث ابو زرعہؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ، اور ابن عبد البرؒ ان کو ثقہ اور جلیل القدر محدث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۹۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۲۵)

اور آپ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے۔ اس سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نماز شروع کر چکے تھے۔ اور ایک حد تک قرأت بھی کر چکے تھے۔ غرضیکہ آپ صفوں میں سے گزرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں جا پہنچے چنانچہ وہ پیچھے ہٹ آئے اور ان کی جگہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور بیٹھ کر نماز پڑھائی۔ چونکہ آپ بیماری کی وجہ سے بلند آواز سے بول نہیں سکتے تھے۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں تک آواز پہنچانے میں مکبّر کا فریضہ انجام دیا اور جب آپؐ پہنچے تو

واخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من القرأۃ من حیث کان بلغ ابوبکرؓ۔

وہیں سے آپ نے قرأت شروع کی جہاں تک ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

(ابن ماجہ ص ۸۸ و مسند احمد جلد ۱ ص ۲۳۲)

اور ایک روایت میں (جو اس روایت کے لیے بطور شاہد اور تائید کے نقل کی جاتی ہے) یوں ہے: فقرأ من المکان الذی بلغ ابوبکرؓ من السورۃ۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۲۰۹)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سورت کے اس مقام سے قرأۃ شروع کی جہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

اور ایک روایت میں اس طرح ارشاد ہوا ہے:

فاستفتح النبی صلی اللہ علیہ وسلم من حیث انتہٰی ابوبکرؓ من القرآن۔

اور جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن کے اس حصہ سے قرأت شروع کی جس تک حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

(سنن الکبریٰ جلد ۳ ص ۸۱ و مسند احمد ج ۱ ص ۲۳۲)

اور ایک روایت میں اس طرح آیا ہے:

فاستتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حیث انتہی ابوبکرؓ من القرأۃ ..... الخ

(طحاوی جلد ۱ ص ۱۹۷)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں سے قرأت پوری کی جہاں تک حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

یہ روایت[1] سند کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔ اس کا ایک ایک راوی ثقہ ہے جیسا کہ آپ

---

[1] یہ روایت طحاوی جلد ۱ ص ۲۳۵ مشکل الآثار جلد ۲ ص ۲۷، طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۲۳۰، نصب الرایۃ جلد ۲ ص ۵۱، درایہ ص ۱۱۰ اور فتح الباری جلد ۲ ص ۱۳۵، دارقطنی ص ۱۵۳ وغیرہ میں مذکور ہے اور ازالۃ الخفا جلد ۱ ص ۸۶ میں ہے واخرجہ ابو یعلیٰ الموصلی فی مسندہ .... الخ

ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اور مؤلف خیر الکلام کو بھی اس کا اقرار ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ روایات مذکورہ بالا کے رواۃ ثقہ ہیں...... الخ ص۲۵۶ حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں کہ مسند احمد اور ابن ماجہ کی سند قوی[1] ہے۔ (فتح الباری جلد ۵ ص ۹۲۹) چونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بیمار تھے، جلدی جلدی چلنا آپ کے لیے دشوار تھا اور دو آدمیوں کے سہارے سے آپ مسجد میں پہنچے، حتّٰی کہ آپکے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے اور نماز آپ کے تشریف لانے سے قبل ہی شروع ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سورۃ فاتحہ مکمّل پڑھ چکے ہوں گے اور ان حالات کے پیشِ نظر یہی بات قرین انصاف ہے۔ اور اس میں تو ذرا برابر شک و شبہ کی گنجایش نہیں ہے کہ سورۃ فاتحہ اگر مکمل نہ ہوتی ہو گی تو اس کا اکثر حصّہ تو یقیناً پڑھا جا چکا ہو گا۔ اور آپؐ نے وہیں سے اور اُس آیت سے قرأت شروع کی جہاں تک حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے اور جن کے نزدیک سورۃ فاتحہ مقتدی پر لازم ہے۔ وہ سب سورۃ فاتحہ کے لزوم کے قائل ہیں اور جو منکر ہیں وہ بھی۔ سب سورۃ فاتحہ کے منکر ہیں۔ اس میں قائل بالفصل کوئی بھی نہیں الغرض آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوری سورۃ فاتحہ چھوٹ گئی تھی یا اس کا اکثر حصّہ مگر باوجود اس کے آپ کی نماز ادا ہو گئی۔ اور آپ نے اس نماز کو صحیح اور درست سمجھا، نہ آپ کی نماز کالعدم ٹھہری اور نہ باطل اور بیکار (عیاذاً باللہ تعالیٰ) اگر ہر رکعت میں امام[2] کے

---

[1] اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں واسنادہٗ حسن (فتح الباری جلد ۲ ص ۱۳۸)

[2] قاضی شوکانیؒ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے پوری فاتحہ چھوٹ چکی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ کیا بعید ہے کہ جس رکعت میں آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو پالیا تھا۔ اس رکعت کے علاوہ باقی سب رکعتوں میں آپ نے پوری اور مکمل سورۃ فاتحہ پڑھی ہو، آگے لکھتے ہیں:

لان النزاع انما ھو فی وجوب الفاتحۃ فی جملۃ الصلوٰۃ لا فی وجوبھا فی کل رکعۃ۔ (نیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۴۰)

کیونکہ سورۃ فاتحہ کے ہر ہر رکعت میں وجوب کا جھگڑا نہیں ہے بلکہ سورۃ فاتحہ کے جملہ نماز میں وجوب کا جھگڑا اور نزاع ہے۔

علامہ عبدالرحمٰن جزائریؒ لکھتے ہیں کہ مقتدی پر فرض ہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھے مگر جس صورت میں امام ساری فاتحہ یا اس کا کچھ حصّہ پڑھ چکا ہو تو اس صورت میں امام اس کا متحمل ہو جاتا ہے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پیچھے اقتدا کرنیوالے پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا لازم اور ضروری ہوتا تو آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ نماز ہرگز صحیح نہ ہوتی ہے حالانکہ آپؐ کی یہ نماز بالکل صحیح تھی اور امامؒ شافعیؒ و حافظؒ ابن حجر وغیرہ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ بیماری کے دنوں میں آپؐ نے صرف یہی ایک نماز جماعت سے ادا کی تھی۔ اور اس لحاظ سے آپ کے اس آخری فعل اور عمل سے بھی یہ حکم آشکارا ہو گیا کہ

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) (فقہ المذاہب الاربعہ، جلد۱ ص ۲۲۹) اور مولف خیر الکلام نے بھی یہ حوالہ نقل کیا ہے دیکھیئے ص ۴۶۹) اور خود مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ جو لوگ فاتحہ خلف الامام کو فرض سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے ہاں رکوع میں شامل ہونے سے رکعت ہو جاتی ہے اور ان میں سے بعض اس طرف بھی گئے ہیں کہ جہری نمازوں میں اگر مقتدی پوری فاتحہ یا آدھی فاتحہ کے بعد آئے تو اس سے ساری فاتحہ یا آدھی فاتحہ ساقط ہو جاتی ہے۔ اھ خیر الکلام ص ۴۵۹) قاضی صاحبؒ اور مؤلف خیر الکلام نے تو اس طرح گلو خلاصی کر کے وقت پاس کر لیا ہے۔ لیکن تمام دنیا کے علماء احناف کو کھلا چیلنج اور انعامی چیلنج کرنے والے تو ہر ہر رکعت میں قرأت فاتحہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔

لہ کتاب الام جلد ۲ ص ۱۸۵۔ ۲ہ فتح الباری جلد ۲ ص ۱۴۵۔

۳ہ روایات اور محدثینؒ کا اس باب میں شدید اختلاف ہے کہ مرض الموت میں آپ نے مسجد میں باجماعت ایک نماز پڑھی تھی یا دو؟ یہ نماز جہری تھی یا سری؟ آپ امام تھے یا مقتدی؟ وغیرہ وغیرہ صحیح یہ ہے کہ یہ ایک ہی نماز تھی جیسا کہ امام شافعیؒ وغیرہ نے فرمایا ہے اور یہ ظہر کی نماز تھی (بخاری جلد ۲ ص ۶۹۳) مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ ظہر میں قرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ سری نماز ہے.... الخ (ص ۴۶۵) بالکل مردود ہے۔ سری نمازوں میں قرأت ہوتی ہے جہر نہیں ہوتا ایک آدھ آیت کو قدرے آواز سے پڑھ لینا سر کے خلاف نہیں۔ مؤلف خیر الکلام نے محض اپنی گاڑی چلانے کے لیے قرأۃ کو نماز پر حمل کیا ہے جو بالکل بے دلیل ہے اور ان بالا دلائل سے آنکھیں بند کر کے وہ یہ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابتدا ہی سے امام تھے جو بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضؓ کی صحیح روایت صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ الذی توفی فیہ خلف ابی بکرؓ قاعداً جو اوپر گذر چکی ہے بالکل اس کے خلاف ہے اور یہ بھی صحیح روایت میں موجود ہے کہ جب حضرت ابو بکرؓ پیچھے ہٹنے لگے تو آپؐ نے اشارہ فرمایا کہ پیچھے مت ہٹو۔ اگر ابتداء سے

مقتدی پر سورۂ فاتحہ لازم نہیں ہے۔ امام بخاریؒ کے حوالہ سے آئے گا کہ یہ نماز ظہر کی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ سرّی نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأت ترک کرنا نہ صرف یہ کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مطابق ہے بلکہ آپ کا آخری عمل بھی یہی ہے۔ امام بخاریؒ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

انما یؤخذ بالآخر فالآخر من فعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (بخاری جلد ۱ ص ۹۶) یعنی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جو آخری عمل ہو گا۔ قابل عمل صرف وہی ہو گا۔

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) امامت کا ارادہ ہوتا تو ایسا نہ فرماتے، ہاں اس کے بعد آپ نے امامت کا فریضہ ادا کیا ہے اور امام طحاویؒ وغیرہ کی بھی یہی مراد ہے کہ آپؐ بالآخر امام تھے اور ابتدا میں آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا کی تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں یوں آتا ہے: صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ الذی توفی فیہ خلف ابی بکر قاعداً کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ (نسائی جلد ۱ ص ۱۲۷، طحاوی جلد ۱ ص ۲۳۷ بیہقی جلد ۳ ص ۸۲، ترمذی جلد ۱ ص ۴۸، محلی ابن حزم جلد ۳ ص ۹۶، ترمذیؒ فرماتے ہیں حسن صحیح) اور امام بخاریؒ (جلد ۱ ص ۹) نے یہ باب قائم کیا ہے۔ باب من قام الی جنب الامام لعلۃ اور امام نوویؒ (جلد ۱ ص ۱۶۹) نے باب استخلاف الامام اذا عرض لہ عذر اور امام نسائیؒ (جلد ۱ ص ۱۲۷) نے باب صلوٰۃ الامام خلف رجل من رعیتہ قائم کر کے اور یہ حدیث اس باب میں نقل کر کے اس امر کو مبرہن کیا ہے۔ یہ دلائل بھی ملاحظہ ہوں اور قاضی مقبول احمد صاحب کی یہ تعلی بھی دیکھیں کہ کیا مولانا سرفراز صاحب کسی حدیث سے ثابت کر سکتے ہیں کہ آپ پہلے بطور مقتدی شامل ہوئے تھے؟ ہرگز نہیں ...... الخ الاعتصام ۱۶ نومبر ۱۹۶۲ء ص ۶) اور پھر جب حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ کی آمد کا علم ہوا تو خود پیچھے ہٹ گئے۔ اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور آپؐ نے وہیں سے قرأۃ شروع کی جہاں تک حضرت ابوبکرؓ پڑھ چکے تھے اور صدیقؓ نے مکبر کا فریضہ ادا کیا (دیکھئے نووی جلد ۱ ص ۱۷۹، فتح الباری جلد ۲ ص ۱۲۴ وغیرہ) اور یہی بات صحیح اور صواب ہے ولیس وراء عبادان قریۃ حافظ ابن حجرؒ نے الفاظ حدیث کے ظاہری تعارض کی وجہ سے تعدد واقعہ کو الصواب کہا ہے (الدرایہ ص ۱۰۰) مگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو واقعہ صرف ایک ہی ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ کے حوالہ سے عرض کیا گیا ہے تطبیق آسانی سے ہو سکتی ہے اور تعدد واقعہ کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

الحمد للہ تعالیٰ کہ جس طرح جمہور کا مسلک متعدد صحیح و مرفوع قولی حدیثوں سے حق ثابت ہو چکا ہے اسی طرح آپ کے آخری عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس روایت سے متعلق فریق ثانی کی طرف سے جو اعتراضات وارد کئے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نقل کر کے ان کے جوابات بھی عرض کر دیئے جائیں۔

**پہلا اعتراض:** مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ابو اسحاق السبیعیؒ واقع ہیں اور وہ مدلس تھے اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ علاوہ بریں آخر عمر میں وہ اختلاط کا شکار بھی ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کی روایت کار آمد نہیں ہو سکتی۔ (او کما قال تحقیق الکلام جلد ۲ ص۔ وغیرہ) اور یہی عذر لنگ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے کہ ابو اسحاق رح تیسرے درجے کے مدلس ہیں جن کی روایت بدوں تصریح سماع مقبول نہیں ہے محصلہ خیر الکلام صـ۴۶ ۲۶، ۴۰۹) مگر بخاری میں ان کی معنعن حدیثوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ تاقیامت دے بھی نہ سکیں گے۔

**جواب:** حضرت قتادہؒ کی تدلیس کے ضمن میں حضرات محدثین کرامؒ کا یہ ضابطہ نقل کیا جا چکا ہے کہ تدلیس کرنیوالے راویوں کا ایک گروہ وہ بھی ہے جن کی تدلیس کسی طرح مضر نہیں ہے اور محدثینؒ ان کی معنعن حدیثوں کو بھی صحیح سمجھتے ہیں، جن میں خصوصیت سے ابو اسحاق السبیعیؒ کا نام بھی پیش کیا گیا ہے۔ رہا ابو اسحاق السبیعی کی تخلیط کا سوال تو وہ بھی چنداں باعث تشویش نہیں ہے۔ کیونکہ علامہ ذہبیؒ ناقد فن رجال لکھتے ہیں کہ وہ ائمہ تابعین رح اور اثبات میں تھے، بڑھاپے کی وجہ سے ان پر کچھ نسیان طاری ہو گیا تھا۔ ولم یختلط (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۹۳) لیکن وہ مختلط نہیں ہوئے تھے۔

اور تصریح کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں ان سے صرف ابن عیینہؒ نے سماعت کی ہے اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| قلت ما اختلط ابو اسحاق ابداً وانما یعنی بذلک التغیر ونقص الحفظ۔ (تذکرہ ۱ صـ۱۱۵) | میں کہتا ہوں کہ ابو اسحاق تخلیط سے کبھی دوچار نہیں ہوئے تھے۔ ہاں ان کے حفظ میں کچھ تغیر اور نقص واقع ہو چکا تھا۔ |

اور فن اصول حدیث کا یہ طے شدہ قاعدہ ہے[1] کہ معمولی وہم، تغیر یسیر اور نسیان کی وجہ سے ثقہ رواۃ

---

[1] امام عبد اللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ وہم سے کون بچ سکتا ہے؟ (لسان المیزان جلد ۱ صـ۱۷) امام احمدؒ فرماتے

کی روایتوں کو ہرگز رد نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال ابو اسحاق السبیعیؒ کی تدلیس اور تخلیط کا بہانہ کرکے ان کی صحیح روایت کو رد کرنا سراسر باطل ہے۔

بعض محدثین (جن میں حافظ ابن حجرؒ وغیرہ بھی ہیں) اختلاط وغیرہ کا لفظ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن صرف لغوی اور عمومی معنوں میں جس سے ان کی ثقاہت اور عدالت پر کوئی دھبہ نہیں لگ سکتا اور اسی لیے وہ ان کی روایت کی تصحیح اور تحسین کرتے ہیں۔ مگر مبارکپوری صاحبؒ[1]

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ہیں کہ امام یحییٰ بن سعیدؒ پختہ کار محدث تھے اور بہت کم خطا ان سے سرزد ہوتی تھی۔ مگر باوجود اس کے چند حدیثوں میں ان سے بھی خطا ہوئی ہے آگے فرماتے ہیں: ومن یعری من الخطاء و التصحیف (بغدادی جلد۱۴ صفحہ۱۴۰) یعنی متن اور سند میں خطا سے کون محفوظ رہ سکتا (بلکہ سکا) ہے؟ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ ابو الحسن القطانؒ نے ہشامؒ بن عروہؒ اور سہیل بن ابی صالحؒ پر جو تخلیط کا الزام لگایا ہے وہ باطل ہے۔ ہاں ان کے حافظہ میں کچھ نقص ضرور پیدا ہوچکا تھا۔ لیکن کیا وہ نسیان سے معصوم تھے؟ پھر کیا ہوا؟ کیا اس قسم کا وہم امام مالکؒ، امام شعبہؒ اور امام وکیعؒ وغیرہ اکثر ائمہ اور ثقات کو پیش نہیں آتا رہا؟ تو کیا ان کی روایتیں رد کردی جائیں گی؟ خبط چھوڑ دے اور ائمہ ثقات سے بدظنی نہ کر (میزان الاعتدال جلد۲ ۲۵۵) محدث عقیلیؒ نے امام علیؒ بن المدینی پر جرح کی تھی۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں:

فمالك عقل یا عقیلی اتدری فی من تکلم۔ — یعنی اے عقیلیؒ تیری عقل کو کیا ہوگیا ہے؟ تو کس امام میں کلام کر رہا ہے۔

پھر آگے جوشِ تحریر میں آکر عقیلیؒ سے ملتی جلتی عقل والوں کو الٹی میٹم کرتے ہیں۔

وانما اشتهی ان تعرفنی من هو الثقة الثبت الذی ما غلط۔ — میں چاہتا ہوں کہ میرے سامنے تم کسی ایسے ثقہ کا نام تو ذرا ہمت کرکے پیش کرو جس سے غلطی سرزد نہ ہوئی ہو

(میزان جلد ۲ ص ۲۳۱)

اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ کبھی کبھی غلطی کا ہوجانا یہ کوئی ایسا اعتراض نہیں جس سے حدیث ضعیف ہوجاتے پس یہ حدیث صحیح ہے ..... الخ صہ۳۰۷۔

اگر وہم اور اختلاط کی مزید تحقیق مطلوب ہو تو (فتح المغیث صہ۱۳ وغیرہ) اصول حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اس قاعدہ سے غافل اور بے خبر ہیں اور خواہ مخواہ ان کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔

**دوسرا اعتراض:** مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اسرائیلؒ بن یونسؒ نے ابو اسحاق السبیعیؒ سے روایت کی ہے اور ان سے اسرائیلؒ کی سماعت اختلاط کے بعد ہوئی تھی۔ لہٰذا یہ روایت قابل توجہ نہیں (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص)

**جواب:** یہ اعتراض بھی مردود ہے۔ **اولاً۔** اس لیے کہ ابو اسحاقؒ اس اصطلاحی تخلیط کا تو کبھی شکار ہی نہیں ہوئے جس کے سبب ان کی روایت کمزور اور ضعیف سمجھی جاسکے اور ان کے معمولی وہم اور تغیر حفظ سے ان کی حدیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے اگر اسرائیلؒ کی سماعت ابو اسحاقؒ کے لغوی اختلاط یا نقص حفظ کے بعد بھی ہو، تو اس کا اثر اور فرق کیا نکلے گا؟ **ثانیاً۔** امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ ابو اسحاقؒ کے جملہ تلامذہ میں اسرائیلؒ ابو اسحاقؒ کی روایتوں میں اصح اثبت اور احفظ واقع ہوئے ہیں (جلد ۱ ص) امام ابن مہدیؒ کا بیان ہے کہ اسرائیلؒ کو اپنے دادا ابو اسحاقؒ کی جملہ روایتیں اس طرح یاد تھیں جیسا کہ مسلمانوں کو سورۂ فاتحہ یاد ہوتی ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۹ وتہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۶۱) علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ اسرائیلؒ صحیحین کے راوی ہیں۔ وھو فی الثبت کالاسطوانۃ۔ یعنی وہ حدیث کے بیان کرنے میں ایسے مضبوط تھے، جیسے ستون۔ البتہ ہاں امام شعبہؒ ان سے زیادہ ثبت تھے لیکن ابو اسحاقؒ سے روایت کرنے میں اسرائیلؒ امام شعبہؒ سے بھی زیادہ ثبت تھے۔ (میزان جلد ۱ ص ۹۸) اور تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۴ میں ایک حدیث کے بارے میں جس میں اسرائیل عن ابی اسحاقؒ ..... الخ ہے فرماتے ہیں اسناد قوی امام دارقطنیؒ

---

لہ حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کی ایک جگہ تصحیح (فتح الباری جلد ۵ ص ۲۶۹) اور دوسری جگہ تحسین کی ہے (جلد ۲ ص ۱۲۵) اور مبارک پوری صاحبؒ کی بڑی ہی سعادت ہے کہ ان کو حافظ صاحب کی صرف تحسین ہی ملی ہے اور اس پر بھی وہ بڑے ناراض ہیں۔ اگر ان کی تصحیح بھی مل جاتی تو نہ معلوم ان پر کیا گذرتی؟ مگر از راہ بزرگی یہ نہ سوچا کہ ابو اسحاق رہ کی تدلیس مضر ہے اور نہ نقص حفظ اور تغیر کی وجہ سے ان کی حدیث ضعیف ہے بلکہ ان کی روایت اصول حدیث کے رُو سے بہر حال صحیح ہے۔ لا شک فیہ۔

کا بیان ہے کہ امام عبدالرحمٰنؒ بن مہدیؒ نے فرمایا کہ ابواسحاقؒ کی روایتوں میں اسرائیلؒ امام شعبہؒ اور سفیان ثوریؒ سے بھی زیادہ ثقہ تھے۔ (دار قطنی جلد ۲ ص ۳۸۱) اور تقریباً یہی مضمون حافظ ابن حجرؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ (درایہ صفحہ ۲۲ و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۳) مولانا شمس الحق صاحبؒ اسرائیلؒ عن ابی اسحاقؒ..... الخ کی روایات کے بارے میں یہ فیصلہ درج کرتے ہیں کہ کلہا صحیحۃ التعلیق المغنی جلد ۲ ص ۳۸۱) اور حافظ ابن حجرؒ اسرائیلؒ عن ابی اسحاق..... الخ کی سند کی تصحیح کرتے ہیں۔ حافظ ابن القیمؒ، ابواسحاقؒ کے تمام تلامذہ اور اصحاب میں اسرائیلؒ کو اتقن لکھتے ہیں۔ (زاد المعاد جلد ۲ ص ۳۳۶) اور لطف بالائے لطف یہ ہے کہ مبارکپوری صاحبؒ نے تحقیق الکلام اور ابکار المنن میں جوش جوانی میں سب اناپ شناپ لکھ مارا ہے۔ لیکن جب تحفۃ الاحوذی لکھنے کی باری آئی اور عقل اور علم میں پختگی ہوگئی اور اپنی ذمہ داری کا گہرا احساس ہوا تو اس قاعدہ کے لکھنے پر مجبور ہوگئے کہ اسرائیلؒ ابواسحاقؒ سے روایت کرنے میں امام شعبہؒ اور سفیان ثوریؒ سے بھی زیادہ قوی اور ثبت تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۱۷۱)

اب انصاف شرط ہے کہ ہم مبارکپوری صاحبؒ کی اس سے بڑھ کر اور کیا تسلی کر سکتے ہیں؟

وثالثاً۔ اس روایت میں اسرائیلؒ کے ایک اور ثقہ اور ثبت متابع بھی موجود ہیں، جن کا نام زکریاؒ بن ابی زائدہؒ ہے۔ چنانچہ عبداللہؒ بن احمدؒ اپنے والد امام احمدؒ بن حنبلؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ یحییٰ

---

۱ مثلاً دیکھئے فتح الباری جلد ۶ ص ۴۵۸ و جلد ۷ ص ۸۰ وغیرہ۔ اگر مبارکپوری صاحبؒ اور ان کے اتباع کے نزدیک اسرائیل عن ابی اسحقؒ..... الخ کی سند ضعیف اور کمزور ہے تو از راہ کرم بخاری (مثلاً جلد ۱ ص ۵۰، ۱ ص ۲۲۸، ۱ ص ۳۱۷، ۱ ص ۳۹۴، ۲ ص ۵۷۹ و ۲ ص ۱۰۰۱ وغیرہ) اور مسلم کی تمام حدیثوں پر قلم پھیر دیں۔ کیونکہ ان میں ابواسحاق کا اختلاط کارفرما ہوگا۔ قاضی مقبول احمد صاحب ان کو نسیان کا مرض لگا کر وہمی قرار دیتے ہیں۔ (دیکھیے الاعتصام ص ۶ ۱۶ نومبر ۱۹۶۲ء) لہٰذا بخاری اور مسلم سے اس وہمی کی سب روایتیں نکال دیں۔ ملاحظہ کیجئے کہ غیر مقلدین کے تعصب اور گروہ بندی کی وجہ سے صحیحین کی کتنی احادیث غیر صحیح قرار پاتی ہیں۔ نعوذ باللہ تعالیٰ من شرور انفسنا۔

۲ اس سند کے باقی راویوں کی توثیق پہلے نقل کی جا چکی ہے یحییٰؒ بن ابی زکریاؒ کو حافظ ابن کثیرؒ من الائمۃ الثقات لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۸۴) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الثبت، المتقن اور الفقیہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۴۶) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور متقن تھے۔ (تقریب ۳۹۱)

بن ابی زکریاؒ سے اور وہ زکریا بن ابی زائدہؒ[1] سے اور وہ ابو اسحاق السبیعیؒ سے اور وہ ارقم بن شرحبیلؒ سے اور وہ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے حدیث کا وہی مضمون ہے جو پہلے نقل کیا جاچکا ہے۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۳۳۱) جب اسرائیلؒ خود اوثق اور اثبت ہیں اور ان کا متابع بھی ثقہ اور ثبت ہے تو پھر ان کی روایت کیوں صحیح نہیں ہے؟ الغرض نہ تو یہ روایت شاذ ہے جیسا کہ الاعتصام ۱۶ نومبر ۱۹۶۲ء ص ۶ میں اس پر بلاوجہ زور لگا کر تعصب کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور نہ یہ مرجوح اور بخاری کی روایت راجح ہے۔ راجح اور مرجوح کا سوال تعارض کے وقت ہوتا ہے۔ جب دونوں میں تعارض ہی نہیں تو راجح و مرجوح کا سوال بالکل بیکار ہے دونوں صحیح ہیں۔ ایک مجمل ہے اور دوسری مفصل ہے جس میں زیادت ثقہ ہے۔ جو باتفاق جملہ محدثین کرام قابل قبول ہے۔

## حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا شاہد:

اسدؒ[2] بن موسیٰؒ اپنی کتاب فضائل صحابہؓ میں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو معاویہؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو صداقت شعار مشہور اور حافظ لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۱ ص ۳۴۹) امام عجلیؒ، ابو زرعہؒ، ابو داؤدؒ، نسائیؒ یعقوبؒ بن سفیانؒ اور ابو بکر البزارؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام قطانؒ ان کو لا بأس بہ اور ابن معینؒ صالح کہتے ہیں۔ امام احمدؒ ان کو ثقہ اور حلو الحدیث اور علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ صفحہ ۳۳۲) غرضیکہ اس سند کے بھی جملہ رواۃ ثقہ اور ثبت ہیں۔

[2] امام بخاریؒ اسدؒ بن موسیٰؒ کو مشہور الحدیث اور امام نسائیؒ اور ابن یونسؒ ثقہ کہتے ہیں۔ خلیلیؒ ان کو صالح کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۰) مولانا شمس الحق صاحبؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے (التعلیق المغنی جلد ۱ ص ۵۰) امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ ایک سند کو جس میں اسدؒ بن موسیٰؒ ہے علیٰ شرط مسلم صحیح کہتے ہیں (مستدرک مع التلخیص جلد ۳ ص ۳۹۳)

[3] مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ مجھے کتب اسماء الرجال میں ان کا پتہ نہیں مل سکا۔ نہ معلوم وہ کون اور کیسا تھا؟ اگر ایسے مشہور اور ثقہ محدث کا پتہ بھی مبارکپوری صاحبؒ کو نہیں مل سکا تو ان کو کیا ملے گا؟ ان کا نام محمدؒ بن خازمؒ اور لقب ضریر تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ ان کو احد مشائخ الحدیث الثقات المشہورین لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۲۲۵) علامہ ذہبیؒ ان کو احد الائمۃ الاعلام الثقات (میزان جلد ۳ ص ۳۸۲) اور ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۹۹) امام عجلیؒ

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

عبد الرحمن بن ابی بکرؒ سے اور وہ ابن ابی ملیکہؒ سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث کا بعینہ مضمون وہی ہے جو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت میں گذر چکا ہے (حافظ بدر الدین عینیؒ نے عمدۃ القاری جلد ۲ ص ۱۴۷ میں نقل کیا ہے)

تیسرا اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں اضطراب ہے کیونکہ پیش کردہ سندوں میں عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ..... الخ ہے۔

---

(بقیہ پچھلا صفحہ) یعقوبؒ بن سفیانؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن خراشؒ ان کو صدوق کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور متقن تھے۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۱۳۷) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تقریب ص ۳۱۸) علامہ خطیبؒ نے ان کا پورا ترجمہ نقل کیا ہے (بغدادی جلد ۵ ص ۲۴۲)

[1] جمہور محدثینؒ واقعی ان کی تضعیف کرتے ہیں مگر ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ ان کی حدیثیں لکھی جا سکتی ہیں۔ امام ساجیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان میں ضعف ہے مگر قابل برداشت ہے۔ فیہ ضعف یحتمل۔ ابن حبانؒ ان کی توثیق کی طرف مائل ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں ینفرد عن الثقات ما لا یشبہ حدیث الاثبات یعنی وہ ثقہ راویوں سے ایسی روایات میں منفرد ہوتے ہیں جو اثبات یعنی ثقہ اور ثبت راویوں کی روایات کے مشابہ نہیں ہوتیں کم ہوتی ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۱۴۶) امام ابن معینؒ نے ان کو ضعیف ابو حاتمؒ نے لیس بقوی فی الحدیث اور نسائیؒ نے لیس بثقہ اور متروک الحدیث کہا ہے لیکن مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۷ و ص ۴۸ میں الرفع والتکمیل ص ۸ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ جرح مفسر نہیں اور عام فقہاءؒ اور محدثینؒ کے نزدیک اس کا اعتبار نہیں۔ (محصلہ) البتہ امام بخاریؒ اور امام احمدؒ نے اس راوی کو منکر الحدیث کہا ہے۔ (تہذیب جلد ۶ ص ۱۴۶) لیکن مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اگر امام بخاریؒ کسی راوی کو منکر الحدیث کہیں تو اس سے روایت کرنا ان کے ہاں جائز نہیں۔ امام احمدؒ اور اس قسم کے لوگ کسی کو منکر کہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ قابل احتجاج نہیں ہے۔ (بلفظہ ص ۴۹) اور ہم نے تو ان کو صرف شاہد کے طور پر پیش کیا ہے نہ کہ بطور احتجاج کے۔ اور مؤلف خیر الکلام ایک مقام میں لکھتے ہیں کہ ان (آثار) کے بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں ہے۔ (بلفظہ ص ۳۱۶)

[2] ذہبیؒ ان کو امام فقیہ حجت فصیح اور بلند مرتبہ لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی ثقاہت پر سب کا اتفاق اور اجماع ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۹۶)

اور مسند بزار[1] کی روایت میں عن ابن عباسؓ عن ابیہ العباسؓ عن النبی ﷺ ...... الخ اس لیے یہ روایت قابلِ احتجاج نہیں ہو سکتی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص محصلہ)

**جواب:** مبارکپوری صاحبؒ کو لفظ اضطراب تو آتا ہے، مگر افسوس کہ وہ حقیقتِ اضطراب سے ناواقف ہیں۔ محدثین کرامؒ کے نزدیک اضطراب کی چند شرطیں ہیں۔ ایک شرط یہ ہے کہ دونوں سندیں ہم پایہ اور ہم مرتبہ ہوں ورنہ اضطراب نہ ہوگا صحیح قابل اخذ ہوگی اور ضعیف قابل رد ہوگی۔ (دیکھیے شرح نخبۃ الفکر صـ۴۲ وغیرہ) اور ہم نے حضرت ابن عباسؓ[2] کی جو سندیں بیان کی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں اور ایک ایک راوی ثقہ اور ثبت ہے اور مسند بزارؒ کی روایت میں قیس بن ربیع واقع ہے۔ امام بخاریؒ کا بیان ہے کہ امام وکیعؒ ان کو ضعیف کہتے تھے۔ (ضعفاء صغیر ص ۲۶) امام نسائیؒ اس کو متروک الحدیث لکھتے ہیں (ضعفاء صغیر نسائی ص ۵۱) امام ابو حاتمؒ اور امام یحییٰؒ اس کو لیس بالقوی اور ضعیف کہتے تھے۔ امام احمدؒ اس کو کثیر الخطاء اور ابن مدینیؒ و دارقطنیؒ اس کو ضعیف کہتے تھے (میزان الاعتدال جلد ۲ ص) اور لطف یہ ہے کہ خود

---

[1] یہ روایت نصب الرایہ جلد ۲ ص ۵ میں بھی ذکر کی گئی ہے۔ اور مسند احمد جلد ۱ ص ۲۰۹، اور دارقطنی جلد ۱ ص ۱۵۳ وغیرہ میں بھی آتی ہے۔

[2] اگر کوئی صاحب حضرت ابن عباسؓ کی کم سنی کا بہانہ کرتے ہوئے ان کی روایت کے مرسل ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ بھی باطل ہوگا کیونکہ اگر بالفرض حضرت ابن عباسؓ کی روایت مرسل بھی ہو، تب بھی حضرات صحابہؓ کے مراسیل بالاتفاق حجت ہیں، جس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر بیان ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز۔ علاوہ بریں اس میں قدرے اختلاف ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت ابن عباسؓ کی عمر دس سال تھی یا پندرہ؟ مسند احمد جلد ص ۳۳۷ میں اور مستدرک جلد ۳ ص ۵۳۴ میں بسند قوی اور صحیح یہ روایت موجود ہے کہ آپ کی وفات کے وقت ان کی عمر پندرہ برس کی تھی اور اسی کو امام نوویؒ (جلد ۱ ص ۱۹۶) وغیرہ نے ترجیح دی ہے اور یہ روایت مرض الموت کی ہے۔ اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کم سنی وغیرہ کے بہانے سے ان کی روایت کو مرسل قرار دینا مردود اور باطل ہوگا اور بخاری جلد ۲ ص ۷۵۳ کی روایت سے آپ کی وفات حسرت آیات کے وقت ان کی عمر دس سال ثابت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مبارک پوری صاحبؒ بھی اس کو ضعیف اور کمزور بتاتے ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵) اس لیے اس حدیث کے اضطراب کا دعوٰی قطعاً مردود اور باطل ہے۔ یہ حدیث بلاچون وچرا صحیح ہے۔ البتہ لا تسلم کا کوئی جواب نہیں ہے۔

چوتھا اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں (اور اسی کو مؤلف خیر الکلام نے دوہرایا ہے ملاحظہ ہو ص ۲۶۴ ) کہ اس روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے سورۃ فاتحہ چھوٹ گئی اور مع ہٰذا آپ کی نماز درست ہو گئی بلکہ روایات سے ثابت ہے کہ آپ نماز پوری کیے بغیر حجرہ میں تشریف لے گئے تھے۔ تو یقیناً آپ نے وہاں نماز مکمل کی ہو گی اور اس دعوی پر یہ حدیث نقل کی ہے:

| | |
|---|---|
| فما قضی النبی صلی اللہ علیہ وسلم الصلوٰۃ حتی ثقل فخرج یہادی بین الرجلین۔ | پس آپ نے ابھی نماز مکمل نہ کی تھی کہ آپ کے مرض میں اضافہ اور تیزی ہو گئی۔ سو آپ دو آدمیوں کا سہارا لے کر مسجد سے باہر تشریف لے گئے۔ |

اس میں حرف فاء ہے جو تعقیب بلا مہلہ کے لیے آتا ہے۔ لہٰذا اس روایت[1] سے ترکِ قرأت

---

[1] یہ روایت مشکل الآثار جلد ۱ ص ۔ اور المختصر ص ۴۹ و طحاوی جلد ۱ ص ۲۳۵ وغیرہ میں مروی ہے اور سنن الکبریٰ جلد ۳ ص ۸۱ کے الفاظ یہ ہیں فما قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصلوٰۃ حتی ثقل جداً فخرج یہادی بین الرجلین وان رجلیہ لتخطان الارض فمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یوص۔ سو آپ نے نماز پوری نہ کی تھی۔ حتیٰ کہ آپ پر بیماری کا غلبہ ہو گیا۔ پس آپ دو آدمیوں کے سہارے سے تشریف لے گئے اور آپ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے۔ پس آپ کی وفات ہو گئی اور آپ نے کوئی وصیت نہ کی۔ فمات میں بھی حرف فاء ہے۔ کیا مبارک پوری صاحبؒ کی تحقیق میں مسجد سے نکلنے کے فوراً بعد آپ کی وفات ہو گئی تھی۔ یا چار پانچ دن کے بعد وفات ہوئی تھی؟ (دیکھئے البدایہ والنہایہ جلد ۵ ص ۲۲۵ وغیرہ) اگر ان کے نزدیک ہر مقام پر حرفِ فاء تعقیب بلا مہلہ کے لیے آتا ہے تو وہ اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوا الآیۃ میں اور اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ میں اور اِذَا صَلَّیْتُمْ عَلَی الْمَیِّتِ فَاَخْلِصُوا لَہُ الدُّعَاءَ میں اور تزوج فلان فولد لہ وغیرہ وغیرہ مقامات میں کیا ارشاد فرمائیں گے؟ اور اگر ان مقامات میں حرف فاء تفصیل کے لیے ہے یا کسی اور مناسب

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

سُورۂ فاتحہ کا مسئلہ اور بصورت ترک تکمیلِ نماز کا ادعا صحیح نہیں ہے۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ صا)

جواب: مُبارک پوری صاحبؒ کا یہ دعویٰ کرنا کہ آپ نماز کی تکمیل کے بغیر مسجد سے باہر نکل کر تشریف لے گئے تھے نہ معلوم کس بات پر مبنی ہے؟ اِس دعویٰ کا ثبوت تو کسی روایت سے نہیں مل سکتا۔ اس روایت سے تو اتنا ہی ثبوت ملتا ہے کہ نماز کی تکمیل سے قبل ہی آپ پر بیماری کا زور ہو گیا۔ اور اگر فَخَرَجَ میں حرف فَاء کو مبارکپوری صاحبؒ تعقیب بلا مہلہ کے لیے سمجھتے ہیں اور اس پر اپنے دعوٰے کی بنیاد رکھتے ہیں تو یہ ان کو سراسر مضر پڑے گا۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ علاوہ بریں اس کی تصریح موجود ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ نماز ہی پوری کی، بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ کو نماز کے بعد خطاب بھی فرمایا تھا۔ چنانچہ ایک روایت میں یوں الفاظ آتے ہیں: فصلّٰی لهم وخطبهم (بخاری ۲ صا۸۵) آپ نے حضرات صحابہ کرامؓ کو نماز پڑھائی اور ان سے خطاب فرمایا

اور ایک روایت میں یوں آتا ہے:

ثم خرج الی الناس فصلّٰی لهم وخطبهم۔ (بخاری ۲ ص ۶۳۹ و فتح الباری) پھر آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (اپنے حجرہ سے) لوگوں کی طرف نکلے ان کو نماز پڑھا کر ان سے خطاب

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) معنیٰ میں مستعمل ہوا ہے تو خَرَجَ میں حرف فَاء سے کوئی ایسا مناسب اور موزوں معنیٰ کیوں نہیں لیا جا سکتا تاکہ دوسری صحیح روایات سے تعارض پیدا نہ ہو اور اگر مبارکپوری صاحبؒ اس پر بضد ہیں کہ حرف فَاء تعقیب بلا مہلہ کے لیے ہی ہونا چاہیے تو کامیابی پھر بھی جمہور کی ہو گی۔ کیونکہ قرآن کریم کی آیت واذا قرئ القراٰن فاستمعوا له... الآیة اور حدیث اذا قرأ الامام فانصتوا میں بھی ان کے اصول کے تحت حرف فاء تعقیب بلا مہلہ کے لئے ہو گا۔ اور مطلب یہ ہو گا کہ امام کی قرأت شروع کرنے کے فوراً بعد مقتدیوں پر استماع اور انصات واجب ہے۔ اور سبھی جانتے ہیں کہ امام کی قرأت سورۂ فاتحہ سے شروع ہوا کرتی ہے۔ نہ کہ ما زاد علی الفاتحہ سے۔ لہٰذا مقتدیوں پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ممنوع ٹھہرا۔ اور قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنے کی رٹ باطل ہو گئی ؎

خوش نوایانِ چمن کو غیب سے مژدہ ملا
دام میں صیاد اپنے مبتلا ہونے کو ہے

جلد ۱۰ ص ۱۴۰ و عمدۃ القاری جلد ۱۰ ص ۱۷۱) فرمایا۔

اس صحیح اور صریح روایت سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے جماعت کے ساتھ نماز کی تکمیل کی۔ اور پھر حضرات صحابہ کرامؓ سے خطاب بھی کیا۔ اور جو روایت مبارکپوری صاحبؒ نے پیش کی ہے۔ اس سے ان کا مدعیٰ ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا مفہوم تو صرف اتنا ہے کہ تکمیل نماز سے قبل ہی آپ کا مرض بڑھ گیا تھا۔ اور اس کا کون منکر ہے؟ اور نماز اور خطاب سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ دو آدمیوں کے سہارے سے جیسے تشریف لائے تھے۔ ویسے ہی واپس تشریف لے گئے۔ اگر مبارک پوری صاحبؒ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ بحالت نماز مرض بڑھ نہیں سکتا یا تکمیل نماز کے بغیر ہی دو آدمیوں کے سہارے پر گھر جانا ہی متحقق ہو سکتا ہے۔ تو ہماری بلا سے مبارک پوری صاحبؒ جانیں اور ان کی سمجھ۔ بہر صورت مسئلہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آخری باجماعت نماز میں سورۂ فاتحہ مکمل یا اس کا اکثر حصہ نہیں پڑھا تھا۔ مع ہذا آپؐ کی نماز صحیح ہو گئی تھی۔ و ہو المطلوب۔

**پانچواں اعتراض:** مولوی محمد صادق صاحب سرگودھوی (غیر مقلد) لکھتے ہیں کہ اگر آپؐ نے امام ہونے کے باوجود سورۂ فاتحہ ترک کی تو حنفیہ بھی کہتے ہیں کہ امام پر سورۂ فاتحہ واجب ہے تو حنفیہ کا اعتراض جیسا کہ اہل حدیث پر ہے۔ ویسا ہی ان حنفیوں پر بھی ہے۔ (خیر الکلام ص ۶۰)

**جواب:** یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فقہائے حنفیہ کی کتابیں دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ورنہ وہ اس قسم کی سطحی بات ہرگز تحریر نہ کرتے۔ علماء احناف کے نزدیک سورۂ فاتحہ کی قرأۃ اس امام پر ضروری ہے جو اول سے آخر تک امامت کا فریضہ ادا کر رہا ہو۔ اگر کسی نے اس حالت میں امام کی اقتدا کی ہو۔ کہ امام سورۂ فاتحہ پڑھ چکا ہو یا رکوع کے لیے سر جھکا چکا ہو۔ اور امام کو حدث لاحق ہو گیا ہو تو ایسے مقتدی کو امام اپنا نائب اور خلیفہ بنا سکتا ہے اور ایسے نائب امام کی نماز بغیر سورۂ فاتحہ پڑھے بھی جائز اور صحیح ہے۔ اور رکوع کی حالت میں بھی مسبوق کو نائب اور خلیفہ بنانا جائز ہے۔ (دیکھئے ہدایہ جلد ۱ ص ۱۱۰ وغیرہ) اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا کی تھی اور بعد کو آپ نے امامت کا فریضہ ادا کیا تھا جیسا کہ اس کی پوری تشریح

پہلے ہو چکی ہے۔ لہٰذا حنفیوں پر تو مطلقاً اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ ہاں البتہ اپنے آپ کو اہل حدیث کہلانیوالے اور صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ کی حدیث پر عامل ہونے کے مدعی اس صحیح حدیث سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور شاید کہ تا قیامت ہو بھی نہ سکیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دیگر صحیح قولی احادیث کی طرح آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اس صحیح اور فعلی حدیث سے بھی یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی آخری باجماعت نماز بغیر سورۂ فاتحہ پڑھے بھی درست اور صحیح ہو گئی تھی اور یہی جمہور اہل اسلام کا مسلک ہے اور آپ کے آخری فعل کے حق اور درست ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس کے بعد نسخ کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے از راہ انصاف خدا تعالیٰ سے ڈر کر فریق ثانی کو اپنے اس فتویٰ پر نظر ثانی کرنی چاہیے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس آخری عمل کے پیش نظر یہ فتویٰ کس بے باکی اور جسارت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیاں اور لغزشیں معاف کرے۔

گیارھویں حدیث: امام احمدؒ بن منیعؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے اسحٰق[2] ازرقؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سفیان ثوریؒ اور شریکؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ دونوں روایت

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۷۰)

[2] حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۳۲۵) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۹۴) حافظ ابن کثیرؒ ان کو احد الائمۃ الحدیث لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۲۲۷)

[3] سفیان ثوریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے اور شریکؒ ان کے متابع ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الصادق اور احد الائمۃ لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۳۹۶) نیز لکھتے ہیں کہ وہ احد الائمۃ الاعلام، حسن الحدیث، امام، فقیہ اور کثیر الحدیث تھے وحدیثہ من اقسام الحسن (تذکرہ ۱ ص ۲۱۴) علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ مامون اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۳۳۶) یہ یاد رہے کہ

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کرتے ہیں موسیٰ بن ابی عائشہؒ سے۔ وہ عبد اللہؒ بن شدادؓ سے اور وہ حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ (بحوالہ فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۳۹)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے امام کی اقتدا کی تو امام کی قرأۃ مقتدی کو بس ہے۔

اس روایت[۳] میں جہری اور سری نماز کی کوئی قید موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ اپنے عموم پر ہے کیونکہ اس میں حرف مَنْ شرطیہ ہے جو عموم کے لیے ہے۔ بخلاف لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ کے کہ وہاں حرف من موصولہ یا موصوفہ ہے جس میں عموم وخصوص دونوں آسکتے ہیں۔ اور اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ امام کے پیچھے جب کسی نے اقتدا اختیار کرلی ہو تو مقتدی کو جدا اور الگ قرأت کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ امام کا پڑھنا گویا مقتدی کا پڑھنا ہے

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ہم نے شریکؒ کو صرف متابع کے طور پر پیش کیا ہے۔ استدلال امام سفیان ثوریؒ سے ہے جو ثقہ اور ثبت تھے۔ (ترجمان الحدیث ص ۲۱ ماہ جولائی ۱۹۷۳ء میں تضدوات کے چند نمونے کا عنوان قائم کرکے اور ہماری اس عبارت سے لفظ متابع ہضم کرکے جو اعتراض کیا ہے، علمی طور پر خالص بد دیانتی ہے۔ ہم نے سفیان ثوریؒ کو ان کا متابع نہیں بتایا بلکہ ان کو سفیان ثوریؒ کا متابع کہا ہے مگر مضمون نگار نے ص ۲۲ میں دجل کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں جبکہ سفیان ثوریؒ اس کا متابع موجود ہے۔

[۱] امام حمیدؒ ان کو ثقات میں شمار کرتے ہیں۔ امام ابن معینؒ اور یعقوبؒ بن سفیانؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۵۲) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ عابد لکھتے ہیں۔ (تقریب ۳۶۷) امام بخاریؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ۲ ص ۷۳۳)

[۲] یہ حضرت ام المومنین میمونہؓ کے بھانجے تھے (بخاری جلد ۱ ص ۴۷ و ۷۴) حافظ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان کا تولد ہوا تھا۔ امام عجلیؒ، خطیبؒ، ابوزرعہ، نسائی، ابن سعدؒ اور واقدیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۲)

[۳] یہ روایت شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳ آثار السنن جلد ۱ ص ۸۷ روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۴، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۲۸، ابکار المنن ص ۱۹۰ فتح الملہم جلد ۲ ص ۴۳، حاشیہ طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۸، اعلاء السنن جلد ۴ ص ۹۳ اور بغیۃ الالمعی جلد ۲ ص ۸ وغیرہ کتابوں میں اجمالاً وتفصیلاً نقل کی گئی ہے۔

اور ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت میں فریق ثانی کا کلی اتفاق ہے کہ اس میں امام کی قرأت مقتدی کی قرأت سمجھی جائے گی اور مقتدی پر الگ قرأت لازم نہیں ہے۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ اور باقی سب راوی ثقہ اور ثبت ہیں۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور مبارکپوری صاحبؒ نے اپنی افتاد طبع کے تحت گو آئیں بائیں شائیں سے کام لینے اور گلو خلاصی کی ناکام کوشش کی ہے، لیکن اتنی بات تسلیم کیے بغیر وہ کوئی مفر نہیں پاتے کہ بظاہر صحیحؔ ہے کیونکہ موصول بھی ہے۔ اس کے تمام روات بالاتفاق ثقہ بھی ہیں اور کوئی علت قادحہ بھی بظاہر اس میں نہیں پائی جاتی ...... الخ (بلفظہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۴۸)

انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ جب تمام راوی ثقہ ہیں اور سند بھی موصول ہے۔ اور بظاہر کوئی علت قادحہ بھی اس میں پائی نہیں جاتی۔ تو مبارکپوری صاحب جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے۔ اور یا صحیح تسلیم کرتے ہوئے۔ اس کا کوئی معقول جواب دیتے۔ مگر چونکہ اپنی رائے کو ترک نہیں کرنا۔ اس لیے ان حضرات کی طرف سے صحیح حدیث کو معلول ٹھہرانے کی کوشش اور سعی کی گئی ہے۔ مبارک پوری صاحبؒ نے جو کچھ کہا اس کو آپ پڑھ لیں اور ساتھ ساتھ جواب بھی ملاحظہ کرتے جائیں۔

پہلا اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں (اور یہی اعتراض خیر الکلام از ص ۴۷۱ تا ۴۷۵ میں پانی کی طرح بلویا گیا ہے) کہ یہ روایت مرفوع نہیں ہے اور اس کی دلیلیں یہ ہیں:

(۱) اگر یہ طریق مرفوع ہوتا۔ تو محدثین کرامؒ، امام سفیان ثوریؒ، شریکؒ اور جریرؒ کو امام ابوحنیفہؒ کا مخالف ہرگز نہ بتاتے۔

(۲) اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو امام طحاویؒ، علامہ ماردینیؒ، حافظ زیلعیؒ اور محدث عینیؒ وغیرہ محل احتجاج میں ضرور اس کو پیش کرتے۔

(۳) حافظ ابن ہمامؒ نے مسند احمدؒ بن منیعؒ کے جس نسخہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ اس میں کاتب کی غلطی کی وجہ سے عبداللہؓ بن شدادؓ کے بعد عن جابرؓ کا جملہ زیادہ ہو گیا ہے۔ اور

---

لہ نواب صدیق حسن خان صاحبؒ مسند احمد بن منیع کے طریق سے دو سندوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ والاسناد الاول صحیح علی شرط الشیخین والثانی علی شرط مسلم اھ (ہدایۃ السائل ص ۲۰۲)

حقیقت میں یہ روایت مرسل ہے۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۴۸ وابکار المنن ص ۱۶۱)

جواب: مبارکپوری صاحبؒ کا یہ دعویٰ بمعہ پیش کردہ دلائل کے از سرتاپا لغو اور بیہودہ ہے۔ یہ روایت مرفوع ہے مرسل نہیں ہے، ترتیب وار ہر شق کا جواب ملاحظہ کیجئے:

پہلی شق کا جواب: یہ دعویٰ کرنا کہ جریرؒ، سفیانؒ اور شریکؒ وغیرہ امام ابوحنیفہؒ کی مخالفت کرتے ہوئے اس کو مرسل روایت کرتے ہیں باطل ہے، چنانچہ علامہ آلوسیؒ ان کی روایت کو کئی سندات کے ساتھ نقل کر کے لکھتے ہیں۔ (علامہ آلوسیؒ ثقہ ناقل ہیں ان کو متاخر آدمی کہکر ٹال دینا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۷۳ میں کیا ہے نرے تعصب پر مبنی ہے اور اہلِ علم کی شان کے لائق نہیں ہے)

فھولاء سفیانؒ وشریکؒ وجریرؒ وابو الزبیرؒ رفعوہ بالطرق الصحیحۃ فبطل عدھم فیمن لم یرفعہ۔ (روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۲)

سو یہ امام مثلاً سفیان ثوریؒ، شریکؒ، جریرؒ اور ابو الزبیرؒ (وغیرہ) صحیح اسانید کے ساتھ اس روایت کو مرفوع نقل کرتے ہیں جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اس کو مرفوع روایت نہیں کیا۔ ان کا قول سراسر باطل ہے۔

اور اسی طرح فتح القدیر جلد ا ص ۲۳۹ میں بھی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام بیہقیؒ دارقطنیؒ اور ابن عدیؒ وغیرہ کا یہ دعویٰ کہ اس روایت کو تنہا حضرت امام ابوحنیفہؒ ہی مرفوع بیان کرتے ہیں اور اس رفع میں ان کا اور کوئی ساتھی نہیں محض باطل ہے اور امام ابوحنیفہؒ سے اس روایت کو نقل کرنے والے بھی اس کو مرفوع ہی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں:

ھذا حدیث رواہ جماعۃ من اصحاب ابی حنیفۃؒ موصولاً وخالفھم عبد اللہؒ بن المبارکؒ الامام فرواہ عنہ مرسلاً۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۰۱)

امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب اور تلامذہ میں سے ایک بہت بڑی جماعت نے اس کو مرفوع اور موصول بیان کیا ہے لیکن امام عبد اللہؒ بن مبارکؒ اس کو مرسل روایت کرتے ہیں۔

اسحٰق ازرقؒ، ابو یوسفؒ اور یونسؒ بن بکیرؒ وغیرہ کی روایتیں دارقطنی جلد ا ص ۱۲۲ اور ص ۱۲۳ میں مذکور ہیں اور محمد بن الحسنؒ، محمد بن الفضلؒ البلخیؒ، سلیم بن مسلمؒ، مکی بن ابراہیمؒ، علی بن یزید الصدائیؒ

اور مروانؒ بن شجاعؒ کی روایتیں عقود الجواہر المنیفہ فی ادلۃ الاحکام لمذہب ابی حنیفہؒ میں مذکور ہیں۔ (کذا فی الدلیل المبین ص ۹۵ لمولانا المحدث محمد حسن فیض پوریؒ) لہٰذا اسحاق ارزقؒ کی روایت کو شاذ، غلط اور ضعیف قرار دینا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۴۷۲ و ۴۷۳) محض بے بنیاد امر اور نرا باطل دعویٰ ہے۔ علاوہ ازیں مؤلف خیر الکلام خود ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ جب ان کا ثقہ ہونا ثابت ہوا تو اس صورت میں ان کا تفرد کوئی مضر نہیں ہوگا..... الخ ص ۲۸۸ اور اسحٰق ارزقؒ تو چوٹی کے ثقہ اور ثبت ہیں۔ پھر تفرد کا ناکام بہانہ کون سنتا ہے اور کون ان کی اس صحیح زیادت کو شاذ مانتا ہے؟

اور دوسرے مقام پر امام بیہقیؒ لکھتے ہیں:

وھکذا رواہ جماعۃ عن ابی حنیفۃؒ موصولاً۔ (سنن الکبریٰ ج ۲ ص ۱۵۹)

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ سے ایک بڑی تعداد نے اس کو مرفوع اور موصول بیان کیا ہے۔

اور نواب صدیق حسن خانؒ لکھتے ہیں کہ

وبالجملہ ایں حدیث بطرق متعددہ ارسالاً و رفعاً مروی شدہ ودروی دلالت است برآنکہ مؤتم در پس امام فاتحہ نخواند زیرا کہ قرأتِ امام قرأتِ مؤتم است اھ (ہدایت السائل ص ۲۰)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث متعدد طرق سے مرسلاً اور مرفوعاً مروی ہے اور اس میں دلیل ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے کیونکہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے ... الخ

پہلے اس کی تحقیق گزر چکی ہے کہ ثقہ راوی کی زیادت بالاتفاق مقبول ہوتی ہے۔ خواہ وہ زیادت متنِ حدیث میں ہو۔ خواہ سند میں اور جب حدیث کے مرفوع اور مرسل ہونے کا جھگڑا ہو تو وہ حدیث جمہور علماء کے نزدیک مرفوع ہی سمجھی جائے گی۔ نیز مثبت کو نافی پر ترجیح ہوگی۔ اگر بالفرض اس زیادت کو تنہا حضرت امام ابو حنیفہؒ ہی بیان فرماتے۔ تب بھی حضرات محدثین کرامؒ کے طے شدہ اصول اور ضوابط کے تحت یہ روایت مرفوع اور موصول ہی ہوتی حالانکہ جریرؒ، سفیانؒ، شریکؒ اور ابو الزبیرؒ وغیرہ سب ثقہ راوی اس کو مرفوع اور موصول بیان کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ سے بھی ایک بڑی جماعت اس کو مرفوع اور موصول ہی روایت کرتی ہے۔ امام ابن مبارکؒ چونکہ اس کو مرسل بیان کرتے ہیں اور دوسرے اس کو مرفوع

بیان کرتے ہیں۔ اس لیے قاعدہ کے مطابق مرفوع اور متصل ہی کو ترجیح ہے۔ نہ کہ اس کے مرسل ہونے کو علاوہ ازیں خود امام ابن مبارکؒ کا بیان ہے کہ جب امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کسی بات پر متفق ہو جائیں تو میرا قول بھی وہی ہوگا (تبییض الصحیفہ ص۱۷) اور امام ابو حنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ دونوں اس روایت کو مرفوع اور موصول بیان کرتے ہیں اور امام حاکمؒ علامہ شمس الدین ابن قدامہؒ، علامہ ماردینیؒ، حافظ ابن ہمامؒ، ملا علی القاریؒ اور علامہ آلوسیؒ وغیرہ اس روایت کو مرفوع ہی نقل کرتے ہیں۔ اور یہ مثبت بھی ہیں اور مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں:

فقول ھؤلاء العارفین مقدم علیٰ من لم یعرف۔ (ابکار المنن ص۱۳۵) سو ان جاننے والوں کی بات نہ جاننے والوں کی بات سے بہرحال مقدم ہے۔

اس لیے مبارکپوری صاحبؒ کے اعتراض کی یہ شق قطعاً باطل اور مردود ہے اور اسی طرح مؤلف خیر الکلام (ص۴۷۳) کا اس کے جواب سے عاجز ہو کر اس کو مصادرہ علی المطلوب کہہ کر گلو خلاصی کرنا بے معنی بات ہے کیونکہ دعوےٰ یہ ہے کہ عن جابرؓ کا جملہ مسند احمدؒ بن منیعؒ میں مذکور ہے اور دلیل یہ ہے کہ یہ مسلّم ثقات اس کو اسی طرح نقل کرتے ہیں۔ اگر مؤلف مذکور کا یہ خانہ ساز مصادرہ مضر ہے تو تمام کتبِ حدیث میں یہ جاری ہے کما لا یخفیٰ تو پھر کوئی روایت صحیح نہیں ہو سکتی بھلا ایسے ناکام بہانوں سے صحیح حدیث ضعیف قرار دی جا سکتی ہے؟ معاذ اللہ تعالیٰ۔

**دوسری شق کا جواب:** جمہور اہلِ اسلام کے پاس قرآن کریم کی آیت اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ بن مالک وغیرہ کی صحیح اور مرفوع حدیثیں موجود ہیں۔ لہٰذا اگر امام طحاویؒ وغیرہ ائمہ نے حضرت جابرؓ کی یہ روایت اپنے استدلال میں پیش نہیں کی۔ تو کیا بغیر اس روایت کے ان کی ضرورت اور حاجت پوری نہیں ہو سکتی تھی؟ اور کیا ان کے دعوے کی صرف یہی ایک حدیث دلیل رہ گئی تھی کہ بغیر اس کے بیان کرنے کے ان کا دعویٰ ناکام اور تشنہ رہتا؟ ہاں جہاں اور حدیثیں موجود ہیں۔ وہاں ان کی دلیل ایک یہ حدیث بھی ہے اور فرض کر لیجیے کہ ان حضرات کو مسند احمدؒ بن منیعؒ کی سند سے اس روایت کا علم ہی نہ تھا تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ سرے سے یہ حدیث ہی نہ ہو؟ کسی حدیث کا کسی موقع پر بیان نہ کرنا اس کے عدم کی دلیل کیسے بن گئی؟

علاوہ ازیں امام ابن قدامہؒ ماردینیؒ، ابن ہمامؒ، مُلا علی قاریؒ اور آلوسیؒ وغیرہ باقاعدہ اس روایت سے استدلال کرتے ہیں اور اس کو مرفوع اور موصول ہی سمجھتے ہیں اور اسی طرح اس کو نقل بھی کرتے ہیں۔

مؤلف خیر الکلام ص ۲۷۳ میں (وبنحوہ فی ص ۲۳۸) لکھتے ہیں کہ باقی رہا ارسال اور وصل کا اختلاف اس کے متعلق بیان ہو چکا ہے کہ راوی ایسے مختلف حالات کی بنا پر کبھی متصل بیان کر دیتے ہیں اور کبھی مرسل۔ یہ اختلاف کوئی مضر نہیں۔ ثقہ کی زیادتی اس جگہ قابل قبول ہے۔ انتہٰی اور یہی ہم کہتے ہیں۔

تیسری شق کا جواب: اگر مسند احمدؒ بن منیعؒ کے نسخہ میں جو حضرات محدثین کرامؒ کے نزدیک متداول کتاب تھی۔ کاتب نے عن جابرؓ کے الفاظ زیادہ کر دیے تھے تو نہ معلوم بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد اور دیگر حدیث کی کتابوں میں کاتبوں نے کیا کچھ شگوفے کھلائے ہوں گے؟ اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے حذف و اضافہ اور قطع و برید کر کے اصل مضمون کو کیا سے کیا کر دیا ہو گا؟ پھر حدیث کی کتابوں پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ اور شاید اسی بداعتقادی کی وجہ سے بیشتر غیر مقلد حضرات (مثلاً عبداللہ چکڑالوی، اسلم جیراجپوری، غلام احمد پرویز، ڈاکٹر احمدالدین وغیرہ) انکار حدیث کے فتنہ میں گرفتار اور مبتلا ہوتے ہیں۔ اور شاید تصحیح حدیث کی یہ شرط ہو کہ اگر مبارکپوری صاحبؒ اور ان کی جماعت کسی حدیث کو صحیح قرار دیں تو صحیح ہو گی۔ ورنہ اس کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

محترم جب سند کے تمام راوی بالاتفاق ثقہ اور ثبت ہیں۔ اور بظاہر اس میں کوئی علت قادحہ بھی نہیں اور موصول بھی ہے تو بلاوجہ محض ہوائے نفسانی کے لیے کاتب بیچارے پر کیوں ایسا سنگین الزام عائد کیا جاتا ہے؟ اور کیوں طے شدہ قواعد اور اصول سے انحراف کیا جاتا ہے؟ فتح الباری کے حوالہ سے

---

[۱] مثلاً یہ کہ سند کے جملہ روات بالاتفاق ثقہ ہیں۔ سند موصول ہے۔ بظاہر اس میں کوئی علت قادحہ بھی نہیں پائی جاتی۔ ثقہ کی زیادت مقبول ہوتی ہے۔ موصول اور مرسل کے جھگڑے میں حدیث مرفوع ہی سمجھی جائیگی۔ مثبت کو نافی پر ترجیح ہوتی ہے، عدم علم عدم شے کی دلیل نہیں ہوتی۔ عارف کے قول کو جاہل کے قول پر ترجیح ہوتی ہے۔ اسقاط اور ادراج محض احتمال سے ثابت نہیں ہو سکتا وغیرہ وغیرہ یہ تمام اصول ایسے ہیں جو خود مبارکپوری صاحبؒ کے نزدیک بھی مسلّم ہیں۔ مگر افسوس کہ عملی طور پر وہ سب سے گریز کرتے ہیں۔ فوا اسفا۔

یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ ادراج و اسقاط محض احتمال سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ ادراج مجرد دعوے سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ (نیل الاوطار جلد ۱ ص ۳۵۱)

حضرات! یہ ہے مبارکپوری صاحب کا انصاف اور دیانت؟ اس سے بڑھ کر تعصب اور کیا ہو سکتا ہے؟

بصورت مرسل بھی یہ روایت حجت ہے:

اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ روایت مرسل ہے، تب بھی جمہور کا احتجاج اس روایت سے صحیح ہو گا۔ مرسل کی حجیت کے بارے میں ہم پہلے کچھ بحث باحوالہ کر چکے ہیں۔ امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ بعض اہلِ علم کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ (کتاب العلل جلد ۲ ص ۲۳۹) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ، ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ اور اکثر فقہائے کرامؒ کا یہ مسلک ہے کہ حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ (مقدمہ نووی ص ۱۷) علامہ جزائریؒ کا بیان ہے کہ علماءِ سابقین میں امام سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ وغیرہ مرسل حدیث کو بھی حجت سمجھتے تھے۔ (توجیہ النظر ص ۲۴۵ و الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۱۰۹ نواب صاحبؒ) اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں لیکن اعلال بارسال موجب ترک او نیست، زیرا کہ قبول مراسیل مذہب جمعے از فحول علماء اصول است۔ (دلیل الطالب ص ۳۲۵) اور ایسے مرسل کے حجت ہونے میں جس کی تائید کسی اور حدیث سے ہوتی ہو۔ گو وہ مرسل ہی کیوں نہ ہو۔ سب کا اتفاق ہے۔ چنانچہ امام بیہقیؒ، امام نوویؒ، حافظ ابن القیمؒ اور مبارکپوری صاحبؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ (کتاب القراۃ ص ۱۴۳، مقدمہ نووی ص ۱۷، زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۰۵، ابکار المنن ص ۱۳۸) اور مبارکپوری صاحبؒ ایک مقام میں لکھتے ہیں اور مرسل معتضد کے حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۱) اسی قاعدہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ آلوسیؒ یہ جواب دیتے ہیں کہ اگر حضرت جابرؓ کی یہ روایت مرسل بھی ہو تب بھی مرسل حدیث اکثر ائمہؒ کے نزدیک حجت ہے تو ہمیں عمل کے لیے یہی کافی اور بس ہے۔ (روح المعانی جلد ۱ ص ۹۱)

یہ حکم تو عام مراسیل کا تھا۔ لیکن اگر کسی دلیل سے حضرت عبداللہؓ بن شدادؓ کا صحابی ہونا ثابت ہو جائے تو ان کی روایت مراسیل صحابہؓ کے قسم کی ہو گی اور حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل

بالاتفاق قابل قبول ہیں۔ بعض محققین کا بیان ہے کہ عبداللہؓ بن شدادؓ صحابی تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو کتابیں صرف حضرات صحابہ کرامؓ کے حالات اور سوانح بیان کرنے کے لیے مخصوص ہیں۔ ان کا ذکر بھی ان کتابوں میں آتا ہے۔ (فصل الخطاب ص ۹۷) حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (جلد ا ص ۳۹۹) میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۲ اور تقریب (ص ۲۰۲) میں درج ہے۔ ولد علی عھد رسول اللہ علیہ وسلم کہ حضرت عبداللہؓ بن شدادؓ کی ولادت آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے عہد اور زمانہ میں ہوئی تھی۔ اور اسی طرح اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہؓ اور تجرید اسماء الصحابہؓ میں ان کا ذکر ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں عبد اللہؓ بن شدادؓ من صغار الصحابۃ۔ (فتح الباری جلد ۳ ص ۲۰۰، ۴ ص ۲۵۶) کہ عبداللہؓ بن شدادؓ نو عمر صحابہؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ جو صحابی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں کافی عرصہ رہا ہو یا جس نے آپ کی معیت میں دشمنانِ اسلام سے جہاد کیا ہو یا جس نے آپ کے جھنڈے کے نیچے شہادت کا رتبہ پایا ہو۔ ایسے صحابی کا مرتبہ یقیناً اس صحابی سے زیادہ ہے جس نے آپ کی خدمت اقدس میں کافی وقت نہ گذارا ہو۔ یا جس نے آپ کی معیت میں دشمنانِ اسلام سے جنگ نہ کی ہو، یا جس کو آپ کی معیت میں شہادت نصیب نہ ہوئی ہو، یا جس نے آپ سے معمولی گفت گو کی ہو یا تھوڑی مسافت آپکے ساتھ طے کی ہو۔ پھر آگے لکھتے ہیں:

اور آہ علی بعد او حال الطفولیۃ وان کان شرف الصحبۃ حاصلاً للجمیع ومن لیس لہٗ منھم سماع منہ فحدیثہٗ مرسل من حیث الروایۃ وھم مع ذلک معدودون فی الصحابۃ لما نالوہ من شرف الرؤیۃ انتہیٰ۔

(شرح نخبۃ الفکر ص ۸۳)

اور اسی طرح ان کا درجہ اس صحابی سے زیادہ ہوگا جس نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دور سے دیکھا ہو یا جس نے بچپن میں آپؐ کو دیکھا ہو۔ اگرچہ صحابی ہونے کا شرف ان سب کو حاصل ہوگا۔ ان میں سے جس نے براہ راست آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سماعت نہیں کی۔ اس کی حدیث مرسل ہوگی لیکن شرفِ صحبت کی بنا پر ان کا شمار بھی بہر صورت حضرات صحابہ کرامؓ ہی میں کیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا دینی خدمات انجام دینے کی وجہ سے آپس میں یقیناً بہت تفاوت ہے، لیکن مع ہذا جنھوں نے عہد طفولیت اور بچپن کے زمانہ میں اپنی آنکھوں سے جناب رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ ان کا شمار بھی صحابہؓ میں ہے اور اور وہ صغار صحابہؓ میں شامل ہیں اور چونکہ ان کی روایتیں براہِ راست جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نہیں ہوتیں بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ سے ہوتی ہیں۔ اس لیے بعض محدثین کرامؒ نے ایسے صغار صحابہؓ کو کبار تابعینؒ میں شمار کر دیا ہے۔ وَلِکُلٍّ وِّجْهَةٌ اور ایسے صغار صحابہؓ کی روایات مراسیل ہوں گی۔ مؤلف خیر الکلام صـ۲۷۸ میں لکھتے ہیں کہ صحابہؓ کی مرسل اگرچہ بالاتفاق حجت ہے، مگر اس جگہ صحابہؓ سے وہی لوگ مراد ہیں جنھوں نے سن تمیز میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا.... الخ مگر یہ محض فرار کا ایک ناکام بہانہ ہے امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جمہور محدثینؒ کے نزدیک پانچ سال کا بچہ سن تمیز کو پہنچ جاتا ہے لیکن صحیح یہ ہے۔ (جو عبد اللہؓ بن الزبیرؓ کے واقع سے ظاہر ہے) کہ چار سال سے کم عمر میں بھی تمیز حاصل ہو جاتی ہے۔ (شرح مسلم جلد ۲ صـ۲۸۱) اور حضرت عبد اللہؓ بن شدادؓ جو صغارؓ صحابہ میں شمار ہوتے ہیں تین چار سال سے کیا کم ہوں گے جب کہ انھوں نے آپ کی زیارت کی ہوگی۔

مراسیل حضرات صحابہ کرامؓ:

مراسیل صحابہؓ کے بارے میں تقریباً تمام علماء کرام متفق ہیں کہ وہ حجت ہیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مراسیل سے حجت صحیح نہیں ہے مگر حضرات صحابہ کرامؓ اور سعیدؒ بن المسیبؒ کے مراسیل حجت ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم صـ۳۴ عن الوجیز لابن برہانؒ) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل حجت ہیں۔ (شرح مسلم جلد ص ۲۸۴ و مقدمہ صـ۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اور دیگر تمام علماء کے نزدیک صحابی کا مرسل حجت ہے۔ (شرح مہذب جلد ۴ صـ۴۸۱) اور علامہ سیوطیؒ تدریب الراوی ص ۶۶ میں تصریح کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل حجت ہیں اور التوضیح (نول کشور ص ۴۶۸) میں لکھا ہے فمرسل الصحابی مقبول بالاجماع کہ صحابی کا مرسل اجماعاً مقبول ہے۔ علامہ نیمویؒ لکھتے ہیں کہ صحابی کا مرسل حجت ہے (تعلیق الحسن جلد ۲ صـ۱۱) اور قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل حدیث مسند کے حکم میں ہیں —

(نیل الاوطار جلد ا ص ۳۴۱) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ و مراسیل صحابہؓ حجت است (دلیل الطالب ص ۳۸) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ مرسل صحابی محکوم بصحت است بر مذہب صحیح۔ ایضاً ص ۸۹۶) اگر فریقِ ثانی اس قاعدہ کو تسلیم نہیں کرتا تو براہ کرم دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی مرسل روایات عموماً اور حضرت عائشہؓ کی بخاری شریف کی پہلی روایت (جس میں بدء الوحی کا ذکر ہے اور جو ان کی ولادت سے بھی تقریباً پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے) خصوصاً اور نیز حضرت ابن عمرؓ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ کی روایتیں جن میں ابتدائے اسلام کے احکام ہیں۔ کتابوں سے خارج کر دیں اور اگر حضرت عبداللہؓ بن شدادؓ کو تابعی ہی تسلیم کر لیا جیسا کہ تقریب ص ۲۰۷ میں ہے کہ وہ کبار تابعینؒ اور ثقات وفقہائیں تھے۔ تب بھی کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ

وکذلک مراسیل کبار التابعین اذا انضم الیہا ما یؤکدھا من عدالۃ رجال من ارسل منھم حدیثہ وشھرتھم واجتنابہ روایۃ الضعفاء والمجھولین۔ (کتاب القرآۃ ص ۱۴۳)

اور اسی طرح (جس طرح حضرات صحابہؓ کے مراسیل حجت ہیں) کبار تابعینؒ کے مراسیل بھی حجت ہیں جب کہ ان کے رواۃ میں عدالت اور شہرت موجود ہو اور کمزور اور مجہول رواۃ کی روایت سے اجتناب وغیرہ کی صفات شامل ہوں۔

اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص غور و فکر اور قِلّتِ غفلت سے متصف ہو کر علمی دلائل پر نگاہ ڈالیگا تو وہ کبار تابعینؒ کے مراسیل کے علاوہ دیگر مراسیل سے منقبض ہو گا جس کے دلائل ظاہر ہیں۔ (الرسالۃ ص ۶۴ جو کتاب الام کی ساتویں جلد کے آخر منضم ہے)

الحاصل حضرت جابرؓ کی یہ روایت صحیح اور مرفوع ہے، اس کو مرسل بتلانے کی تمام دلیلیں بیکار اور لایعنی ہیں اور اگر بالفرض مرسل بھی ہو تب بھی جمہور کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ اور خاص طور پر کبار تابعینؒ کے مراسیل تو امام شافعیؒ اور امام بیہقیؒ کے نزدیک بھی حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل کی طرح حجت ہیں اور حضرت عبداللہؓ بن شدادؓ تو صغار صحابہؓ میں تھے جن کے مراسیل بالاتفاق حجت ہیں۔ خلاصہ امر یہ ہے کہ حضرات محدثین کرامؒ کے نزدیک کسی روایت کے صحیح اور حجت ہونے کے لیے کوئی قاعدہ اور ضابطہ ایسا نہیں ہے جو سو فیصدی اس روایت میں

نہ پایا جاتا ہو اگر باوجود اس کے یہ روایت مرفوع اور حجت نہیں ہے تو عالمِ اسباب میں صحتِ حدیث کے لیے کوئی اور معیار موجود نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض: مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجرؒ تحریر فرماتے ہیں کہ

حدیث من کان له امام فقراءة الامام له قراءة من حدیث جابرؓ وله طرق عن جماعة من الصحابةؓ وکلها معلولة .... انتهی۔ (تلخیص الحبیر جلد ۱ ص ۸۵)

من کان له امام فقراءة الامام له قراءة کے الفاظ سے حدیث حضرت جابرؓ سے مروی ہے (جس کی متعدد اسانید بالکل صحیح ہیں) اور یہ حدیث حضرت جابرؓ کے علاوہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی ایک کافی جماعت سے بھی مروی ہے، لیکن وہ سب طرق معلول ہیں۔

مبارکپوری صاحب نے یہ عبارت تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۳ اور ابکار المنن ص ۱۵۶ میں نقل کی ہے اور اس پر اعتراض کی بنیاد رکھی ہے۔

جواب: یہ روایت متعدد اسانید کے ساتھ حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔ امام حاکمؒ نے علم اصول حدیث کی مشہور کتاب معرفت علوم الحدیث میں تینتیسویں [۳۳] نوع اس موضوع پر قائم کی ہے۔ هذا النوع من هذا العلم معرفة المشهور من الاحادیث المرویة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ..... الخ پھر ان مشہور احادیث کے بعد یہ حدیث بھی بیان کی ہے ومنهم من کان له امام فقراءة الامام له قراءة اور دیگر متعدد احادیث بھی ذکر کی ہیں پھر فرماتے ہیں فکل هذه الاحادیث مشهورة باسانیدها وطرقها.... الخ (معرفت علوم الحدیث طبع قاہرہ ص ۹۶) اس سے بھی ثابت ہوا کہ من کان له امام فقراءة الامام له قراءة کی حدیث نہ صرف یہ کہ مرفوع اور صحیح ہے بلکہ مشہور حدیث ہے محض تعصب مذہبی میں آ کر اس کا انکار کرنا کس قدر ناانصافی ہے اور ایسے ٹھوس ثبوت اور علم ہی کی وجہ سے ہم حافظ ابن حجرؒ کی اس بات کو رد کرتے ہیں اور کم و بیش چالیس [۴۰] سندیں اس روایت کی تو اس ناکارہ اور کوتاہ علم کو بھی معلوم ہیں۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ اور ان میں ستائیس کے قریب فی الجملہ معلول ہیں ایک صحیح اور مرفوع سند آپ سن اور پڑھ چکے ہیں اور عنقریب چند ایک دیگر صحیح اسانید بمع توثیق رواۃ ہم آپ سے عرض کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔ باقی حافظ ابن حجرؒ کا یہ دعویٰ نہایت مجمل اور بے دلیل ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کی تصحیح یا تضعیف

بلا دلیل کون سنتا ہے؟ بعض علماء کرام نے حافظ صاحب موصوف سے انتہائی عقیدت اور حسنِ ظنی کرتے ہوئے اس کی توجیہہ یہ بیان کی ہے کہ حافظ صاحب موصوفؒ کی عبارت میں دو چیزیں ہیں:

(۱) کہ یہ روایت حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔

(۲) کہ یہ روایت حضرت جابرؓ کے علاوہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے بھی متعدد طرق کے ساتھ مروی ہے اور کلھا معلولۃ میں ھا کی ضمیر ان طرق کی طرف راجع ہے جو دیگر حضرات صحابہؓ کرام سے مروی ہیں اور ان کی عبارت لکنّہ حدیث ضعیف عند الحافظ سے بھی یہی طُرق مرادُ ہیں نہ کہ حضرت جابرؓ کی حدیث اور حضرت جابرؓ کی روایت مسکوت عنہا ہے اور یہ حافظ صاحبؒ کی عبارت کلھا معلولہ کی زد میں نہیں آتی اور گویا حافظ صاحب موصوفؒ نے ایک لطیف حیلہ کرتے ہوئے گول مول حکم صادر کر کے حضرت جابرؓ کی روایت سے گلو خلاصی کرنے کی کوشش فرمائی ہے، مگر ناکام۔ اگر حافظ صاحب موصوفؒ کی مراد یہ ہو کہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے من وعن روایت کے ایسے ہی الفاظ مروی ہیں جو حضرت جابرؓ سے مروی ہیں اور وہ طرق سب معلول ہیں۔ تو شاید بظاہر یہ صحیح ہو اور اس صورت میں اس عبارت کی اس سے بہتر توجیہہ اور نہیں ہو سکتی اور اگر مراد یہ ہو کہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے جو روایتیں مروی ہیں گو ان کی روایت کے الفاظ تو یہ نہیں لیکن ان کا مفہوم اور مضمون اس سے ملتا جلتا ہے اور وہ تمام طرق معلول ہیں تو یہ قطعاً باطل ہے۔ بطور نمونہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی بعض صحیح روایتیں نقل کر کے ان کے اس دعویٰ کے بطلان کو آشکارا کیا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اس لیے آپ ان صحیح روایات کو دیکھ کر یہ کہتے ہوئے حافظ صاحبؒ کے اُدھار سے نظر پھیر لیجئے اور یہ نقد وصول کر لیجئے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ یاخُذْ مَاصَفَا وَدَعْ مَاکَدَرَ۔

تیسرا اعتراض: امام بیہقیؒ اور مولانا مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کی اس حدیث میں قرأت سے مازاد علی الفاتحہ کی قرأت مراد ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ظہر یا عصر کی نماز میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى کی قرأت کی تھی تو آپؐ نے اس موقع پر مقتدیوں کو قرأت سے منع کیا تھا۔ (کتاب القراۃ صفحہ ۱۲۶ و تحقیق الکلام جلد ۲ صفحہ ۱۹۲)

**جواب**: یہ روایت حضرت جابر رضؓ سے مروی ہے اور ان کی روایت میں قرأت کو مَازَادَ عَلَی الْفَاتِحَۃ کی قرأت پر حمل کرنا توجیہ القول بمالا یرضی بہ قائلہ کا ارتکاب کرنا ہے کیونکہ حضرت جابر رضؓ راوی حدیث اس قرأت سے صرف سورۂ فاتحہ کی قرأت مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ارشاد فرماتے ہیں[1] کہ

مَنْ صَلّٰی رَکْعَۃً لَمْ یَقْرَأْ فِیْھَا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ فَلَمْ یُصَلِّ اِلَّا وَرَاءَ الْاِمَامِ (موطا امام مالک ص ۲۸ و ترمذی جلد ۱ ص ۴۲) جس کسی نے نماز کی ایک رکعت بھی ایسی پڑھی جس میں اس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ادا نہ ہوگی مگر ہاں امام کے پیچھے۔

اور یہ بات باقرار مبارکپوری صاحبؒ اپنے مقام پر آئے گی کہ راوی حدیث (خصوصاً جب کہ صحابی ہو) اپنی مروی حدیث کی مُراد کو دوسروں سے زیادہ بہتر جانتا ہے لہٰذا حضرت جابرؓ کی اس صحیح روایت میں قرأت سے مازاد علی الفاتحہ کی قرأت مراد لینا قطعاً اور یقیناً باطل ہے، یہ یاد رہے کہ یہ روایت حضرت جابرؓ سے مرفوعاً بھی مروی ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ در حدیث جابرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم آمدہ کہ فرمودہ من صلّٰی رکعۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام رواہ الطحاوی فی معانی الآثار بسند متصل مرفوع ورواہ الترمذی موقوفاً وقال حسن صحیح ... اھ (ھدایۃ السائل ص ۲۰۴) نواب صاحبؒ نے جو کچھ کہا بالکل صحیح کہا ہے کیونکہ یہ روایت طحاوی جلد ۱ ص ۱۰۷ میں متصل اور مرفوع سند سے مروی ہے۔ سند یوں ہے بحرؒ بن نصرؒ (امام ابو حاتم رحؒ فرماتے ہیں کہ وہ صدوق اور ثقہ تھے۔ امام ابن خزیمہؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے مسلمہؒ بن قاسمؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ فاضل اور مشہور تھے۔ امانی الاحبار ج ۱ ص ۳۷) قال حدثنا یحییٰؒ بن سلامؒ (امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ وہ کثیر الوہم ہیں اور اس حدیث کے مرفوع بیان کرنے میں ان کا وہم ہے۔ (محصلہ کتاب القرأۃ ص ۱۱۰) بے شک ان پر بعض نے جرح کی ہے۔ امام دارقطنیؒ ان کی

---

[1] امام مالکؒ ابو نعیم وہبؒ بن کیسانؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جابرؓ بن عبد اللہ رضؓ سے سنا۔ انہوں نے یہ ارشاد فرمایا ... الخ حضرت امام مالکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے اور حضرت جابرؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ ابو نعیم وہبؒ بن کیسانؒ کا ترجمہ سن لیجئے۔ امام نسائیؒ اور ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور محدث کہتے ہیں۔ عجلیؒ ان کو ثقہ اور تابعی کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور امام احمدؒ بھی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۱۶۶) امام ترمذیؒ لکھتے ہیں ھذا حدیث حسن صحیح (ا ص ۴۲)

تضعیف کرتے ہیں اور امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ باوجود ان کے ضعیف ہونے کے ان کی حدیث لکھی جا سکتی ہے امام ابن حبان رحان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں ربما اخطأ امام ابو زرعہؒ فرماتے ہیں لا بأس به ربما یهم امام ابو حاتم رحان کو شیخ اور صدوق کہتے ہیں امام ابو العربؒ ان کو من الحفاظ اور من خیار خلق اللہ کہتے ہیں لسان المیزان ج ۶ ص ۲۶۰ و ص ۲۶۱ الغرض ان کی یہ حدیث حسن درجہ سے کسی طرح کم نہیں ہے قال حدثنا مالکؒ عن وهبؒ بن کیسانؒ عن جابرؓ بن عبد اللہؓ عن النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ـــ (الحدیث) لہٰذا مؤلف خیر الکلام کا (ص ۴۹۳ میں) یہ مطالبہ بھی پورا ہو گیا کہ حدیث قرأۃ الامام...الخ بصورت مرفوع زیر بحث ہے غرضیکہ یہ ارشاد مطلق اور صریح ہے اس کو محض لفظوں کی کرامت سے مقید کرنا اور مجمل قرار دینا جیسا کہ مؤلف مذکور نے ص ۵۱۹ میں کیا ہے بالکل باطل ہے اور اسی طرح اس کو رکوع والی رکعت سے مقید کرنا بلا دلیل ہے۔ نماز صرف وہی رکعت نہیں بلکہ تمام رکعات نماز اور صلوٰۃ ہے اور امام موفق الدین ابن قدامہؒ اور علامہ شمس الدین الحنبلیؒ بھی اس روایت کو مرفوع روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ رواہ الخلال عن جابرؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کل صلوٰۃ لا یقرأ فیها بام القرآن فهی خداج الا ان یکون وراء الامام (مغنی جلد ۱ ص ۶۰۶ واللفظ له وشرح مقنع جلد ۲ ص ۱۲) یعنی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو نماز بھی سورۃ فاتحہ کے بغیر پڑھی جائے تو وہ ناقص ہوتی ہے مگر ہاں یہ کہ امام کے پیچھے ہو۔ باقی ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص کا سبح اسم ربک الاعلیٰ کی قرأت کرنا تو اس حدیث کا سیاق ہی بالکل الگ اور جدا ہے۔ وہاں ان بعضکم خالجنیها کے الفاظ موجود ہیں (دیکھئے مسلم جلد ۱ ص ۱۷۲) اس لیے خارجی اور بیرونی قرائن ڈھونڈنے کی بجائے خود حضرت جابرؓ کا بیان اور تفسیر زیادہ قابلِ قبول ہے اور ان کی مرضی کے خلاف اس روایت میں قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ علاوہ بریں حدیث نمبر ۱۲ میں حضرت جابرؓ کی مرفوع حدیث میں ام القرآن کا خاص لفظ موجود ہے جیسا کہ اپنے مقام پر آئے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

---

چوتھا اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت جابر رضؓ کی حدیث سورۃ فاتحہ کے بارے میں نص صریح نہیں ہے۔ اور حضرت عبادہؓ بن الصامت کی روایت سورۃ فاتحہ کے بارے میں نص صریح ہے لہٰذا حضرت عبادہؓ کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۵)

جواب: حضرت عبادہؓ الصامت کی روایت جو صحیح اور صریح ہے وہ صرف امام اور منفرد کے حق میں ہے۔ اس کا مقتدی سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسا کہ بیان ہوگا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اور جو روایت حضرت جابر رضؓ کی ہے، وہ مقتدی کے حق میں ہے۔ اور حضرت جابر رضؓ کی اپنی صریح اور صحیح روایت میں مذکور ہے کہ قرأت سے سورۃ فاتحہ کی قرأت مراد ہے، علاوہ ازیں لفظ قرأۃ مصدر ہے جو مضاف ہے اور عربی کے طے شدہ قاعدہ کے لحاظ سے یہ سورۃ فاتحہ اور غیر فاتحہ ہر قسم کی قرأت کو شامل ہے۔ چنانچہ امیر یمانیؒ لکھتے ہیں کہ لان لفظ قرأۃ الامام اسم جنس مضاف یعمّ کل ما یقرأہ الامام (سبل السلام جلد ۱ ص ۲۶۲) بے شک لفظ قرأۃ الامام اسم جنس ہے جو مضاف ہے اور یہ ہر اس قرأت کو عام ہے جو امام پڑھتا ہو۔ اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ زیرا کہ مصدر مضاف یکے از صیغ عموم باشد کما تقرر فی الاصول وقرأۃ الامام دریں جا مصدر مضاف واقع شدہ پس شامل جمیع قرأت امام باشد و ایں عموم مخصوص است باحادیث صحیحہ مثل حدیث عبادہ رضؓ..... الخ (دلیل الطالب صفحہ ۲۹۲) لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وغیرہ کے حوالہ سے آئے گا کہ حضرت عبادہؓ کی خلف الامام کی قید سے کوئی روایت صحیح نہیں لہٰذا تخصیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور مؤلف خیر الکلام ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اگرچہ ان آثار میں فاتحہ کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قرأت کا ذکر ہے اور قرأت فاتحہ ہی سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ (ترمذی جلدی ۱ ص ۱۱۱) الخ اور حضرت جابر رضؓ کی روایت کو سورۃ فاتحہ کے بارے میں غیر صریح کہنا ثابت شدہ حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ رہی حضرت عبادہ رضؓ کی خلف الامام کی قید اور مضمون سے روایت تو اپنے مقام پر پوری تفصیل آئیگی کہ ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ اندریں حالات حضرت جابر رضؓ کی حدیث کا حضرت عبادہ رضؓ کی حدیث سے تعارض قائم کر کے ثانی کو اول پر ترجیح دینا صرف تسکینِ قلب کا سامان ہے اور بس۔

پانچواں اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ حدیث من کان لہ امام فقرأة الامام سے تو نفس کفایت ہی معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ حنفیہ امام کے پیچھے قرأت کی ممنوعیت اور حرمت بھی ثابت کرتے ہیں۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ صفحہ ؟)

جواب: قرأت خلف الامام کی ممنوعیت اور حرمت کے صرف حنفیہ ہی قائل نہیں، بلکہ جمہور اہلِ اسلام ان کے ساتھ ہیں خصوصاً جہری نمازوں میں جس کی پوری تحقیق گذر چکی ہے اور جمہور اہلِ اسلام عموماً اور حنفیہ نے خصوصاً یہ دعوٰی کب کیا ہے کہ ہم نفس کفایت، حرمت اور ممنوعیت وغیرہ سب کچھ اس ایک روایت ہی سے ثابت کرتے ہیں ؟ نفسِ کفایت اس روایت سے معلوم ہوگئی اور فریق ثانی کی یہ رٹ تو باطل ہوگئی کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص ہے کالعدم ہے بیکار ہے اور باطل ہے۔ باقی رہی ممنوعیت اور حرمت وغیرہ تو دیگر احادیث سے اور قرآن کریم کی نص فاستمعوا وانصتوا اور حدیث واذا قرأ فانصتوا وغیرہ سے ثابت ہے کیونکہ صیغۂ امر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے امر کی مخالفت حرام بھی ہے اور ممنوع بھی جیسا کہ پہلے نواب صاحبؒ کے حوالہ سے یہ بات ثابت کی جاچکی ہے۔

چھٹا اعتراض: مُبارکپُوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں سُورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور اس کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی حالانکہ احناف کہتے ہیں کہ اگر پچھلی دونوں رکعتوں میں سُورۂ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو۔ تو نماز جائز ہے۔ تو حنفیہ کا عمل بھی حدیث جابرؓ پر نہ ہوا۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۱۴)

جواب: مبارکپوری صاحبؒ نے اپنے اس دعوٰی کے اثبات کے لیے بعض فقہائے کرامؒ کی عبارتیں بھی نقل کی ہیں لیکن کیا مولانا کو یہ معلوم نہیں کہ جتنی حدیثیں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ ان میں ہر ہر حدیث آپ کی فرمودہ نہیں ہے۔ اور نہ عملی طور پر آپ سے ثابت ہے، بلکہ ان میں بہت حدیثیں جعلی، خانہ ساز، ضعیف، شاذ، منکر اور معلول وغیرہ سبھی کچھ موجود ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ نہ تو فقہ حنفی

کی ہر ہر جزئی امام ابوحنیفہ رح کی فرمودہ ہے اور نہ ہر ہر جزئی قابل عمل ہے اور مجتہد کا مصیب اور مخطی ہونا اس پر مستزاد ہے۔ پھر بعض فقہاء رح کی غیر معصوم آرا کو حتمی اور ضروری سمجھ کر تمام احناف کا مسلک بتانا اور پھر اس پر اعتراض کی بنیاد رکھنا محض باطل اور مردود ہے۔ اور اگر بعض نے ایسا لکھا ہے تو اس کو سہو و نسیان پر حمل کرنے کا دروازہ بند نہیں ہو جاتا اور احکام عمد وسہو میں فرق مخفی نہیں ہے۔ (دیکھئے بدور الاہلہ ص۱۶۷ وغیرہ) لیکن مسئلہ زیر بحث میں تو حضرت امام ابوحنیفہ رح سے یہ روایت منقول ہے کہ پچھلی دونوں رکعتوں میں قرأت سورۂ فاتحہ ضروری ہے اور اسی روایت کو حافظ ابن ہمام رح نے پسند کیا اور ترجیح دی ہے (فصل الخطاب ص۷۵) اور حضرت شاہ صاحب رح تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ ابن ہمام رح اور علامہ بدر الدین عینی رح (وغیرہ) نے ثم افعل ذلك فی صلوتك کلها[1] کی حدیث سے پچھلی دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے وجوب پر استدلال کیا ہے (فیض الباری جلد ۲ ص ۲۰۰) اور نیز علامہ سندھی حنفی رح (المتوفی ۱۱۴۰ھ) اسی حدیث سے ہر ایک رکعت میں وجوب سورۂ فاتحہ پر احتجاج کرتے ہیں (سندھی رح علی البخاری جلد ۱ ص ۹۵) اور اسی طرح دیگر محققین علماء احناف بھی پچھلی دونوں رکعتوں میں قرأت سورۂ فاتحہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لہٰذا مبارکپوری صاحب رح کا قیاس ساقط الاعتبار ہے جملہ علماء احناف پر یہ اعتراض تو ہرگز وارد نہیں ہو سکتا۔ البتہ مبارکپوری صاحب رح کا مقتدی کو اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ ...... الآیۃ پڑھنے کا حکم دینا (دیکھئے ابکار المنن ص۱۱۶ وغیرہ) یقیناً حدیث لا تقرأوا بشیء من القرآن کے مخالف ہے۔

ساتواں اعتراض: مبارکپوری صاحب رح وغیرہ کہتے ہیں کہ اس حدیث فقراءۃ الامام له میں لہٗ کی ضمیر حرف مَن کی طرف نہیں لوٹتی بلکہ یہ ضمیر امام کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں حدیث کا معنیٰ یہ ہو گا کہ جس شخص نے امام کی اقتداء کی۔ تو امام کی قرأت صرف امام کے لیے ہے یعنی مقتدی کو اپنی الگ اور جدا قرأت کرنا ہو گی۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص۱۶۸)

جواب: یہ اعتراض یا بزعم خود جواب محض بیہودہ اور لغو ہے: اوّلاً۔ اس لیے کہ سو فیصدی[2]

---

[1] یہ روایت بخاری جلد ۱ ص ۱۰۵ مسلم جلد ۱ ص ۱۷۰ اور نسائی جلد ۱ ص ۱۴۱ وغیرہ میں مروی ہے۔

[2] یہ قاعدہ ہدایت النحو ص۲۱ کافیہ ص۱۷ جامی ص۹۰ مفصل ص۱۸ ، رضی جلد ۱ ص۹۷۔ متن متین ص۹۱ سوال کابلی ص۲۲۱ اور سوال باسولی وغیرہ نحو کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔

نحاۃ کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ جب جملہ خبر واقع ہو تو لابدی ہے کہ اس جملہ میں ربط پیدا کرنے والی کوئی چیز ہو مظہر ہو یا ضمیر جو مبتدا کی طرف راجع ہو، عام اس سے کہ مذکور ہو یا مقدر اس حدیث میں من کان لہ امام حرف من مبتدا ہے جو شرط کے معنی کو متضمن ہے اور جملہ فقرأۃ الامام لہ قرأۃ اس کی خبر ہے جو جزاء پر مشتمل ہے۔ اگر لہ کی ضمیر حرف من کی طرف راجع نہ ہو تو مولانا مبارکپوری صاحبؒ اور ان کے اتباع ہی یہ ارشاد فرمائیں کہ من کی طرف کونسی ضمیر راجع ہوگی یا ربط پیدا کرنے والی یہاں کیا چیز ہے؟ کیا علم نحو فریق ثانی سے اتنا مرعوب یا ان کا اتنا خیر خواہ ہے کہ اس کو یہاں اپنا عمل کرنے کی توفیق ہی نہیں اور نہ اس میں اس کی ہمت اور جرأت ہے۔

قارئین کرام! ملاحظہ فرمایئے کہ مبارکپوری صاحبؒ (مع اپنے اتباع کے) کیسے جگر اور دل کے مالک ہیں کہ حضرات محدثین کرامؒ کے تمام طے شدہ اصول اور ضوابط کو روندتے آئے ہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں اور ابھی ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا ۔۔۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اور ان کی یہ ستم ظریفی بھی دیکھئے کہ وہ کس بے جگری کے ساتھ گرامر اور نحو کے مسلمات کو بھی پامال کرتے جا رہے ہیں، جن کے تسلیم کرنے میں غیر مسلموں اور دہریوں کو بھی کبھی تامل نہیں ہوا۔ مؤلف خیر الکلام صفحہ ۴۹۵ میں لکھتے ہیں کہ بلکہ ضمیر مقدر بھی ہو سکتی ہے جیسے اَلْبُرُّ مُنَوَانِ بِدِرْهَمٍ..الخ

الجواب: بے شک مقدر بھی ہو سکتی ہے۔ مگر وہاں جہاں ظاہر اور مذکور نہ ہو یہاں مقدر ماننے کا کون سا داعیہ ہے جبکہ ضمیر ظاہر موجود ہے؟ باقی علامہ ابو الحسن حنفی سندیؒ کے حاشیہ ابن ماجہ صفحہ ۶۱ کے حوالہ سے جو عبارت مؤلف خیر الکلام نے صفحہ ۴۹۴ میں اپنی تائید کے لیے نقل کی ہے۔ قِیْلَ یَحْتَمِلُ... الخ تو لفظ قیل سے علامہ موصوفؒ نے اس کی تمریض اور تضعیف کردی ہے کیونکہ عموماً یہ لفظ تمریض کے لیے آتا ہے نہ وہ اس تاویل پر راضی ہیں اور نہ یہ ان کا اپنا قول ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے صفحہ ۴۹۴ میں یہ لکھ کر علامہ ابو الحسن حنفیؒ نے بھی ضمیر مقدر نکالی ہے راہِ فرار اختیار کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو صحیح بات سمجھنے کا سلیقہ عطا فرمائے۔

وثانیاً۔ چونکہ فریق ثانی کا عامل بالحدیث ہونے کا دعویٰ ہے (اور ان کے زعم میں دوسرے لوگ جو ان سے اختلاف رائے رکھتے ہیں صرف فقہ اور اماموں کے قول سے احتجاج کیا کرتے

ہیں) اس لیے بطور نمونہ صرف چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ اس خود ساختہ قاعدہ کے تحت ان کا مطلب ہمیں سمجھا دیا جائے:

(۱) من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ (بخاری وغیرہ) آپکے اس قاعدہ کے رُو سے اس کا معنٰی یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہی حاجات پوری کرتا رہتا ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

(۲) من فرج عن مسلم کربۃ فرج اللہ عنہ (بخاری وغیرہ) آپ کے اس قاعدہ کے لحاظ سے معنٰی یہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے مصائب دور کرتا ہے (عیاذاً باللہ تعالیٰ)

(۳) من بنٰی لِلّٰہِ مسجدًا بنی اللہ لہٗ بیتًا فی الجنۃ (متفق علیہ) آپ کے گھریلو ضابطہ کے لحاظ سے معنٰی یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ) (من عادیٰ لی ولیا فقد بارزتہ بالحرب۔ (صحیحین) آپ کے خود ساختہ قانون کے لحاظ سے معنٰی یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو جنگ کرنے کا چیلنج کرتا ہے (معاذ اللہ تعالیٰ) اسی طرح من کان للہ کان اللہ لہٗ، اور من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہٗ اور من کنت مولاہ فعلی رضا مولاہ وغیرہ وغیرہ سینکڑوں حدیثیں ایسی ہیں جن میں اس خانہ ساز قاعدہ کو جاری کرنے کے بعد نہ توحید باقی رہ سکتی ہے۔ اور نہ اللہ تعالیٰ کی ذات منزہ اور مبرا ثابت ہو سکتی ہے اور اسی طرح اسلام کے دیگر اہم مسائل کا ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اس افصح العرب والعجم کی ذاتِ گرامی کی طرف ایسے مہمل احکام منسوب ہوتے ہیں جن کی فصاحت و بلاغت مسلّم چلی آتی ہے کہ نہ تو آج تک آپکا اس فن میں کوئی نظیر پیدا ہوا اور نہ ہو گا۔ ع

**بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر**

**آٹھواں اعتراض:** بعض نہایت سطحی قسم کے دوست یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اگر امام کی قرأت مقتدیوں کے لیے کافی ہے۔ تو مقتدیوں کو رکوع، سجود اور تشہد وغیرہ امور ادا کرنے اور تسبیحات پڑھنے کی بھی ضرورت نہ ہونی چاہیئے کیونکہ امام ہی سب کچھ کرتا رہے گا بلکہ لوگوں کو اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھا رہنا چاہیئے۔ امام خود سب کچھ ادا کرتا رہیگا۔ (ایک صاحب)

**جواب:** امام مقتدی کی طرف سے صرف قرأتِ قرآن میں کفایت کرتا ہے جیسا کہ آیت واذا قرئ القرآن... الآیۃ۔ اور حدیث واذا قرأ الامام فانصتوا وغیرہ دلائل بسط اور تفصیل کے ساتھ

پہلے نقل کئے جاچکے ہیں اور نواب صاحبؒ کے حوالہ سے عرض کیا جاچکا ہے کہ مقتدی کو ممانعت صرف قرآت کی ہے اور حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی کہو۔ جب وہ رکوع اور سجود وغیرہ کرے تو تم بھی کرو۔ ہاں مگر جب امام قرآت شروع کرے۔ تم خاموش رہو۔ اس لیے باقی امور کو قرآت پر قیاس کرنا مع الفارق ہونے کے ساتھ نص کے مقابلہ میں ہے جو ہر طرح سے مردود ہے۔ بہر حال حضرت جابرؓ کی یہ مرفوع حدیث سنداً و معنیً بالکل صحیح ہے اور جمہور کی دلیل اور حجت ہے البتہ حقائق سے چشم پوشی کرنے کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔

**نواں اعتراض:** مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ امام کی قرآت کا ثواب مقتدی کو ملتا ہے۔ مولانا عبدالحئیؒ لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ امام کی قرآت کا مقتدی کے لیے حکمی قرآت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ شارع نے مقتدی کو امام کی قرآت سے قاری کے حکم میں کیا ہے اور اس کو اس کا ثواب عطا کیا ہے (عمدۃ القاری جلد ا ص ۱۷۴) جیساکہ حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص مسجد میں بیٹھ کر نماز کا منتظر ہو وہ نماز میں ہوتا ہے پس ثابت ہوا کہ یہ حدیث قرآت خلف الامام کے منافی نہیں۔ اھ (محصلہ ص ۴۹۱، ص ۴۹۲)

**الجواب:** یہ سب کچھ قلتِ فہم کا نتیجہ ہے، مولانا عبدالحی رحؒ نے بحوالۂ علامہ عینیؒ اس شبہ کا جواب دیا ہے کہ حساً اور ظاہراً تو امام قرآت کرتا ہے پھر اس کی قرآت کو مقتدی کی قرآت کیوں قرار دیا گیا ہے۔ جواب یہ دیا کہ جتنا ثواب امام کو ملے گا۔ شریعت نے اتنا ہی ثواب مقتدی کے لیے بیان کیا ہے کہ اگرچہ وہ خاموش بھی رہے گا۔ (جیساکہ ما زاد علی الفاتحہ میں وہ خاموش رہتا ہے) تب بھی اس کو پورا ثواب ملے گا نہ یہ کہ وہ پیچھے پڑھتا بھی رہے جیساکہ منتظرِ صلوٰۃ کو نماز کا ثواب ملتا ہے یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ وہ بیٹھا بھی رہے اور ساتھ ہی وہ رکوع و سجود وغیرہ کی حرکات بھی کرتا رہے یہ تو دو متضاد چیزیں ہیں یہ بھلا کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟ ہاں جس طرح منتظرِ نماز کو اپنے وقت میں حکمی نماز کا ثواب ملتا ہے اور جب وہ دوسرے موقع پر نماز ادا کرے گا تو اس کو حقیقی نماز کا ثواب ملے گا۔ اسی طرح نمازی کو بحالتِ اقتداء حکمی قرآت کا ثواب ملتا ہے اور فراغتِ امام کے بعد جب مسبوق اپنی قرآت کرے گا یا وہ منفرد ہو کر نماز پڑھیگا تو اس کو حقیقی قرآت کا ثواب ملے گا۔ اگر یہ مطلب نہ لیا جائے تو حکمی نماز کے

ساتھ تشبیہ اور تنظیر درست نہیں ہے کیونکہ حقیقی اور حکمی نماز دو الگ الگ حالتوں میں ہوتی ہے۔ کما لا یخفی۔

## بارھویں حدیث :

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسودؒ[1] بن عامرؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حسنؒ[2] بن صالحؒ نے بیان کیا اور وہ ابو الزبیرؒ[3] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابرؓ[4] سے، وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہٗ قرأۃ — یعنی جس آدمی نے امام اقتداء کرلی ہو تو امام کی قرآت ہی مقتدی کی قرآت ہے۔

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور احد الاثبات لکھتے ہیں (تذکرۃ جلد ۱ ص ۳۲۵) امام ابن معینؒ ان کو لا باس بہ اور ابن مدینیؒ ان کو ثقہ اور ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور صالح اور ابن سعدؒ ان کو صالح فی الحدیث کہتے ہیں۔ اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ صـ۳۴۰) اور حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں تقریب صـ۳۹

[2] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور القدوہ لکھتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ حافظ اور متقن کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ صـ۲۰۱) امام احمدؒ ان کو ثقہ اور ابن معینؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں، امام ابو زرعہؒ ان کو متقن فقیہ عابد اور زاہد کہتے ہیں، ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں، ابن سعدؒ ان کو فقیہ، حجت، صحیح الحدیث اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ دارقطنیؒ ان کو ثقہ اور عابد کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۸۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ فقیہ اور عابد تھے (تقریب صـ۸۶)

[3] ابو الزبیر کا نام محمدؒ بن مسلم بن تدرسؒ تھا۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور المکثر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱۹) امام ابن معینؒ، نسائیؒ اور یحیی القطانؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، یعقوبؒ بن شیبہؒ ان کو ثقہ اور صدوق اور ابن مدینیؒ ان کو ثقہ اور ثبت اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ محدث ساجیؒ کا بیان ہے کہ وہ احکام میں حجت تھے (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴۱) عطاءؒ بن ابی رباحؒ کا بیان ہے کہ جب ہم حضرت جابرؓ سے احادیث کی سماعت کرکے واپس آتے اور آپس میں مذاکرہ اور تکرار کرتے تو ابو الزبیرؒ حفظ روایات اور ان کی ادائیگی میں ہم سب سبقت لے جاتے تھے (ترمذی جلد ۲ ص ۲۴۰ و مسند دارمی صـ۴۹)

[4] یہ روایت مسند احمد جلد ۳ ص ۳۳۹، شرح مقنع الکبیر جلد ۲ صـ۱۱، فتح الملہم جلد ۲ صـ۲۴ اور بغیۃ الالمعی جلد ۲ صـ۱۰ وغیرہ کتابوں میں موجود ہے۔

اس حدیث کا مطلب اور مفہوم بھی بلکہ من وعن الفاظ بھی وہی ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں اور یہ روایت سابق کی طرح اس بات پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اس روایت کے جملہ رواۃ ثقہ اور ثبت ہیں جیساکہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس سند پر فریقِ ثانی کی طرف سے کوئی اعتراض راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابوالزبیرؒ مدلس تھے اور وہ اس روایت کو عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن یہ سوال باطل ہے۔

اوّلًا۔ اس لیے کہ حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ جمہور محدثین ابوالزبیرؒ کی معنعن حدیثوں کو صحیح سمجھتے ہیں (زاد المعاد جلد ۴ ص ۹۵)

وثانیًا۔ پہلے توجیہ النظر کے حوالہ سے نقل کیا جاچکا ہے کہ ابوالزبیرؒ کا شمار ان مدلسین میں ہے جن کی تدلیس کسی صورت میں مضر نہیں ہے۔ ایک سند یوں آتی ہے عن ابی الزبیر عن سعید بن جبیرؒ... الخ امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں۔ ھذا اسناد صحیح (جلد ۱ ص ۱۳۲) امام دارقطنیؒ ان کی معنعن سند کو بھی صحیح کہتے ہیں۔

وثالثًا۔ حضرت عبداللہؓ بن شدادؒ وغیرہ ان کے ثقہ متابع موجود ہیں۔ بہر حال یہ روایت متصل اور صحیح ہے، اس میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حافظ شمس الدینؒ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں۔

وھذا اسناد صحیح متصل رجالہ کلھم ثقات۔ کہ یہ سند صحیح اور متصل ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

(شرح مقنع للکبیر جلد ۲ ص ۱۱ برحاشیہ مغنی)

حافظ شمس الدینؒ کا ترجمہ پہلے نقل کیا جاچکا ہے اور علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۴ ص ۲۷۳) مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۷۹ وص ۴۸۱ میں دارقطنیؒ اور بیہقیؒ کی روایتوں کا سہارا لے کر حسنؒ بن صالحؒ اور ابوالزبیرؒ کے درمیان جابر جعفی کا واسطہ بتایا ہے مگر مسند احمد کی سند میں کوئی واسطہ نہیں اور یہ روایت صحیح اور متصل ہے جیساکہ ابھی ابن قدامہؒ کے حوالہ سے عرض ہوچکا ہے۔

تیرھویں حدیث: امام ابن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے مالکؒ بن اسمٰعیلؒ نے بیان کیا وہ حسنؒ

---

لہ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، عدیم النظیر، الثبت اور النحریر لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۸) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے باقی حاشیہ نمبر ۱ اور نمبر ۲ اگلے

بن صالحؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابو الزبیرؒ سے اور وہ حضرت جابرؓ سے اور وہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کل من کان لہ امام فقرأتہ لہ قرأۃ۔

(الجوھر النقی جلد ۲ صہ ۱۵۹)

ہر وہ شخص جس نے امام کی اقتداء کر لی ہو تو امام کا پڑھنا اس کا پڑھنا ہے۔ اس روایت کے بھی تمام راوی ثقہ ہیں، علامہ ماردینیؒ فرماتے ہیں ھٰذا اسناد صحیح (الجوھر النقی) کہ یہ سند بالکل صحیح ہے۔

چودھویں حدیث: امام عبد الرحمٰنؒ بن حمیدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو نعیمؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حسنؒ بن صالحؒ نے بیان کیا وہ ابو الزبیرؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابرؓ سے اور وہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ — کہ جس کا امام قرأت کرتا ہو تو اس کے امام کی قرأت ہی اس مقتدی کی قرأت ہے۔

یہ روایت بھی صحیح ہے، علامہ آلوسیؒ اس کو علی شرط مسلم صحیح کہتے ہیں (روح المعانی جلد ۹ صہ ۱۳۴)

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ نمبر ۷ مکمل) ہیں کہ وہ احد الاعلام ومن ائمۃ الاسلام تھے اور فرماتے ہیں کہ انہوں نے مصنف نامی ایک کتاب لکھی ہے نہ ان سے پہلے کسی نے ایسی کتاب لکھی ہے اور نہ بعد (البدایہ جلد ۱۰ صہ ۳۱۵) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ اور حافظ لکھتے ہیں۔ (تقریب صہ ۲۱۳)

[۸] (پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں (تذکرۃ جلد ۱ صہ ۳۶۴) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ اور متقن لکھتے ہیں (تقریب صہ ۲۴۴) امام نسائیؒ، عجلیؒ، ابو حاتمؒ اور یعقوبؒ بن شیبہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ عثمانؒ بن ابی شیبہؒ ان کو صدوق، ثبت، متقن اور امام الائمۃ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صہ ۴) باقی رواۃ کی توثیق گذر چکی ہے۔

[۱] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحافظ لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کان من الائمۃ الثقات (تذکرہ جلد ۲ صہ ۱۰۴) ان کی وفات ۲۴۹ھ میں ہوئی ہے۔

[۲] ان کا نام فضلؒ بن دکینؒ تھا۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثبت لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ۱ صہ ۳۳۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب صہ ۳۰۰) باقی رواۃ کا ترجمہ پہلے گذر چکا ہے۔

[۳] یہ روایت الجوہر النقی جلد ۲ صہ ۱۵۹، فتح القدیر جلد ۱ صہ ۲۳۹، شرح نقایہ جلد ۱ صہ ۸۳ اور روح المعانی جلد ۹ صہ ۱۳۴ وغیرہ میں موجود ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ مسند عبدؒ بن حمیدؒ کے قلمی نسخہ ص۲۲ میں (جو مولانا شمس الحق ؒ کے کتب خانہ میں موجود ہے) حسنؒ بن صالحؒ کے بعد جابر جعفی کا نام موجود ہے۔ اور جابر مذکور ضعیف تھا۔ کیونکہ بعینہٖ یہ روایت دارقطنی جلد ۱ ص۱۲۶ اور کتاب القرأۃ ص۱۰۱ میں مذکور ہے اور ان میں ایسا ہی لکھا ہے۔ لہٰذا یہ روایت کمزور ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص۱۶۱)

جواب: نہ معلوم مبارکپوری صاحبؒ اتنے زود فراموش کیوں واقع ہوتے ہیں؟ ؎

تمہیں عادت ہے بھول جانے کی

اگر کاتب کا قلم مسند احمدؒ بن منیعؒ کے نسخہ میں عن جابرؓ کا جملہ زیادہ لکھ سکتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ عبدؒ بن حمیدؒ کے قلمی نسخہ میں جابر جعفی کا جملہ نہیں لکھ سکتا؟ وہ کوئی بڑا منطقی اور فلسفی قلم ہے۔ کہ بظاہر مطبوعہ نسخوں میں تو کام کر سکتا ہے لیکن زاویہ خمول میں پڑے ہوئے قلمی نسخہ میں مجبور ولاچار ہو کر رہ جاتا ہے؟ وہ قلم تھا یا کسی یونیورسٹی کا ماہر پروفیسر تھا؟ کیا بعید ہے کہ وہ قلم تقدیر ہی ہو جو مبارکپوری صاحبؒ کی بگڑی ہوئی قسمت کو سنوارنے کے لیے پھر ایک مرتبہ چل پڑا ہو؟

حافظ شمس الدین ابن قدامہؒ کے حوالہ سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ حسنؒ بن صالحؒ کی ابوالزبیرؒ سے روایت کو متصل بیان کرتے ہیں اور اس کی تصریح کرتے ہیں والحسن بن صالح ادرک ابا الزبیر (جلد ۲ ص۱۱) کہ حسنؒ بن صالحؒ نے ابوالزبیرؒ اور ان کے زمانہ کو پایا ہے۔ اور اصول حدیث کا یہ قاعدہ ہے (جیسا کہ مسلم شریف کے مقدمہ وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے) کہ جمہور محدثینؒ کے نزدیک اتصال سند کے لیے امکان لقاء کافی ہے۔

حسنؒ بن صالحؒ کی ولادت ۱۰۰ھ میں ہوئی ہے اور ابوالزبیرؒ کی وفات ۱۲۸ھ میں (دیکھئے تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص۱۱۹ وغیرہ) اگر اٹھائیس سال کے اس طویل عرصہ کے اندر بھی امکانِ لقاء ثابت نہیں ہو سکتا اور سند متصل نہیں ہو سکتی تو سرے سے فن روایت اور حدیث کا ہی انکار کر دیجئے اور منکرین حدیث کی طرح یہ کہتے ہوئے حدیث سے سبکدوشی اختیار کر لیجئے کہ ؎

یہ اُمت روایات میں کھو گئی
حقیقت خُرافات میں کھو گئی

مؤلف خیر الکلام ص۴۸۱ میں لکھتے ہیں کہ مگر حدیث کے فن کی بنیاد ہر جگہ امکان پر نہیں ہوتی اس

میں وقوع کو بھی دیکھا جاتا ہے ..... الخ

**الجواب:** یہی وہ غیر صحیح نظریہ ہے جس کو امام مسلمؒ نے صحیح کے مقدمہ میں پُر زور الفاظ سے رد کیا ہے اور اتصال سند کے لئے غیر مدلس میں امکانِ لقار کو کافی سمجھا ہے اور یہی نظریہ جمہور محدثین کرامؒ نے اپنایا ہے۔ علاوہ ازیں خود مؤلف خیر الکلام صد ۲۲۳ میں لکھتے ہیں کہ کیونکہ صحتِ حدیث کے لیے صرف استاد اور شاگرد کی ملاقات کا ممکن ہونا کافی ہے۔ عدم ثبوت سے نفی لازم نہیں آتی۔ اھ بلفظہٖ اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں خوامخواہ دوسرے کی معقول بات کو توڑ مروڑ دینا کہاں کا انصاف ہے؟

علاوہ ازیں امام احمدؒ ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ شمس الدینؒ بن قدامہؒ حافظ مزیؒ[1] علامہ ماردینیؒ حافظ ابن ہمامؒ ملا علی قاریؒ اور علامہ آلوسیؒ وغیرہ یہ سند اسی طرح نقل کرتے ہیں عن حسنؒ بن صالحؒ عن ابی الزبیرؒ ... الخ اور اس میں جابر جعفی کا ذکر تک نہیں کرتے۔ مگر شومئ قسمت کا کیا کہنا کہ ان کو نہ تو قلمی نسخہ دستیاب ہو سکا ہے اور نہ مہربان قلم مل سکا ہے۔ ورنہ ذرا سی جنبش ان کے لیے بھی کر ہی گذرتا ـــ ع:

کلکِ ما نیز زبانے و بیانے دارد

رہا دارقطنی اور بیہقی کی سند میں حسنؒ بن صالحؒ اور ابو الزبیرؒ کے درمیان جابر جعفی کا واقع ہونا تو یہ اس پیش کردہ سند کے عدم اتصال کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ حسنؒ بن صالحؒ نے یہ روایت براہِ راست ابو الزبیرؒ سے بھی سُنی ہو۔ اور جابر جعفی سے بھی سنی ہو کسی وقت وہ ابو الزبیرؒ سے روایت بیان کرتے ہوں گے اور کسی وقت جابر جعفی سے یا یوں کہیئے کہ

---

[1] باقی حضرات کے حوالے اور ان کے تراجم آپ پہلے پڑھ چکے ہیں، حافظ مزیؒ نے اپنی کتاب اطراف میں یہ سند یوں ہی نقل کی ہے اور اس میں جابر جعفی کا ذکر نہیں ہے۔ (دیکھئے الجوہر النقی جلد ۲ صد ۱۵۹) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ جمال الدین ابو الحجاج یوسفؒ بن الزکی المزیؒ (المتوفی ۷۴۲ھ) العالم، الحبر، الحافظ، الاوحد، محدث الشام، ثقہ، حجت اور کثیر العلم تھے۔ نیز لکھتے ہیں کہ طبقات رجال اور معرفت رواۃ میں کبھی کسی آنکھ نے ان کا نظیر نہیں دیکھا ہو گا (تذکرہ جلد ۴ صد ۲۶۵) علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن کثیرؒ وغیرہ کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے: ـــ ع

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

جب صحت حدیث کا خیال دامنگیر ہوتا ہوگا اسوقت ابوالزبیرؒ کا طریق بیان کر دیتے ہونگے اور جب محض روایت پیش کرنا ہی مدنظر
ہوتا ہوگا اس وقت وہ جابر جعفی کی سند سے روا بیان کر دیتے ہونگے اور فن حدیث میں اسکی بکثرت مثالیں موجود ہیں اور علماء اصول
اسکو اپنی اصطلاح میں المزید فی متصل الاسانید سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اگر بعض طرق میں راوی اور
مروی عنہ کے درمیان زائد راوی آجائے تو یہ اس کی دلیل نہیں کہ جس طریق میں زائد راوی کا تذکرہ
نہیں ہوا۔ وہ منقطع ہو یا اس سے عدم لقاء ثابت ہو (دیکھئے شرح نخبۃ الفکر ص۴۵ وغیرہ) حضرت
مولانا محدث محمد حسن صاحب فیض پوریؒ لکھتے ہیں کہ ابوالزبیرؒ سے ذیل کے حضرات روایت کرتے
ہیں۔ الحسنؒ بن صالحؒ جیساکہ مسند احمد وغیرہ کا حوالہ ہم نے دیا اور ایوب السختیانیؒ بھی۔ (موطا امام
محمد و کتاب القرآۃ) اور عبداللہؒ بن لہیعہؒ بھی (کتاب القرآۃ) اور الفضلؒ بن عطیہؒ (کتاب القرآۃ)
اور جابر جعفی اور لیثؒ بن ابی سلیمؒ بھی (طحاوی جلد ا ص۱۰۱ و دار قطنی جلد ا ص۱۲۶) (الدلیل المبین ص۲۲۹)
اگر مبارک پوری صاحبؒ اس پر بضد ہیں کہ کاتب صاحب کی غلطی ہی تسلیم کی جائے تو تب ہی
دل کو تسکین ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔ تو لیجئے ہم ان کی اس ضد کو بھی مان لیتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں
ہو سکتا کہ اصل عبارت یوں ہو:
عن الحسن بن صالح وعن جابر الجعفی ... الخ مطلب یہ ہوا کہ ابو نعیمؒ نے حسنؒ بن صالحؒ اور جابر جعفی
دونوں سے روایت کی ہو، لیکن کاتب سے قلمی نسخہ میں صرف حرف واؤ چھوٹ گیا ہو، کیونکہ واو
کا کتابت میں چھوٹ جانا بہت آسان ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کسی دیانت دار کاتب کا قلم
عن جابر زیادہ لکھدے۔ اگر کاتب کی غلطی کی توجیہ و تاویل ہی معتبر ہو سکتی ہے تو یوں کیوں نہ
ہو جاتے؟ بلکہ ابن ماجہ ص۹۱ کے بعض نسخوں میں اصل عبارت ہی اسی طرح ہے جس طرح ہم نے تحریر
کی ہے۔ عن الحسن بن صالح وعن جابر ... الخ اور مولف خیر الکلام نے ص۴۸۱ میں اس کو
دبی زبان سے تسلیم کیا ہے۔

پندرھویں حدیث: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے امام ابوحنیفہؒ نے بیان کیا۔ فرماتے ہیں کہ ہم
سے موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ نے بیان کیا۔ وہ عبداللہؓ بن شدادؓ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابرؓ
سے، انہوں نے فرمایا کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من کان لہ امام فقرأۃ
الامام لہ قرأۃ (موطاء امام محمد ص۹۸) کہ امام کا پڑھنا ہی مقتدی کو کافی ہے اور بس، اس کے

الگ قرأت نہیں ہے۔ یہ روایت کتاب الآثار لابی یوسف ص۲۳ اور طحاوی جلد ۱ صفحہ اور کتاب الآثار لمحمد ص بھی ہے

مؤلف خیر الکلام ص۲۸۷ میں لکھا ہے کہ محدثین کہتے ہیں کہ اس میں امام ابو حنیفہ نے غلطی سے جابرؓ کا لفظ بڑھا دیا ہے۔

الجواب: امام ابو حنیفہؒ ثقہ اور ثبت ہیں اور دیگر ثقہ راوی بھی اس حدیث کو اسی طرح بیان کرتے ہیں، اس زیادت کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے ہاں البتہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ سے تعصب اور عناد کا کوئی علاج نہیں ہے اور اس متعصبانہ انداز سے امام صاحبؒ کی جلالت اور حدیث کی صحت پر کوئی زد نہیں آتی۔

سولھویں حدیث: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسرائیلؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے موسیٰ بن ابی عائشہؒ نے بیان کیا۔ وہ عبداللہ بن شدادؓ سے روایت کرتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں:

امّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی العصر، قال فقرأ رجل خلفہ فغمزہ الذی یلیہ فلما ان صلی قال لم غمزتنی؟ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد امك فکرھت ان تقرأ خلفہ فسمعہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال من کان لہ امام فان قرأۃ لہ قرأۃ..... (موطا امام محمدؒ ص۹۸)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عصر کی نماز میں امامت کرائی اور ایک شخص نے آپ کے پیچھے قرأت کی جو نمازی اس کے ساتھ کھڑا تھا، اس نے اس کا بدن ذرا دبا دیا تاکہ وہ قرأۃ سے باز آجائے۔ جب نماز ادا ہو چکی تو اس نے کہا تم نے مجھے کیوں ٹٹولا اور دبا دیا تھا؟ منع کرنے والے نے کہا کہ چونکہ حضور آگے قرأت کرتے تھے میں نے مناسب سمجھا کہ تم بھی قرأت کرو، آپ نے سنا تو ارشاد فرمایا کہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔

اس روایت کے تمام رواۃ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور گو اس میں حضرت جابرؓ کا ذکر نہیں لیکن اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اولاً۔ اس لیے کہ حضرت عبداللہ بن شدادؓ خود صغار صحابہ میں تھے۔ اور حضرات صحابہؓ کے مراسیل بالاتفاق حجت ہیں۔ وثانیاً۔ ویسے بھی کبار تابعینؒ کے مراسیل صحیح اور حجت ہیں جیسا کہ نقل کیا جا چکا ہے۔ وثالثاً۔ ہم نے یہ روایت پہلی روایت کی تائید میں پیش کی ہے اور مرسل معتضد کے

---

۱؎ امام محمدؒ: مؤلف خیر الکلام ص۳۵ میں لکھتے ہیں کہ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ امام نسائیؒ وغیرہ نے امام محمدؒ کو حافظہ کی بنا پر کمزور قرار دیا ہے۔ (محصلہ)

الجواب: مؤلف خیر الکلام ص۴۵ میں لکھتے ہیں کہ جرح کرنیوالا اگر متعنت اور متشدد ہو تو اس کی توثیق تو معتبر ہے مگر جرح مقبول نہیں

پھر آگے لکھتے ہیں کہ متشددین میں ابو حاتمؒ نسائیؒ ابن معینؒ ابن قطانؒ کو شمار کرتے ہیں۔ بلفظہ۔ لہٰذا امام نسائیؒ کی جرح کا کوئی اعتبار نہیں اور امام محمدؒ ثقہ ہیں جیسا کہ ابتداء کتاب میں باحوالہ ان کی توثیق نقل کر دی گئی ہے۔

حجّت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

مؤلف خیر الکلام ص۴۸۹ میں لکھتے ہیں کہ محدثین کا خیال ہے کہ یہ حدیث مرسل ہونے اور امام محمدؒ کی وجہ سے ضعیف ہے۔

**الجواب:** ہم با حوالہ عرض کر چکے ہیں کہ جمہور محدثین کے نزدیک مرسل صحیح ہے اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ امام محمدؒ ثقہ ہیں اور امام نسائیؒ متعنت ہیں۔ ان کی جرح کا اعتبار نہیں، امام ابن قدامہؒ فرماتے ہیں کہ

ولنا ما رواه الامام احمد عن وکیع عن سفیان عن موسٰی بن ابی عائشۃ عن عبد اللہ بن شدادؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فان قرأۃ الامام لہ قرأۃ۔

(مغنی ابن قدامۃ جلد ۱ ص۵۶۲)

اور ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو امام احمدؒ نے وکیعؒ سے روایت کی ہے اور وہ سفیانؒ سے اور وہ موسٰیؒ بن ابی عائشہؒ سے اور وہ حضرت عبد اللہؓ بن شدادؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا امام ہو تو بے شک اس کے امام کی قرأت اسی کی قرأت ہے۔

یہ روایت بھی اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہے اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت عبد اللہؓ بن شدادؓ صحابی ہیں، لہٰذا ان کی روایت مرسل صحابی ہونے کے اعتبار سے مرفوع ہے اور اس میں امام محمدؒ بھی نہیں ہیں جن پر فریق ثانی ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ امام وکیعؒ بن الجراحؒ کو علامہ ذہبیؒ الامام، الحافظ، الثبت محدث العراق اور احد الائمۃ الاعلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۲۸۲) اور سفیانؒ اس سند میں ثوری ہیں جن کا ترجمہ مقدمہ میں بیان ہو چکا ہے اور بقیہ رواۃ کے تراجم بھی پہلے عرض کیے جا چکے ہیں۔

ایک شاہد: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے قاضی ابو عمروؒ بن حسینؒ بن محمدؒ بن ہیثمؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الحسین عبد الواحدؒ بن حسن نیشاپوریؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حسینؒ بن نعمان عسکریؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہؒ بن حمادؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے سلیمانؒ بن سلمہؒ نے بیان کیا۔ وہ محمدؒ بن اسحاق اُندلسیؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے مالکؒ بن انسؒ نے بیان کیا، وہ یحیٰؒ بن سعید انصاریؒ سے اور

وہ سعیدؒ بن المسیبؒ سے اور وہ حضرت نواسؓ بن سمعان سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ الظہر وکان عن یمینی رجل من الانصار فقرأ خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعلی یساری رجل من مزینۃ یلعب بالحصی فلما قضی صلوٰتہ قال من قرأ خلفی؟ قال الانصاری انا یا رسول اللہ قال لا تفعل من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ۔
(کتاب القرأۃ ص ۱۳۹)

میں نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے ظہر کی نماز پڑھی میرے دائیں پہلو میں ایک انصاری آپ کے پیچھے قرأت کر رہا تھا اور میرے بائیں پہلو میں قبیلہ مزینہ کا ایک شخص سنگریزوں سے کھیل رہا تھا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کس نے میرے پیچھے قرأت کی ہے؟ انصاری نے کہا کہ میں نے یا رسول اللہ آپ نے فرمایا پھر ایسا نہ کرنا جو شخص امام کی اقتداء اختیار کرلے تو امام کا پڑھنا ہی مقتدی کے لیے کافی ہے۔

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس روایت کی سند میں محمدؒ بن اسحاق عکاشی ہے۔ تو وہ کذاب تھا ان کان ھو العکاشی ... الخ کہتے ہیں واقعی عکاشی کذاب ہے لیکن سند میں اندلسیؒ کا ذکر ہے اگرچہ بعض نے عکاشی اور اندلسی کو ایک کہا ہے لیکن محدث ابن عدیؒ ان کو دو بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں ھو رجل لا یعرف یعنی وہ مجہول اور مستور ہے اور حافظ ابن حجرؒ بھی دو ہی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ والراجح التفرقۃ (لسان جلد ۵ ص ۶۷) کہ راجح بات یہ ہے کہ دونوں الگ الگ ہیں اور مؤلف خیر الکلام ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ان کے بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں ہے (ص ۳۱۶) اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ مستور کی روایت کو متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں ہے (ص ۲۲۵) اور یہ روایت ہم نے بھی صرف تائید اور شاہد کے لیے پیش کی ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ بہر حال ہمارا استدلال اس روایت سے نہیں بلکہ محض شاہد کے طور پر ہم نے اس کو نقل کیا ہے۔

ان سابق پیش کردہ روایات سے معلوم ہوا کہ ظہر اور عصر کی قید کو صرف امام ابو حنیفہؒ ہی نہیں بیان کرتے بلکہ دوسرے ثقہ راوی بھی اس کو بیان اور نقل کرتے ہیں۔ اس شاہد کے علاوہ تین روایتیں بسند صحیح نقل کی جا چکی ہیں۔ جن میں ظہر یا عصر کی قید موجود ہے۔ اس شاہد کو چھوڑ کر بھی امام ابو حنیفہؒ

کے علاوہ اسرائیل اور طلحہ (جو دونوں ثقہ اور ثبت راوی ہیں) اپنی روایت میں ظہر یا عصر کی نماز کا ذکر کرتے ہیں۔ لہٰذا جو حضرات ظہر وغیرہ کی قید بیان کرنے میں صرف امام ابو حنیفہ رح کو متفرد کہتے ہیں۔ ان کی تحقیق صحیح نہیں ہے۔

**سترھویں حدیث:** امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبداللہؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہؒ بن سلیمانؒ بن الاشعثؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبدالملکؒ بن شعیبؒ بن لیثؒ بن سعدؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہؒ بن وہبؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے لیثؒ بن سعدؒ نے بیان کیا۔ وہ طلحہؒ سے روایت کرتے ہیں وہ موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ سے، وہ عبداللہؒ بن شدادؒ بن الہاد سے، وہ

---

۱؎ امام بیہقیؒ کا ترجمہ ص۱۷ میں اور حافظ ابو عبداللہؒ اور حافظ ابو علیؒ کا باب اول میں مجاہدؒ بن جبرؒ کے اثر کے ذیل میں اور لیثؒ بن سعدؒ کا مقدمہ میں اور موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ اور عبداللہؒ بن شدادؒ کا عنقریب گذر چکا ہے۔ عبداللہؒ بن اشعثؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقہ (میزان جلد۲ ص۴۳) اور العلامۃ اور قدوۃ المحدثین اور الحافظ الکبیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد۲ ص۲۹۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ من کبار الحفاظ اور من ائمۃ الاعلام تھے (لسان جلد۳ ص۲۹۵) محدث خلیلیؒ کا بیان ہے کہ وہ حافظ اور امام وقت اور متفق علیہ تھے (ایضاً ص۲۹۶) اور وہ امام ابوداؤدؒ صاحب سنن کے فرزند ارجمند تھے۔

۲؎ ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور نسائیؒ ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں، صحیح مسلم میں ان کی پچاس حدیثیں ہیں (تہذیب التہذیب جلد۶ ص۳۹۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص۲۴۵)

۳؎ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، الفقیہ اور احد الائمۃ الاعلام تھے۔ ایک لاکھ حدیث ان سے مروی ہے (تذکرہ جلد۱ ص۲۸۰) خلیلیؒ کا بیان ہے کہ وہ بالاتفاق ثقہ تھے۔ (تہذیب التہذیب ج۶ ص۴۳)

۴؎ امام احمدؒ ان کو لاباس بہ ابن مدینیؒ ان کو معروف ابوزرعہؒ ان کو ثقہ اور ابو حاتمؒ ان کو صالح کہتے ہیں۔ امام لیثؒ ان کی تعریف کرتے تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد۵ ص۱۶) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص۱۸۱) اور تہذیب التہذیب وغیرہ میں تصریح ہے کہ لیثؒ بن سعدؒ نے اسی طلحہؒ سے روایت کی ہے روی عنہ اللیث .... الخ اور اس سند میں بھی لیثؒ بن سعدؒ، طلحہؒ سے روایت کرتے ہیں، یہ تک بندی نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص۴۸۵ میں یہ کہہ کر جان چھڑانے کی ناکام سعی کی ہے۔

ابوالولید سے اور وہ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

ان رجلاً صلّٰی خلف النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی الظہر والعصر یعنی یقرأ فاومیٰ الیہ رجل فنہاہ فابیٰ فلما انصرف قال اتنہانی ان اقرأ خلف النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فتذاکرا حتی سمع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال رسول اللّٰہ علیہ وسلم من صلّٰی خلف امام فان قرأۃ الامام لہٗ قرأۃ۔

(کتاب القرأۃ ص ۱۰۲)

کہ ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی۔ اثنایِ نماز میں ایک آدمی نے اشارہ سے اس کو قرأت سے منع کیا۔ لیکن وہ قرأت سے باز نہ آیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو قرأت کرنیوالے نے منع کرنے والے کو کہا کہ تم مجھے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت سے کیوں روکتے ہو؟ دونوں آپس میں تکرار کر رہے تھے کہ آپ نے ان کی گفتگو سن لی اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھتا ہو اس کو (الگ قرأت نہیں کرنی چاہیے بلکہ) امام کی قرأت ہی اس کو کافی اور بس ہے۔

اور اس روایت کا ذکر اپنی سند کے ساتھ امام ابن قدامہؒ نے بھی کیا ہے مگر اس میں ظہر یا عصر کا ذکر نہیں اور آخر میں ہے:

فقال رسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا کان لک امام یقرأ فان قراتہٗ لک قرأۃ۔ (مغنی ج۱ ص۶۰۹)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تیرا امام قرأۃ کر رہا ہو تو اس کی قرأت ہی تیرے لیے کافی ہے۔

اس صحیح روایت میں ظہر یا عصر کی نماز کا ذکر ہے جو بالاتفاق سرّی نمازیں ہیں۔ اور آپ کے پیچھے قرأۃ کرنیوالا صرف ایک شخص تھا حالانکہ حضرات صحابہ کرامؓ جس طرح نماز اور جماعت کی پابندی کرتے وہ اور کس ہو سکتی ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک کی یہی دلی خواہش ہوتی تھی کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز پڑھی جائے مگر باوجود اتنی بڑی جماعت کے کثیر التعداد حضرات صحابہؓ میں سرّی نمازوں میں آپ کے پیچھے قرأۃ کرنیوالا صرف ایک ہی شخص ملتا ہے اور باقی سب خاموش رہتے ہیں۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اس ایک شخص کی قرأت کو بھی گوارا نہیں فرماتے اور اس کو امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے ہیں۔ اگر امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت ہوتی خصوصاً سرّی نمازوں میں تو یقیناً آپ اس کی تائید فرماتے اور قرأت سے روکنے والے کو تنبیہ فرماتے اور اگر

امام کے پیچھے قرأت کی گنجائش ہوتی خاص کر سرّی نمازوں میں تو عین نماز کی حالت میں احسانِ صلوٰۃ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے منع کرنے والے صحابی قرأت کرنے والے کو منع کرنے کی کبھی جرأت نہ کرتے۔ اور اگر سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کا استحباب یا جواز بھی ہوتا تو منع کرنیوالے کو آپ فرما دیتے کہ ایک جائز اور مستحب حکم کی وجہ سے تم نے نماز میں اپنی توجہ کیوں دوسری طرف مبذول کر دی تھی؟ اور دوسرے حضرات صحابہ کرامؓ بھی منع کرنیوالے کو یہ نہیں کہتے کہ بھائی تم نے اثنائے نماز میں بلا وجہ اس سے الجھنے کی کوشش کی ہے، یہ بھی تو اچھا کام ہی کر رہا تھا۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو بغیر کسی خارجی قرینہ کے یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جہری نمازوں کا تو قصہ ہی چھوڑیے ان میں بھلا امام کے پیچھے قرأت کی کب اجازت نکل سکتی ہے؟ سری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأۃ کرنا نہ تو جائز ہے اور نہ مستحب پھر ضروری کہاں سے ہوگا؟ اور چونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مطلق قرأۃ سے منع کیا ہے۔ اس لیے اس کو محض اپنی رائے سے قرأۃ دون قرأۃ پر حمل کرنا باطل اور مردود ہوگا۔ اور یہ روایت حضرت جابرؓ سے مروی ہے، جو قرأت کا اوّلین اطلاق سورۂ فاتحہ اور ام الکتاب میں منحصر سمجھتے ہیں۔ لہٰذا قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ کا ارتکاب کرنا ہوگا۔ جو محض بے بنیاد اور بیکار ہے۔

پہلا اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں لیثؒ سے اوپر کی سند میں عبد الملکؒ بن شعیبؒ نے غلطی کی ہے ..... الخ (کتاب القرأۃ ص ۱۰۲ اور اسی کا ذکر مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۸۳ میں کیا ہے۔)

**جواب**: جب یہ راوی بالاتفاق ثقہ ہیں اور با دلائل پہلے یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ ثقہ کی زیادت متن اور سند دونوں میں بالاجماع حجت ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ جب حدیث کے ارسال اور اتصال اور رفع و وقف کے بارے میں ثقہ رواۃ کا اختلاف ہو تو بالاتفاق وہ حدیث موصول اور مرفوع ہی متصور ہوگی اور ثقہ رواۃ کی تحدیث صحیح ہوتی ہے اس لیے امام بیہقیؒ وغیرہ کا یہ خلافِ اصول اعتراض قابلِ التفات نہیں ہو سکتا۔

یہ حدیث بھی بہر حال موصول اور مرفوع ہی ہوگی۔

دوسرا اعتراض: امام بیہقیؒ اور امام دار قطنیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ابوالولید مجہول ہے تو یہ روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ (کتاب القرأت ص۱۰۳ و دارقطنی جلد ۱ ص۱۲۳ اور مؤلف خیر الکلام ص ۴۸۳ میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں ابوالولید مجہول ہے۔ لہٰذا یہ قابل اعتبار نہیں)

جواب: واقعی یہ اعتراض قدرے معقول نما ہے لیکن درحقیقت یہ بھی نہایت ہی سطحی ہے اور غلط فہمی کا نتیجہ ہے، کیونکہ ابوالولید کوئی الگ اور جداگانہ ہستی نہیں، بلکہ ابوالولید عبداللہؓ بن شدادؓ کی کنیت تھی۔ چنانچہ امام حاکمؒ لکھتے ہیں:

عبداللہؓ بن شدادؓ ہو بنفسہ ابوالولید ومن تہاون بمعرفۃ الاسامی اورثہ مثل ہٰذا الوہم۔

یعنی ابوالولید خود بعینہٖ عبداللہؓ بن شدادؓ تھے لیکن جن لوگوں نے رواۃ کے ناموں میں غفلت اور کوتاہی سے کام لیا ان کو ایسا وہم ہو جانا کچھ بعید نہیں ہے۔

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ

عبداللہؓ بن شدادؓ اصلہ مدینی وکنیتہ ابوالولید۔

عبداللہؓ بن شدادؓ دراصل مدنی تھے اور ابوالولید ان کی کنیت تھی۔

(معرفت علوم الحدیث، طبع قاہرہ ص۱۰۱)

---

ص۱ لطیفہ: امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ بعض نے ایک طریق سے یہ روایت نقل کی ہے اور اس میں ابوالولید کا جملہ ساقط کر دیا ہے اور دوسرے طریق میں عبداللہؓ بن شدادؓ کا نام اڑا دیا ہے اور یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ ابوالولید عبداللہؓ بن شدادؓ کی کنیت ہے، لیکن یہ انصاف سے بعید ہے۔ (کتاب القرأۃ ص۱۰۳) امام حاکمؒ وغیرہ نے امام بیہقیؒ کا مغالطہ تو ایسا نکالا کہ ان کو شاید لب کشائی کی ہمت ہی نہ رہے۔ مگر خود انھوں نے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۵۹ میں ابوالولید کا جملہ ساقط کر دیا ہے اور پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ امام بیہقیؒ نے امام مسلمؒ کی ایک عبارت میں مغالطہ دینے کی سعی فرمائی ہے۔ فسامحہ اللہ تعالیٰ بعموم فضلہ۔

علاوہ ازیں تاریخ بغدادی جلد۹ ص ۲۷۴، جامع المسانید جلد ا ص ۳۳۸، کتاب الکنیٰ دولابی رح جلد ۲ ص ۱۴۳، تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۱، لسان المیزان جلد ۶ ص ۲۲۸، تقریب ص ۲۰۲ اور توجیہ النظر ص ۱۹۱ وغیرہ کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ ابوالولید عبداللہ بن شدادؓ کی کنیت تھی۔ گویا اس لحاظ سے سند کی اصلی عبارت یوں تھی: عن عبداللہ بن شداد ابی الولید ... الخ رواۃ میں سے کسی نے ابوالولید کو سابق سے الگ سمجھ کر ایک جدا ہستی اور مستقل راوی سمجھ لیا ہے اور اسی حقیقت کو امام بیہقی رح اور دارقطنیؒ نہ پا سکے۔ عربی زبان میں کنیت نام سے پہلے بھی آتی ہے اور نام کے بعد بھی آسکتی ہے۔ مثلاً دیکھئے محمدؒ بن عبدالرحمنؒ ابوالاسود، محمدؒ بن المقاتل رح ابوالحسن (صحیح بخاری جلد ۲ ص ۶۶۱ وغیرہ) اور یحییٰؒ بن یحییٰ ابوزکریا (بخاری جلد ۲ ص ۹۴۶ وغیرہ) وغیرہ وغیرہ اور جملہ ابوالولید اعادۂ جار کے ساتھ عبداللہؒ بن شدادؓ سے بدل بھی ہوسکتا ہے۔ (ہامش شرح نخبۃ ص ۱۱۲)

مؤلف خیر الکلام کا صریح بہتان: جب ان ٹھوس حوالوں سے مؤلف مذکور کا سر چکرایا تو انھوں نے یہ لکھ مارا کہ پھر امام حاکمؒ تو غلطی کی نسبت امام ابوحنیفہ رح کی طرف کر رہے ہیں کہ وہ ابوالولید کو الگ سمجھ کر سند میں بڑھا رہے ہیں کیونکہ ان کو رواۃ کے اسامی کی معرفت نہیں ... الخ ص ۲۸۴) حالانکہ یہ امام حاکمؒ پر خالص بہتان ہے۔ امام حاکمؒ نے اول سے آخر تک اس عبارت میں کہیں اس کی تصریح نہیں کی کہ اس میں امام ابوحنیفہؒ نے غلطی کی ہے وہ تو مَن تهاون بمعرفة الاسامی اورثه مثل هذا الوهم کے عمومی الفاظ بول رہے ہیں کیونکہ مَنْ شرطیہ عموم کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ بیان ہوگا، لیکن غیر مقلدین کے شیخ الحدیث کے نزدیک اس حرف مَنْ سے صرف امام ابوحنیفہؒ ہی مراد ہیں۔ اور ص ۲۸۷ میں مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ اسی بنا پر حاکم نے امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض کیا ہے ___ اور آگے لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رح کو مورد طعن قرار دیا ہے ..... الخ امام حاکمؒ نے اس وہم کی نسبت قطعاً امام ابوحنیفہ رح کی طرف نہیں کی۔ وہ تو حرف مِن استعمال کر رہے ہیں جو غیر مقلدین حضرات کے شیخ الحدیث کے نزدیک عموم کے لیے نص قطعی ہے جیسا کہ اپنے مقام پر بیان ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ یہ ہے ان کی دیانت۔ فوا اسفا۔

اٹھارھویں حدیث: امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو احمد بکرؒ بن محمدؒ بن حمدانؒ الصیرفی نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبدالصمدؒ بن فضل البلخیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے مکیؒ بن ابراہیمؒ نے بیان کیا۔ وہ امام ابو حنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ سے اور وہ عبداللہؓ بن شدادؒ بن الہاد سے اور وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے۔

ان رجلا قرأ خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الظہر او العصر فاومأ الیہ رجل فنہاہ فلما انصرف قال اتنہانی (الحدیث)

(بحوالہ روح المعانی جلد ۹ ص۱۳۴)

وہ فرماتے ہیں کہ ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کر رہا تھا۔ نماز ہی کی حالت میں ایک شخص نے اشارہ سے اسے قرأت کرنے سے منع کیا مگر وہ باز نہ آیا۔ نماز کے بعد کہنے لگا تم مجھے قرأت سے منع کرتے ہو؟

یہ روایت امام ابو یوسفؒ کی کتاب الآثار ص۲۳ میں بھی ہے اس کے آخر میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ من صلّٰی خلف امام فان قرأۃ الامام لہ قرأۃ۔

آگے روایت کا بعینہٖ وہی مضمون ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ پہلی روایت میں اصل مضمون اور اس کی تشریح دیکھ لیں۔ امام حاکمؒ مستدرک جلد ۱ ص۴۹۶، ۲ ص۴۴ وغیرہ میں ایک سند اس طرح پیش کرتے ہیں۔ اخبرنا بکرؒ بن محمدؒ بن حمدانؒ الصیرفی نا عبدالصمدؒ بن الفضل البلخیؒ نا مکیؒ بن ابراہیمؒ .... الخ اور فرماتے ہیں۔ صحیح ہے علامہ ذہبیؒ تلخیص المستدرک میں اس کے بارے میں صحیحؒ کہتے ہوئے صحت کا فیصلہ صادر کرتے ہیں اور بقیہ رواۃ کا ترجمہ گذر چکا ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص۴۸۸ میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے جملہ راوی سوائے امام ابوحنیفہؒ کے ثقہ ہیں اور جابرؓ کے ذکر میں امام ابو حنیفہؒ کی طرف غلطی کی نسبت کی گئی ہے.... الخ اور اس سے پہلے بحوالہ سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۵۹ لکھتے ہیں کہ ایک جماعت نے امام ابو حنیفہؒ سے اسی طرح موصول بیان کی ہے اور عبداللہؒ بن المبارکؒ نے ان سے مرسل بیان کی ہے۔ جابرؓ کا ذکر نہیں کیا اور یہی محفوظ ہے۔

الجواب: پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ ثقہ اور ثبت تھے لہٰذا ان کی تضعیف بغیر تعصب بیجا کے کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور حسب امام بیہقیؒ خود فرماتے ہیں کہ رواۃ کی ایک

خاصی جماعت اس روایت کو موصول بیان کرتی ہے اور اس میں حضرت جابرؓ کا ذکر ہے اور تنہا امام ابن مبارکؒ اس کو مرسل بیان کرتے ہیں تو جماعت کی روایت موصول ہی کیوں نہ محفوظ ہو جب کہ حقیقتہً وہ ہے بھی صحیح محفوظ اور موصول۔

انیسویں حدیث: امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو یحیٰی زکریاؒ بن الحارثؒ نے بیان کیا وہ فرماتے کہ ہم سے محمدؒ بن ازہر سجزیؒ[1] نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے خلف[2]ؒ بن ایوبؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے قاضی ابو یوسف[3]ؒ نے بیان کیا۔ وہ امام ابو حنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ سے اور وہ عبداللہؓ بن شداد ابو الولیدؓ سے اور حضرت جابرؓ سے اور وہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

من صلّی خلف امام فان قرأته له قراۃ۔ کہ جو آدمی امام کے پیچھے نماز پڑھے سو اس کے امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔ (اس کو الگ قرأت کی ضرورت نہیں)

(معرفت علوم الحدیث ص ۱۷۰، طبع قاہرہ)

---

[1] علامہ عبدالقادر القرشیؒ لکھتے ہیں کہ الامام المتکی الفقیہ احد مشائخ اصحاب ابی حنیفۃ فی عصرہ واحد العباد تھے۔ (الجواہر جلد ۱ ص ۲۴۵)

[2] علامہ عبدالقادر القرشیؒ لکھتے ہیں کہ وہ من آئمۃ اصحابنا الخراسانیین اور اصحاب طبقہ عالیہ میں تھے۔ (الجواہر المضیہ جلد ۲ ص ۲۳۱) اور فاضل لکھنویؒ نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ (فوائد بہیہ ص ۱۶۰)

[3] محدث ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ علامہ خلیلیؒ ان کو صدوق اور مشہور کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۱۴۸) علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ وہ احد الفقہاء الاعلام، صاحب علم، عامل اور بڑے خدا پرست تھے (میزان جلد ۱ ص ۳۱۱)

[4] قاضی ابو یوسفؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے اور دیگر روات کے تراجم بھی بیان کر دیے گئے ہیں

فائدہ: محدثین کرامؒ کی اصطلاح میں سند کے ایک راوی کے بدلنے سے روایت بدل جاتی ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر ہم نے ان حدیثوں کا الگ الگ شمار کیا ہے۔ اس امر کو بخوبی ملحوظ رکھیں تاکہ غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

یہ روایت بھی سند کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ایک سند کو جس میں انا ابو یوسف القاضیؒ انا ابو حنیفہؒ ... الخ آتا ہے لکھتے ہیں: ھذا اسناد متصل عال (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۷۱) کہ یہ سند متصل اور بلند پایہ ہے اور مضمون و مفہوم کے اعتبار سے بھی یہ روایت واضح ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ مؤلف خیر الکلام سے رہا نہیں گیا۔ صفحہ ۴۹۰ میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بھی امام ابو حنیفہؒ کی ہے ... الخ

**الجواب:** ہاں یہ روایت امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے جو ثقہ اور ثبت ہیں بغیر کسی متعصب کے کون ان کی روایت کو رد کر سکتا ہے؟ جن کی علمی تحقیق سے امام یحییٰ القطانؒ اور ابن معینؒ وغیرہ ائمہ جرح و تعدیل نے اپنے دامن بھرے اور ان کی تقلید کو اپنے گلے کا ہار بنایا ہے۔ دیکھئے طائفہ منصورہ اور مقام ابی حنیفہؒ وغیرہ۔ رہا مؤلف خیر الکلام کا ص ۴۹۰ میں بحوالہ تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۳۸ یہ لکھنا کہ ابن عبد البرؒ نے لکھا ہے کہ وہ اہلحدیث کے ہاں سیئ الحفظ ہیں اور علیؒ بن المدینیؒ نے سخت ضعیف کہا ہے (محصلہ) تو یہ بے سود ہے خود مؤلف خیر الکلام ص ۴۸ الرفع والتکمیل ص ۸ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ سیئ الحفظ جرح غیر مفسر ہے جو قابل اعتبار نہیں (محصلہ) اور اسی صفحہ میں لکھتے ہیں کہ اگر تعدیل کرنے والے زیادہ ہوں تو ان کا اعتبار ہوگا۔ اور ہم مبسوط اور باحوالہ بحث عرض کر چکے ہیں کہ اکثر امت نے امام موصوفؒ کو ثقہ کہا ہے اور مؤلف خیر الکلام ص ۲۱ میں لکھتے ہیں کہ اور مبہم جرح توثیق کے بعد مقبول نہیں ہوتی۔ اور ص ۲۲ میں لکھتے ہیں کہ توثیق کے بعد جرح غیر مفسر معتبر نہیں ہوتی پس وہ قطعاً ثقہ ہے ... الخ اور یہی ہم کہنا چاہتے ہیں اور ان صحیح روایات سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے علاوہ امام سفیان ثوریؒ، شریکؒ، طلحہؒ اور ابو الزبیرؒ وغیرہ اس روایت کو موصول بیان کرتے ہیں اور حضرت جابرؓ کا ہر روایت میں ذکر آتا ہے۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ سے قاضی ابو یوسفؒ مکیؒ بن ابراہیمؒ اور محمدؒ بن الحسنؒ وغیرہ بلکہ بقول امام بیہقیؒ محدثین کی ایک خاصی جماعت اس روایت کو موصول بیان کرتی ہے اور ظہر یا عصر کی قید بیان کرنے میں بھی امام ابو حنیفہؒ متفرد نہیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور ہر ایک روایت کے ایک ایک راوی کی توثیق بھی عرض کر دی گئی ہے۔ اندریں حالات یہ دعویٰ کرنا کہ امام ابو حنیفہؒ اس میں متفرد ہیں یا ان کا کوئی شاگرد متفرد ہے، یا یہ روایتیں معلول ہیں۔ انصاف کا خون کرنا ہے۔ یہ

باحوالہ دلائل بھی دیکھیے اور مؤلف خیر الکلام کی ہوائی طفل تسلی بھی دیکھئے کہ خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ یہ حدیث مرسل ہے اور مرسل ضعیف ہوتی ہے اور موصول بیان کرنے والے صرف امام ابوحنیفہؒ ہیں باقی رواۃ سب کے سب ضعیف یا مجہول ہیں... الخ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

**بیسویں روایت**: امام دارقطنیؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن مخلدؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے شعیبؒ[2] بن ایوبؒ وغیرہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے زیدؒ بن حبابؒ[3] نے بیان وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے معاویہؒ[4] بن صالحؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الزاہریہؒ[5] نے بیان کیا، وہ کثیرؒ[6] بن مرہؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابو الدرداءؓ سے۔ وہ فرماتے ہیں:

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام شیخ الاسلام اور حافظ زمان لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ صفحہ ۱۸۳)

[2] حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ مشہور اور اعلم اہل عصرہ لکھتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ۵ ص ۳۶۴)

[3] دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ امام حاکمؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۳۴۹)

[4] علامہ ذہبیؒ ان کو العابد الثقہ اور الصدوق لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ا صفحہ ۳۹۲ و تذکرہ جلد ا صفحہ ۳۲)

علامہ خطیبؒ ان کو صاحب حدیث اور وانا محدث لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۸ صفحہ ۴۴۳) امام ابن معینؒ علیؒ بن مدینیؒ، عجلیؒ، ابو جعفر بستیؒ، احمدؒ بن صالحؒ، دارقطنیؒ، ابن ماکولاؒ اور یعقوبؒ بن شیبہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن یونسؒ ان کو حسن الحدیث اور ابو حاتمؒ صدوق اور صالح کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۳ صفحہ ۴۰۳)

[5] ان کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن عباسؓ کے اثر کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

[6] امام ابن معینؒ عجلیؒ، یعقوبؒ بن سفیانؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ اور دارقطنیؒ لا بأس به اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۲ صفحہ ۲۱۸)

[7] علامہ ابن سعدؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ اور ابن خراشؒ صدوق کہتے ہیں، نسائیؒ لا بأس بہ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۸ صفحہ ۴۲۹) حافظ ذہبیؒ ان کو الفقیہ، امام عالم، عامل اور عالم اہل حمص لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ا صفحہ ۴۹)

سُئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افی کل صلوٰۃ قرأۃ قال نعم فقال رجل من الانصار وجبت ھٰذہ فقال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکنت اقرب القوم الیہ ما اری الامام اذا ام القوم الا کفاھم۔

(دارقطنی جلد۱ ص ۱۲۶)

کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔ کیا ہر نماز میں قرأۃ ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ ایک انصاریؓ نے کہا پھر تو قرأت ضروری ہو گئی؟ ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ میں تمام اہل مجلس میں جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قریب تھا۔ آپ نے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا میں یہی جانتا ہوں کہ امام کی قرأت مقتدیوں کو کافی ہے۔

یہ روایت مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۴۴۸، نسائی جلد ۱ صفحہ ۱۰۱، کتاب القرأۃ ص ۱۱۸ و سنن الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۱۶۲، طحاوی جلد ۱ صفحہ ۱۲۹ اور مجمع الزوائد جلد ۲ صفحہ ۱۱۰ وغیرہ کتابوں میں مذکور ہے، ہیثمیؒ فرماتے ہیں۔ (اسنادہ حسن) اس روایت میں حضرت ابو الدرداءؓ اس بات کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا تھا۔ اور جواب بھی آپ ہی نے ارشاد فرمایا ہے اور حضرت ابو الدرداءؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ اس لیے غیر رسول اور جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میں یقیناً فرق اور تمیز کرتے ہوں گے۔ اور اس کی بھی تصریح کرتے ہیں کہ میں سب سے زیادہ آپ کے قریب تھا۔ اور آپ نے خطاب کرتے وقت اور جواب دیتے وقت خاص طور پر میری طرف توجہ فرمائی تھی۔ اگر اتنے قوی اور اندرونی قرائن کے ہوتے ہوئے بھی یہ روایت مرفوع نہیں تو کونسی روایت علم حدیث میں مرفوع ہو گی؟ چونکہ اس روایت میں سرّی اور جہری کی کوئی قید مذکور نہیں ہے اس لیے یہ تمام نمازوں کو شامل ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ وہ مازاد یا جہر پر محمول ہے۔ (صفحہ ۳۲۱) بالکل مردود ہے کیونکہ بقول مؤلف مذکور قرأت سورۂ فاتحہ سے ہی شروع ہوتی ہے (کما مرّ) پھر اس کو مازاد پر کون حمل کرنے دیتا ہے؟ اور روایت میں لفظ قرأت ہے جہر نہیں قرأ کو جہر پر حمل بالکل بے بنیاد ہے۔ اور ایسی رکیک اور دوراز کار توجیہات کون سنتا ہے؟

اعتراض: امام نسائیؒ، دارقطنیؒ اور بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت حضرت ابو الدرداءؓ پر موقوف ہے۔ زیدؒ بن حبابؒ نے اس حدیث کو مرفوع بیان کرنے میں غلطی کی ہے۔ (نسائی

جلد ا صنہ ۱۰، دار قطنی جلد ا صنہ ۱۲۶، کتاب القراۃ صنہ ۱۱۸ اور یہی باتیں مؤلف خیر الکلام نے دہرائی ہیں۔ ملاحظہ ہو صنہ ۴۹۹ و صنہ ۵۰۰ و صنہ ۵۰۱) اور یہی کچھ ترجمان الحدیث ماہ دسمبر ۱۹۷۴ء صنہ ۴۴ تا صنہ ۴۶ اور ماہ جنوری ۱۹۷ء صنہ ۲۲ تا صنہ ۲۶ میں کہا گیا ہے کہ فلاں نے اس کو قوف کہا اور فلاں اور فلاں نے۔

**جواب**: یہ اعتراض قطعاً باطل ہے: اولًا — اس لیے کہ زیدؒ بن حبابؒ بالاتفاق ثقہ ہیں۔ اور ثقہ راوی کی متن اور سند میں زیادت بالاجماع مقبول ہوتی ہے جس کی پوری تفصیل گذر چکی ہے۔ وثانیًا — یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ حدیث کے موقوف اور مرفوع ہونے کی صورت میں تمام محدثین کے نزدیک روایت موصول اور مرفوع ہی سمجھی جائے گی۔ وثالثًا — اگر تنہا زیدؒ بن حبابؒ ہی اس کو مرفوع روایت کرتے تب بھی یہ حدیث مرفوع ہی ہوتی، کیونکہ زیدؒ بن حبابؒ ثقہ تھے۔ حالانکہ ان کے علاوہ ابو صالحؒ کاتب لیثؒ (جن کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن عباسؓ کے اثر میں نقل کیا جا چکا ہے) بھی اس روایت کو مرفوع نقل کرتے ہیں۔ (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۲ وغیرہ اور اس کی سند بھی صحیح ہے) جب یہ دونوں راوی ثقہ ہیں۔ اور اس روایت کو مرفوع بیان کرتے ہیں تو یہ حدیث محدثین کے طے شدہ قاعدہ کی رو سے مرفوع ہی ہوگی اور امام بیہقیؒ وغیرہ کی بلا دلیل اصول شکنی قابل التفات نہیں ہو سکتی اور نہ اس کو کوئی سننے کے لیے تیار ہے چونکہ یہ اکابر غلطی سے پہلے یہ نظریہ قائم کر چکے ہیں کہ قرأۃ خلف الامام کی اجازت ہے، اس لیے اس کے خلاف تمام روایات کو وہ خواہ مخواہ معلول ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر خالی الذہن ہو کر پہلے جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کو ملاحظہ کر لیتے تو یقیناً ایسی رکیک اور بعید از انصاف تاویلات سے ہرگز کام نہ لیتے، فسامحہم اللہ تعالیٰ اور مولانا مبارکپوری صاحبؒ صاحبؒ کا تو معاملہ ہی عجیب ہے وہ امام سفیانؒ بن عُیَیْنَہؒ اور حضرات صحابہ کرامؓ کے صحیح آثار سے تو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کو مقید کرنا گوارا نہیں کرتے، مگر اس مقام پر جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مطلق حدیث کو محض اپنی ناقص عقل اور فہم نارسا کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے ہیں (دیکھئے ابکار المنن صنہ ۱۶۷)،

اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ بلا دلیل کرتے ہیں :— ع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

باقی جس روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابو الدردا رضؓ نے کثیر بن مُرّہ رح سے یہ کہا تھا جیسا کہ بعض کتابوں میں آتا ہے تو وہ اپنے مقام پر صحیح ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ مرفوعاً بھی یہ روایت آئی ہے اور موقوفاً بھی جب مسئلہ بیان کرنا مقصود ہوگا تو اپنا قول بیان کردیتے ہوں گے۔ اور جب حدیث کا بیان کرنا ملحوظ ہوتا ہوگا تو مرفوعاً بیان کردیتے ہوں گے کیونکہ ارسال اور رفع میں رواۃ کے حالات مختلف ہوتے ہیں جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

احسن الکلام پر بلاوجہ محض تعصب کی وجہ سے تنقید کرنے والے بزرگ علامہ عراقی رح کی ایک عبارت کا (جس کا ذکر ۲۷ میں ہو چکا ہے) حوالہ دے کر لکھتے ہیں۔ لیکن اگر یہ اختلاف ایک راوی کے تلامذہ میں ہے تو پھر ثقہ اور اوثق کے اصول پر اس کی تنقیح کی جائے گی۔ اگر دونوں اسناد ہمہ عیوب سے صاف ہوں گی تو پھر مزید قرائن کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلہ کیا جائے گا جیسا کہ اس کی تفصیل ہم عرض کر آتے ہیں۔ (ترجمان الحدیث ص۲۵ ماہ جنوری ۱۹۷۵ء)۔

**الجواب :** پہلے بیان ہو چکا ہے کہ علامہ عراقی رح کے حوالہ سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ ثقہ راوی جب کسی وقت روایت موصول اور کسی وقت مرسل بیان کرے یا کسی وقت مرفوع اور کسی وقت موقوف بیان کرے تو اس کے بارے میں صحیح تر فیصلہ یہ ہے کہ وہ روایت موصول اور مرفوع ہی قرار دی جائے گی نہ کہ مرسل و موقوف۔ علامہ عراقی رح کی اس عبارت میں راوی کے تلامذہ میں ثقہ اور اوثق کی تنقیح کا کوئی تذکرہ نہیں اور امام نووی رح لکھتے ہیں کہ اگر بعض ثقہ اور ضابطہ راوی حدیث کو متصل اور بعض مرسل بیان کرتے ہوں یا بعض مرفوع اور بعض موقوف بیان کرتے ہوں یا ایک ہی راوی کسی وقت مرفوع بیان کرتا ہے۔ اور کسی وقت مرسل یا موقوف بیان کرتا ہے تو اس کے متعلق صحیح بات جو محققین محدثین رح اور فقہا اور ارباب اصول نے بیان کی ہے اور اسی کو علامہ خطیب بغدادی رح نے صحیح قرار دیا ہے یہ ہے :

ان الحکم لمن وصلہ او رفعہٗ سواء کان المخالف لہٗ مثلہٗ او اکثر او احفظ لانہ زیادۃ ثقۃ وھی مقبولۃ اھ (مقدمۂ شرح مسلم ص ۱۸)

کہ بے شک حکم اس کے موصول یا مرفوع ہونے کا دیا جائے گا۔ عام اس سے کہ اس کا مخالف اس جیسا ہو یا زیادہ ہو یا زیادہ حافظ ہو کیونکہ یہ زیادت ثقہ ہے جو بہرحال مقبول ہے۔

اس عبارت سے تین باتیں نمایاں طور پر ثابت ہیں:

(۱) اس صورت میں موصول اور مرفوع ہونے کا فیصلہ محقق محدثین رح فقہاء رح اور ارباب اصول کا ہے۔

(۲) ایک ہی ثقہ راوی سے یہ اختلاف ثابت ہو تب بھی یہی فیصلہ ہے یا ایک ہی راوی کے تلامذہ جدا جدا ہوں تب بھی یہی فیصلہ ہے۔

(۳) اس میں موصول اور مرفوع بیان کرنیوالے کے مقابلہ میں اکثر یا احفظ یا اوثق کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ یہ زیادت ثقہ ہے جو بہرحال مقبول ہے۔

اکیسویں [۲۱] حدیث: امام حاکم رح فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو یحییٰ سمرقندی رح نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن نصر رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمدؒ بن عبد الرحمنؒ بن وہبؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ہمارے چچا (عبد اللہؒ بن وہبؒ) نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے لیثؒ بن سعدؒ نے بیان کیا۔ وہ یعقوبؒ بن ابراہیم رح (امام ابو یوسفؒ) سے روایت کرتے ہیں اور وہ نعمانؒ بن ثابتؒ (امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) سے اور وہ موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ سے اور وہ عبد اللہ رضؓ بن شداد ابو الولید رضؓ سے اور وہ حضرت جابرؓ بن عبد اللہ رضؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

من صلی خلف امام فان قرأۃ الامام لہٗ قرأۃ۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۱۵۲ وھکذا فی الجامع)

کہ جو شخص امام کے پیچھے (اس کی اقتداء میں نماز پڑھے تو اس کو امام کی قرآت ہی کافی اور بس ہے۔

---

ل چونکہ امام حاکم رح نے اسی روایت کے سلسلے میں اسی صفحہ میں واضح طور پر یہ بیان کر دیا ہے کہ ابو الولید ابو عبد اللہ رضؓ بن شداد رضؓ ہی کی کنیت ہے اس لیے ہم نے عبد اللہ رضؓ بن شداد ابو الولید رضؓ لکھا ہے جیسا کہ پہلے باحوالہ عرض کیا جا چکا ہے مؤلف خیر الکلام کا ص ۱۱۵ میں اس کو مغالطہ کہنا انصاف پر مبنی نہیں ہے کیونکہ جب ابو الولید عبد اللہ رضؓ بن شداد رضؓ ہی کی کنیت ہے تو ایک ہی شخصیت ہے۔

اس سند کے اکثر رواۃ کے تراجم پہلے نقل کئے جا چکے ہیں اور بعض جلیل القدر اور نامور محدث تھے البتہ احمدؒ بن عبد الرحمٰنؒ بن وہبؒ کا ترجمہ سن لیجئے اگرچہ ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ مصر کے اساتذہ اس کے ضعیف ہونے پر متفق ہیں اور ابن یونسؒ فرماتے ہیں کہ اس سے حجت قائم نہیں ہوتی۔ (میزان جلد ا صـ۵۳ بحوالہ خیر الکلام صـ۵۱۱) مگر جمہور محدثین کرامؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محمدؒ بن عبد اللہؒ بن الحکمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کے بارے میں کوئی کلام اور جرح نہیں سنی، عبد الملکؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام ابو زرعہؒ ان کی تعریف کرتے تھے۔ ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ محدث عبدانؒ ان کو مستقیم الامر کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ محدثین کے نزدیک ان کی حدیثیں قابلِ برداشت ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ نے پہلے ان میں کلام کیا تھا۔ لیکن بعد از تحقیق اس سے رجوع کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن خزیمہؒ متقدمین میں سے اور امام ابن قطانؒ متاخرین میں سے ان کو ثقہ سمجھتے ہوئے ان پر کلی اعتماد کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ا ص ۵۴، ۵۵، ۵۷) یہ روایت بھی سند کے اعتبار سے صحیح اور مرفوع ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے صفحہ ۵۱۱ میں اس کے جواب میں بھی وہی پرانا رونا رویا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ ضعیف ہیں اور متفرد ہیں (محصلہ) جواب پہلے گذر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرات! ہم نے متابعات اور شواہد کے علاوہ بیس حدیثیں صحیح اور مرفوع (باسند اور سند کے ایک ایک راوی کی توثیق کے ساتھ آپ سے) باحوالہ عرض کی ہیں۔ اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ سوالات کے مسکت جوابات بھی عرض کر دیے ہیں۔ اب ہم آخر میں آپکے سامنے چند اور حدیثیں بطور تائید عرض کرتے ہیں اور سند پوری نقل کر دیتے ہیں۔

---

بطور شاہد پہلی حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو سعید محمدؒ بن جعفر رح بن خصیب ہرویؒ نے اپنی کتاب سے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہؒ بن محمود سعدی رح نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے

اسمٰعیل سدیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے مالکؒ بن انسؒ نے بیان۔ وہ وہبؒ بن کیسانؒ سے اور وہ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بام القرآن فھی خداج الا وراء الامام۔ (کتاب القرأۃ ص۱۱) ہر وہ نماز جس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو تو وہ نماز ناقص اور نامکمل ہوتی ہے۔ ہاں مگر وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے۔

یہ روایت صاف بتلاتی ہے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ اور ام القرآن پڑھنے کی بھی گنجائش نہیں ہے اور اسی کو فریق ثانی ضروری سمجھتا ہے۔ ہاں البتہ امام اور منفرد کی کوئی نماز بغیر سورۂ فاتحہ کے مکمل نہیں ہو سکتی جیسا کہ اس کی تصریح موجود ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اسمٰعیل سدیؒ کا دوسرا شاگرد سریؒ بن خزیمہؒ اس روایت کو حضرت جابرؓ سے موقوف روایت کرتا ہے۔ اس لیے یہ عبداللہؒ بن محمود سعدیؒ کی غلطی ہے کہ وہ اس کو مرفوع بیان کرتے ہیں اور یہی بات مؤلف خیر الکلام نے دہرائی ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۵۰۴ و ۵۰۵)

الجواب: عبداللہؒ بن محمود سعدیؒ کو علامہ ذہبیؒ، الحافظ، الثقہ اور صوبہ مرو کا محدث لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص۲۵۷) امام حاکمؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں، محدث خلیلیؒ ان کو الحافظ اور عالم فن حدیث کہتے ہیں (ایضاً جلد ۲ ص۲۵۸) کیوں نہ ہو کہ حافظ اور ثقہ راوی کی زیادت کو تسلیم کر لیا جائے۔ اور اصول شکنی کا ارتکاب نہ کیا جائے، کہ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی، اور یہی امر قرین قیاس اور انصاف ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے ص۵۰۵ میں لکھا ہے کہ اس کے ثقہ ہونے سے حدیث کا صحیح ہونا ضروری نہیں اھ یعنی محض اس لیے کہ مؤلف صاحب اور ان کی جماعت اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہاں محمدؒ بن اسحاقؒ جیسا کوئی ضعیف راوی ہوتا تو وہ ضرور مان لیتے اور پھر حدیث صحیح ہو جاتی، باقی امام مالکؒ کا یہ فرمانا کہ اس کی ٹانگ پکڑ دو یہ اس کے مرفوع ہونے کی نفی یا انکار کی قطعی دلیل نہیں۔ طحاوی کی شرح میں حذ فاً برجلہ

کانسخہ بھی ہے (حاشیہ طحاوی جلد ا ص۱۰۱) یعنی ان کی بات مان لو اور ان کے نقشِ قدم پر چلو اور اس کے پیش نظر خذوا بجلہٖ کا مطلب بھی یہ ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے امام مالکؒ کی تصدیق ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

دوسری حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابوعبداللہؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ابوعبداللہ حسینؒ بن محمدؒ ہروی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابوبکر احمدؒ بن محمدؒ بن عمرؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابوعبدالرحمٰن محمدؒ بن احمد تمیمیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابومحمد سویدؒ بن سعیدؒ نے زبانی بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے علیؒ بن مسہرؒ نے بیان کیا۔ وہ عبیداللہؒ بن عمرؓ سے اور وہ نافعؒ سے اور وہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اور وہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہٗ قرأۃ (کتاب القرأۃ ص۱۲۵) کہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے یہ حدیث بھی اپنے مفہوم کے لحاظ سے واضح ہے اور حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت ابن عمرؓ سے موقوف مروی ہے یہ ابومحمد سویدؒ بن سعیدؒ کی غلطی ہے کہ اس روایت کو مرفوع بیان کرتے ہیں۔

جواب: علامہ ذہبیؒ سویدؒ بن سعیدؒ کو صاحبِ حدیث اور صاحب حفظ کہتے ہیں۔ امام مسلمؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے۔ ابوحاتمؒ ان کو صدوق اور کثیر التدلیس (لیکن اس روایت میں وہ حدثنا سے تحدیث کرتے ہیں) کہتے ہیں بغویؒ ان کا شمار حفاظِ حدیث میں کرتے ہیں۔ صالح جزرہؒ ان کو صدوق اور دارقطنیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (میزان جلد ا ص۴۳۴)۔ محدث عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ مسلمہؒ بن قاسمؒ کا بیان ہے کہ وہ ڈبل ثقہ تھے۔ امام احمدؒ ان کو صالح یا ثقہ کہتے ہیں۔ میمونیؒ امام احمدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ مجھے ان میں کسی کا کلام اور جرح معلوم نہیں۔ امام ابوداؤدؒ ان کی صدوق ولا بأس بہٖ سے توثیق نقل کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص۲۷۵) جزریؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں اور امام مسلمؒ نے صحیح میں ان سے احتجاج کیا ہے۔ (حصن حصین ص۱۱۴ باب ماء زمزم لما شرب لہ) اس لیے ضابطہ کے لحاظ سے یہ زیادت بھی صحیح ہوگی اور یہ امام مسلمؒ کی شرط پر صحیح ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے صہ ۵۰۶ میں بعض کتب رجال سے سویدؒ بن سعیدؒ پر جرح کلمات نقل کر کے آگے لکھا ہے، پس نتیجہ یہ نکلا کہ یہ حدیث قطعاً جھوٹ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن ائمہ نے ان کی توثیق کی ہے جیسے کہ اوپر باحوالہ گزر چکی ہے وہ غلط ہے؟ اور کیا امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں جھوٹے راوی سے احتجاج کیا ہے؟ علاوہ ازیں علامہ خطیب بغدادیؒ اپنی سند کے ساتھ انا محمد بن عبدۃ نا خارجۃ عن ایوب عن نافع عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ روایت کرتے ہیں۔
(ملاحظہ ہو تاریخ جلد ۱ ص ۲۲۳)

جس کے راوی اس مذکور سند کے متابع ہیں اور بزعم مؤلف خیر الکلام وغیرہ اگر کچھ سقم بھی اس میں ہے تو دوسری سند سے پورا ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس امر سے اختلاف تو نہیں کیا جا سکتا کہ بعض محدثینؒ نے اس پر جرح کی ہے اور جمہور اس کی توثیق کرتے ہیں اور مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے اس کی حدیث حسن تو ضرور ہے خود مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ مختلف فیہ آدمی حدیث حسن ہوتی ہے۔ (خیر الکلام صہ ۳۲۵) مگر اس حدیث کو قطعاً جھوٹ کہنا خالص ودسفید جھوٹ ہے۔

تیسری حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ابو العباس بالویہؒ بن محمدؒ بن بالویہ مرزبانیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عمرو بن زرارہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیلؒ بن ابراہیمؒ نے بیان کیا۔ وہ علیؒ بن کیسانؒ سے اور وہ ابن ابی ملیکہؒ سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں اور وہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

كل صلوٰة لا يقرأ فيها بفاتحة الكتاب فلا صلوٰة له الا وراء الامام۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۳۷)

یعنی ہر وہ نماز جس میں نمازی سورۂ فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز ادا نہ ہوگی۔ ہاں مگر امام کے پیچھے بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے بھی نماز صحیح ہے۔

یہ روایت بھی اپنے مدلول کے لحاظ سے بالکل عیاں ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔

---

اعتراض: امام بیہقیؒ اپنے استاد کے حوالہ سے یہ نقل کرتے ہیں کہ علیؒ بن کیسانؒ کا نام

ہم نے صرف اسی سند میں سُنا ہے۔

**الجواب:** حافظ ابن حجرؒ نے علیؒ بن کیسانؒ کا نہایت مختصر ترجمہ یوں قائم کیا ہے وھی علی بن سلیمان بن کیسان الکیسانی رحمہ (تھذیب التھذیب جلد ۷ صـ ۳۷۵) اور محدث فیض پوریؒ فرماتے ہیں کہ ابن ابی حاتم رحمہ نے ان کو صالح الحدیث ما اری بحدیثہ بأسا کہا ہے (لسان ج ۴ صـ ۲۳۲) لہٰذا ان کی حدیث حسن یا صحیح ہے (الدلیل المبین صـ ۱۷۵) اور اگر بالفرض یہ مستور بھی ہو تب بھی مولف خیر الکلام کہتے ہیں کہ مستور بلکہ ضعیف کی روایت متابعت میں پیش کی جا سکتی ہے جیسا کہ باحوالہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

**چوتھی حدیث:** امام بیہقی رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبداللہ رحمہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو حامد احمدؒ بن محمدؒ بن قاسم سرخسیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے احمدؒ بن عبدالرحمٰن سرخسیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیلؒ بن فضل رحمہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عیسٰیؒ بن جعفر رحمہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سفیان ثوریؒ نے بیان کیا۔ وہ اعمش رحمہ سے اور وہ حکمؒ سے اور وہ عبدالرحمٰنؒ بن ابی لیلیٰؒ سے اور وہ حضرت بلالؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا أقرأ خلف الامام۔

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں امام کے پیچھے قرأت نہ کروں۔

(کتاب القرأۃ ص ۱۳۹)

چونکہ قرأت خلف الامام کا مسئلہ اپنے ایجابی یا سلبی پہلو کے اعتبار سے کسی صحابیؓ سے مخصوص نہ تھا اس لیے حضرت بلالؓ کو کسی خاص مصلحت کے پیش نظر آپ نے خطاب کیا ہو گا۔ ورنہ حکم سب کے لیے عام ہے۔

**اعتراض:** امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ عیسٰیؒ بن جعفر رحمہ تو ثقہ اور ثبت تھے۔ اس لیے اس میں غلطی اسماعیلؒ بن فضل رحمہ کی ہو گی کہ اس سند میں سفیان ثوریؒ کا ذکر ہے اور وہ اس سے بری ہیں اگر ان سے روایت ہوتی تو اس کے بارے میں اختلاف نہ ہوتا، اسمٰعیلؒ بن فضل رحمہ اگر سچا ہے تو اس کی غلطی ہے۔ جھوٹا ہے تو اس کا افترا ہے۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۳۹ بحوالہ خیر الکلام ص ۵۱ محصلہ)

**الجواب:** حدیث کو باطل ٹھہرانے کا یہ نرالا قاعدہ امام بیہقیؒ نے تجویز فرمایا ہے۔
کیا قرأت خلف الامام کی روایت کے امام ثوریؒ مجاز نہیں؟ یا ان کی کسی دیگر روایت
میں اختلاف نہیں ہوا؟ اس سے سند اور حدیث پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ
اسمٰعیلؒ بن فضلؒ کا حال معلوم نہیں یہ اصول کی بات ہے، مگر مؤلف خیر الکلام کے بیان کے مطابق
مستور اور ضعیف کی حدیث بطور تائید و متابعت پیش ہو سکتی ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔
اور اصول کے لحاظ سے شاہد و متابع کا بھی کوئی فرق نہیں۔

قارئین کرام! اس مضمون کی کم و بیش ستائیس سندیں راقم الحروف کے بیاض میں
ابھی اور موجود ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں ہر ایک سند فریق ثانی کی اجازت یا وجوب
قرأت سورۂ فاتحہ خلف الامام کی روایتوں سے اگر زیادہ قوی اور صحیح نہیں تو یقین کیجئے
کہ ان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ مگر چونکہ ہمیں آپ سے ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے
اس لیے سر دست ان پیش کردہ احادیث پر ہی ہم اکتفا کرتے ہیں اور ان سے ایک حقیقت
پسند انسان بخوبی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنیوالے کیا بے دلیل ہیں؟
اور کیا ان کے پاس جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیثیں موجود نہیں؟ اور
کیا جن کتابوں کے حوالے درج کیے گئے ہیں وہ اس دنیا میں موجود نہیں؟ اور کیا ان میں سورۂ
فاتحہ اور ام القرآن و ام الکتاب کی تصریح موجود نہیں؟ اور کیا یہ روایتیں صحاح ستہ و ماوافق
بہا میں نہیں پائی جاتیں؟ اور کیا یہ کتابیں دنیا کے اسلامی کتب خانوں میں موجود نہیں؟ اور کیا
ان حدیثوں میں کوئی حدیث صحیح اور مرفوع نہیں؟ اور کیا ان تمام دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے
جمہور اہلِ اسلام (جو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ اور دیگر کسی قسم کی قرأت کے قائل نہیں ہیں) نماز
جیسی اہم اور بنیادی عبادت سے سبکدوش ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ یا ان کی نماز بھی ناقص کالعدم
بیکار اور محض باطل ہے؟ ان میں سے ایک ایک دعوے کا براہین کے ساتھ اثبات کیا جا چکا ہے
اور فریق ثانی کے جملہ بے بنیاد دعاوی کا دلائل سے بطلان ثابت کیا گیا ہے، جیسا کہ آپ دیکھ چکے
ہیں۔ الغرض حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت
عبد اللہؓ بن بحینہؓ، حضرت عبد اللہؓ بن مسعود، حضرت ابو بکرہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ

حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ، حضرت عبداللہؓ بن شدادؓ، حضرت نواسؓ بن سمعانؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ کی اکثر روایتیں صحیح اور مرفوع ہیں اور حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ کی حدیث کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایتوں میں سورۃ فاتحہ کا خاص لفظ موجود ہے جیساکہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اور آپ یہ بھی ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ فریق ثانی کے نزدیک بھی پیش کردہ احادیث کے تقریباً جملہ رواۃ کی ثقاہت، عدالت، امامت اور اتقان مُسلّم ہے، محض کسی کے تفرد پر گرفت کی گئی ہے تو کسی کی تدلیس پر کسی کی تخلیط پر اور کسی کے تغیر یسیر پر اور کہیں مرفوع اور موصول روایت کو اصول شکنی کرتے ہوئے موقوف اور مرسل قرار دیا گیا ہے اور کہیں راوی حدیث کی مرضی کے خلاف بلکہ خود مرفوع حدیث کے خلاف حدیث کا مطلب لیا گیا ہے اور ان تمام خلاف قاعدہ باتوں کے علاوہ محض اپنی مرضی سے مطلق قرأت کو مقید کرنے کی ناکام سعی کی گئی ہے اور ایسی ایسی کمزور اور رکیک وضعیف اور بعید از قیاس و انصاف تأویلات اور توجیہات اختیار کی گئی ہیں کہ فن اصول حدیث بھی ان سے نالاں ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ کے اس دعوے کی حقیقت بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ من کان لہٗ ...... الخ کے تمام طرق معلول ہیں۔

قارئین کرام! ذرا ان راویوں کا ان راویوں سے تقابل کر لینا جن کی روایتوں سے فریق ثانی نے استدلال کیا ہے کیونکہ — ع: وبضدھا تتبین الاشیاء

ہم دوسرے باب کو یہاں ختم کرتے ہیں اور تیسرا باب شروع کرتے ہیں۔ واللہ المستعان وھو نعم المعین۔

# باب سوم

اہلِ اسلام سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کے بعد دینی مسائل میں جن حضرات کی طرف نگاہیں اُٹھ سکتی ہیں۔ وہ شمع نبوت کے پروانے اور فیض رسالت سے مستفید حضرات صحابہ کرامؓ کی مخلص جماعت ہی ہو سکتی ہے اور ان کے بعد حضرات تابعینؒ کا دور ہے کیونکہ یہی وہ حضرات ہیں جو خیر القرون کے درخشندہ ستارے تھے، جن کی سعی بلیغ کی بدولت دنیا سے کفر و شرک میں روشنی پھیلی، بدعات و رسوم کا خاتمہ ہوا۔ جہالت و تاریکی دنیا سے مٹی اور علم و عرفان کی بارش سے دلوں کی دنیا میں ایمان و بصیرت کی شادابی پیدا ہوئی۔ نیز یہ بات بھی مخفی نہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ شرف صحبت کی برکت سے سب کے سب عادل، ثقہ، متقی، خدا پرست اور پاکباز تھے۔ لیکن فہم قرآن اور تدبر حدیث میں سب برابر نہ تھے۔ اس لحاظ سے ان کے آپس میں مختلف درجات اور متفاوت مراتب تھے۔ چنانچہ امام مسروقؒ (المتوفی ٦٣ھ جو الامام الفقیہ اور احد الاعلام تھے تذکرہ جلد ١ صفحہ ٤٦) فرماتے ہیں کہ میں نے حضرات صحابہ کرامؓ سے فیض صحبت اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ان سب کا علم چھ بزرگوں کی طرف لوٹتا ہے، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہؓ بن مسعود، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت ابو الدرداءؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت، پھر میں نے ان چھ بزرگوں سے شرف صحبت حاصل کیا تو دیکھا کہ ان سب کا علم

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود پر ختم ہو گیا ہے (طبقات ابن سعد جلد ۲ صہ۲۵، تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۴ و مقدمہ ابن الصلاح ص ۲۶۲ مع شرح العراقیؒ) امام حاکمؒ نے بھی امام مسروقؒ سے یہ روایت نقل کی ہے، اس میں انہوں نے حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابیؓ بن کعب، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ کا نام لیا ہے (مستدرک جلد ۳ صہ۴۶۵ سکت عنہ الحاکمؒ والذہبیؒ) امام شعبیؒ (المتوفی ۱۰۳ھ جو امام حافظ، فقیہ، متقن اور علامۃ التابعین تھے۔ تذکرہ جلد ۱ صہ۷۴) کا بیان ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرات صحابہؓ میں دینی مسائل میں فیصلہ کرنیوالے چھ حضرات تھے۔ تین مدینہ طیبہ میں اور ان کے نام یہ ہیں: حضرت عمرؓ، حضرت ابیؓ بن کعب اور حضرت زیدؓ بن ثابت اور تین کوفہ میں، ان کے اسماء یہ ہیں، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ (مستدرک جلد ۳ ص ۴۶۵ وسکتا عنہ)

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ دینی مسائل کی ترویج اور اشاعت کے لحاظ سے صحابہ کرامؓ کے تین طبقات تھے، پہلا طبقہ وہ ہے جس سے مسائل تو رائج ہوئے ہیں مگر کم۔ اور دوسرا طبقہ متوسط رہا ہے اور تیسرا طبقہ وہ ہے جن سے دین کی بہت زیادہ اشاعت اور ترویج ہوتی ہے۔ ان میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۱۱) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جن حضرات صحابہ کرامؓ سے دین، علم اور فقہ کی اشاعت ہوئی ہے ان میں حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ پیش پیش تھے۔ (الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ صہ۵)۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ ان حضرات میں بیشتر وہ ہیں جو امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ ؎

وفاؤں کے ہزاروں تیرے چکے ہیں امتحان اب تک

مگر وہ ہیں کہ اس پر بھی ہیں ہم سے بدگماں اب تک

حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ وغیرہ کی صحیح اور مرفوع حدیثیں عرض کی جا چکی ہیں، اسی طرح

حضرت ابوالدرداءؓ کی صحیح اور مرفوع روایت بھی پیش کی جاچکی ہے اور اس کے موقوف تسلیم کرنے میں تو فریق ثانی کو بھی کسی طرح کا کوئی تامل نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا صـ۵۲۵ میں یہ کہنا کہ یہ ان کا اپنا خیال تھا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کے مقابلہ میں خیال پر اڑے رہنا ٹھیک نہیں ہوتا، اس لیے انھوں نے اس پہلے قول سے رجوع کیا۔ بالکل ایک بے بنیاد دعوےٰ ہے۔ کسی صحیح روایت سے ان کا رجوع ثابت نہیں۔ لفظوں کے ہوائی قلعہ سے کچھ نہیں بنتا اور اس کے خلاف جو روایت ان سے آتی ہے اس کا ذکر جلد دوم میں آئے گا۔ انشاءاللہ العزیز۔ اب اس کے بعد بعض حضرات صحابہ کرام رضؓ اور تابعین رحؒ و اتباع تابعینؒ کی بعض روایتیں اور آثار سُن لیجئے:

اثر حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ (المتوفی ۷۴ھجری) امام مالکؒ نافعؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

ان عبد اللہؓ بن عمرؓ کان اذا سئل ھل یقرأ احد خلف الامام قال اذا صلّٰی احدکم خلف الامام فحسبہ قرأۃ الامام و اذا صلّٰی وحدہ فلیقرأ و کان ابن عمرؓ لا یقرأ خلف الامام۔
(موطا امام مالکؒ صـ۲۹ و دارقطنی صـ۱۵۲ جلد۱ وغیرہ)

کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے جب یہ سوال کیا جاتا تھا کہ کیا امام کے پیچھے کوئی نمازی قرأت کرسکتا ہے؟ تو وہ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی آدمی امام کی اقتداء کرچکے تو اس کو امام کی قرأت ہی کافی ہے اور جب کوئی اکیلا نماز پڑھے تو اس کو قرأت کرنی چاہئے اور ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے

امام مالکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے۔ نافعؒ الامام اور العلم تھے۔ (تذکرہ، جلد۱ صـ۹۴) امام بخاریؒ کا بیان ہے کہ اصح الاسانید یہ ہے مالکؒ عن نافعؒ ابن عمرؓ (ایضاً) اس سے زیادہ قوی سند فن حدیث میں تقریباً محال ہے، حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الفقیہ اور احد الاعلام فی العلم والعمل تھے۔ وہ اپنی علمی اور عملی قابلیت کی بنا پر خلافت اور حکومت کے

مستحق تھے۔ (ایضاً جلد ۱ ص۳۵) بہر حال یہ روایت صحیح ہے اور قاسمؒ بن محمدؒ فرماتے ہیں کہ

کان ابن عمرؓ لا یقرأ خلف الامام جہر  عبداللہؓ بن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے

اولم یجہر۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۳۶)  تھے۔ امام جہر سے پڑھتا یا آہستہ (وہ خاموش رہتے تھے)

اور میر صاحبؒ کو بھی اقرار ہے کہ موطا کی مسند روایت صحیح ہوتی ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص۵۲ میں لکھتے ہیں کہ یہ اثر صحیح ہے۔

اِعتراض: مُبارکپوری صاحبؒ سے جب اس کی سند پر کلام کرنے کی جرأت بھی نہ ہو سکی اور چونکہ حضرت ابن عمرؓ حدیث رفع یدین کے راوی تھے۔ اِس لیے اس روایت کو اپنے حال پر چھوڑ کر آگے نکلنا بھی گوارا نہ ہو سکا۔ تو زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی ٹھان کی۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کے اس اثر کا حضرت عمرؓ کے اثر سے (جو دارقطنی جلد ۱ ص۱۲۰ وغیرہ میں ہے) تعارض ہے کہ انھوں نے امام کے پیچھے قرآت کرنے کی اجازت دی تھی اور چونکہ حضرت عمرؓ اپنے بیٹے ابن عمرؓ سے سنت کے زیادہ بڑے عالم تھے، (کاش کہ مبارکپوری صاحبؒ اپنے اس خود ساختہ قاعدہ پر ہی قائم رہتے تو بھی ایک بات تھی۔ صفدر) اس لیے حضرت عمرؓ کے اثر کو ابن عمرؓ کے اثر پر ترجیح ہوگی۔ (ابکار المنن ص۱۶۵)

جواب: اگر تعارض کا یہی مفہوم ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ سے لاکھوں بلکہ کروڑوں درجے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سنت کے زیادہ عالم تھے۔ اس لئے جب آپ نے امام کے پیچھے قرآت سے منع کیا ہے، تو حضرت عمرؓ کے اثر پر آپکے ارشاد کو بہر حال ترجیح ہوگی، حضرت عمرؓ کا ایک اثر عنقریب ترک قرآت خلف الامام پر ذکر ہوگا اور جس اثر کا مُبارک پوری صاحبؒ نے حوالہ دیا ہے تو اس کی حقیقت بھی اپنے مقام پر واضح ہوگی۔ تعجب ہے کہ مبارکپوری صاحبؒ کا وجود بھی اجتماع نقیضین سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ یہاں تو یہ لکھ کر وقت پاس کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا اپنے بیٹے ابن عمرؓ سے مجرد اعلم بالسنۃ ہونا اس کا مقتضی نہیں کہ حضرت عمرؓ کے اثر کو ابن عمرؓ کے اثر پر ترجیح دی جا سکے۔ (ابکار المنن ص۲۲۴)

شاید مولانا مُبارک پوری صاحبؒ کو جلدی سے پینترا بدلنے کا خاص لطف محسوس ہوتا

ہوگا - اور وہ ایسی رکیک اور بعید از قیاس توجیہ کر کے دل میں خوشی مناتے ہوں گے کہ

ع : کہ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مؤلف خیر الکلام نے اس صحیح اثر کا تقابل ان آثار سے کیا ہے جو کتاب القرأۃ ص۶۴ اور ص۶۵ میں حضرت ابن عمرؓ سے اس کے خلاف آئے ہیں اور مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ یہ اثر بھی صحیح ہے اس پر مفصل بحث گذر چکی ہے (ص۵۲) اور یہ بحث انھوں نے ص۳۲۲ میں کی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان آثار میں سے ایک اثر کی سند میں ابو جعفرؒ رازی عیسٰی بن ماہانؒ جو متکلم فیہ ہے مگر حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے صدوق ہے اور ایک کا راوی یحییٰ بکاءؒ ہے وہ ضعیف ہے مگر ابن سعدؒ نے کہا ہے انشاء اللہ ثقہ ہے - الخ

**الجواب :** جب ہمارا پیش کردہ اثر آپ کے اقرار سے بھی صحیح ہے تو اس کے مقابلہ میں ضعیف راویوں کی روایتیں لے کر تنکوں کا پُل بنانا کہاں کا انصاف ہے ؟ بس صحیح لے لیں اور ضعیف کو چھوڑ دیں یہ دونوں راوی نرے متکلم فیہ نہیں بلکہ بہت زیادہ کمزور ہیں پھر کس قدر افسوس ہے کہ آپ ان کے اثر کو بھی صحیح کہ رہے ہیں پھر صراحت وابہام وغیرہ کی وجہ سے ترجیح دینا نری شعبدہ بازی ہے - صحیح اثر اور ضعیف کا کیا تقابل ؟

**اثر حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ** (المتوفی ۷۴ھ) ان کا اثر بسند صحیح حدیث نمبر۱۱ کے ذیل میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأت کے قائل نہ تھے ، مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ یہ اثر صحیح ہے (ص۵۱۹) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ صرف رکوع والی رکعت کو بدون فاتحہ صحیح سمجھتے تھے اور یہ روایت اسی پر محمول ہے اور اصول فقہ حنفیہ کی رُو سے مستثنٰی میں کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا لہٰذا مقتدی کے لیے اس سے وہ کوئی حکم ثابت نہیں کر سکتے (محصلہ ص۵۳۱)

**الجواب :** حرف مَنْ مؤلف مذکور کے نزدیک ویسے عام ہے اور ہمارے نزدیک بھی یہاں شرطیہ ہونے کی وجہ سے عام ہے اور رکعۃً نکرہ ہے اور ساتھ موصوفہ اور خود مؤلف مذکور کے نزدیک نکرہ موصوفہ عام ہوتا ہے - (ملاحظہ ہو ص۸۳) پھر اس تخصیص کو کون مانتا ہے ؟ غرضیکہ حضرت جابرؓ ہر رکعت میں اور ہر ایسے نمازی کے لیے جو مقتدی ہو یہ حکم بیان

فرماتے ہیں اور مؤلف مذکور کا یہ لکھنا کہ اصول فقہ حنفیہ میں مستثنیٰ میں کوئی حکم نہیں ہوتا بالکل بے خبری پر مبنی ہے کیونکہ یہ بعض اصولیوں کا مسلک ہے۔ توضیح صہ ۲۹۵ سے صہ ۲۹۸ تک اس پر مبسوط بحث موجود ہے کہ استثناء میں حکم نفی سے اثبات اور اثبات سے نفی ہوتا ہے لہٰذا یہاں مقتدی کے لیے نفی فاتحہ کا حکم بطریق منطوق ثابت ہے جیسے کلمہ توحید میں الا اللہ ثابت ہے۔ مبارکپوری صاحب نے یزید فقیر رح کے اثر سے اس کا معارضہ کیا ہے مگر اس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔ علامہ ذہبی رح لکھتے ہیں کہ حضرت جابر رض بلند پایہ فقیہ اور مدینہ طیبہ کے مفتی تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے انھوں نے بہت سے مفید علوم حاصل کیے تھے۔ (تذکرہ ۱ صہ ۴۰) اگر سورۃ فاتحہ کے بغیر مقتدیوں کی نماز نہیں ہوتی، تو حضرت جابر رض کو مرکز توحید و سنت کا مفتی کیسے انتخاب کر لیا گیا تھا، جو اس کے مخالف اور منکر تھے۔

اثر حضرت زید رض بن ثابت (المتوفی ۴۵ھ) امام نسائی رح فرماتے ہیں کہ ہم سے علی[1] بن حجر رح نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیل[2] بن جعفر رح نے بیان کیا۔ وہ یزید[3] رح بن خصیفہ سے اور وہ یزید[4] بن عبداللہ رح بن قسیط رح سے اور وہ عطاء[5] بن یسار رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت زید بن ثابت سے دریافت کیا؟ کیا امام کے ساتھ قرأت کی جا سکتی ہے؟

---

[1] علامہ ذہبی رح ان کو الحافظ الکبیر اور نسائی رح ثقہ و مامون اور حافظ اور خطیب ان کو صادق، متقن اور حافظ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ صہ ۳۳)

[2] علامہ ذہبی رح ان کو الامام، العالم اور الثقہ لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۱ صہ ۲۳۱)

[3] امام احمد رح، ابو حاتم رح اور نسائی رح ان کو ثقہ، ابن معین رح ان کو ثقہ اور حجت۔ ابن سعد رح ان کو ثبت اور کثیر الحدیث اور حافظ ابن حجر رح ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صہ ۳۴۰)

[4] ابن معین رح ان کو لا باس بہ نسائی رح ان کو ثقہ ابن عدی رح ان کو مشہور ابراہیم رح بن سعد رح ان کو فقیہ اور ثقہ اور کثیر الحدیث اور ابن عبدالبر رح ان کو ثقہ من الثقات کہتے ہیں (ایضاً صہ ۳۴۲)

[5] علامہ ذہبی رح ان کو الامام الربانی اور الفقیہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور جلیل اور علم کا ظرف تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ صہ ۸۴)

قال لا قراۃ مع الامام فی شیئ۔ انھوں نے جواب ارشاد فرمایا کہ امام کے ساتھ کسی نماز میں کوئی قرأت نہیں کی جا سکتی۔

(نسائی جلد ۱ ص۱۱۱، مسلم جلد ۱ ص۲۱۵، ابو عوانہ جلد ۲ ص۲۰۶، طحاوی ۱ ص۱۲۴)

حضرت زیدؓ بن ثابت کا یہ بسند صحیح اثر اس امر کی واضح دلیل ہے کہ امام کے ساتھ مقتدی کو کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت کرنے کا حق نہیں ہے اور ان کی ایک روایت یوں ہے: من قرأ خلف الامام فلا صلوٰۃ لہ (موطا امام محمدؒ ص۱۰۰ وکتاب القرأۃ ص۱۴۷) کہ جس نے امام کے پیچھے قرأۃ کی تو اس کی نماز نہیں ہوتی۔ امام طحاویؒ رح فرماتے ہیں کہ ہم سے یونس بن رح عبد الاعلیٰؒ رح نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہؒ بن وہبؒ نے بیان کیا وہ حیوۃؒ بن شریحؒ سے اور وہ بکرؒ بن عمروؒ سے اور وہ عبید اللہؒ بن مقسم رح سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے قرأت خلف الامام کے بارے میں:

انہ سال عبد اللہ رضؓ بن عمر رضؓ و زید رضؓ بن ثابت وجابر رضؓ بن عبد اللہ رضؓ فقالوا لا تقرؤا خلف الامام فی شیئ من الصلوٰۃ۔ (طحاوی جلد ۱ ص۱۲۹ وزیلعی جلد ۲ ص۱۲ واسنادہ صحیح) حضرت عبد اللہؓ بن عمر رضؓ، حضرت زید رضؓ بن ثابت اور حضرت جابر رضؓ سے سوال کیا۔ ان سب نے فرمایا کہ امام کے پیچھے تمام نمازوں میں کوئی قرأت نہ کرو۔

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ و زید رضؓ بن ثابت گفتہ لا قرأۃ مع الامام فی شیئ رواہ مسلم وعن جابر رضؓ بمعناہ وھو قول علی رضؓ وابن مسعود رضؓ وکثیر من الصحابہؓ (ھدایۃ السائل ص۱۹۳) اور امام بخاری رح فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضؓ، حضرت زید رضؓ بن ثابت اور حضرت ابن عمر رضؓ امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ (جزء القرأۃ ص۳) علامہ ذہبی رح لکھتے ہیں کہ حضرت زید رضؓ بن ثابت کاتب وحی تھے۔ اور قرآن کریم کے جمع

---

لہ امام طحاوی رح کا ذکر آئے گا، ابن وہبؒ کا ترجمہ حدیث نمبر ۱ میں گذر چکا ہے۔ یونسؒ بن عبد الاعلیٰؒ کو امام ابو حاتم رح اور نسائی رح ثقہ کہتے ہیں۔ علیؒ بن الحسن رح اور مسلمہ رح بن قاسم رح ان کو حافظ حدیث کہتے ہیں۔ ابن حبان رح ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص۴۴۱) حیوۃؒ بن شریح رح الامام القدوۃ شیخ دیار المصریۃ اور کبیر الشان تھے (تذکرہ جلد ۱ ص۱۷۱) بکرؒ بن عمرو رح کو ابو حاتم رح شیخ اور ابن یونس رح صاحب عبادت

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کرنے کی خدمت ان کے سپرد کی گئی تھی، حضرت عمر رضہ جب حج وغیرہ کے لیے تشریف لے جاتے تو ان کو اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کر کے جاتے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ صہ ۲۹) اور نواب صاحبؒ کے بیان سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے ترک قرأت بعض یا چند حضرات صحابہ کرام رضہ کا عمل اور فتویٰ نہ تھا بلکہ اس مسلک پر حضرات صحابہ کرام رضہ کی بھاری اکثریت تھی۔ وکثیر من الصحابۃ رضی اللہ عنہم۔

**اعتراض:** امام بیہقی رحہ، امام نووی رحہ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ نے اس اثر کی یہ تاویل کی ہے کہ اس اثر میں قرأت سے مراد ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت ہے یا قرأت سے جہر مراد ہے (بیہقی جلد ۲ صہ ۱۹۳، شرح مسلم جلد ۱ صہ ۲۱۵ و ابکار المنن صہ ۱۹۶)

**جواب:** یہ تاویل قطعاً باطل ہے کیونکہ اگر قرآن کریم اور کسی صحیح حدیث سے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت ثابت ہوتی تو تطبیق کے لیے یہ تاویل اختیار کی جا سکتی تھی۔ حالانکہ قرآن کریم اور صحیح و مرفوع حدیثوں سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ امام کے پیچھے عام قرأت تو کیا جائز ہوتی سورۃ فاتحہ اور ام القرآن پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے، باقی حضرت عبادہ رضہ بن الصامت وغیرہ کی روایتوں کا ذکر بسط اور تفصیل کے ساتھ اپنے مقام پر آئے گا۔ کہ خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ اور جو حدیثیں صحیح ہیں۔ وہ صرف امام اور منفرد کے حق میں ہیں، فریق ثانی کی یہ ستم ظریفی بھی قابل داد ہے کہ ایک طرف تو لا صلوٰۃ الخ کی روایتوں میں نکرہ پر لائے نفی جنس کو داخل سمجھ کر کے اتنی تعمیم مراد لی جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کے اسلامی کتب خانوں کی کسی کتاب سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جا سکتی اور دوسری طرف لا قرأۃ مع الامام فی شئ اور لا یقرأ خلف الامام فی شئ من الصلوٰۃ کو ایسا مقید کیا جاتا ہے کہ باوجودیکہ سورۃ فاتحہ ام القرآن اور قرآن عظیم ہے، مگر اس کی قرأت پر نہ تو لا نفی جنس اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اور نہ لفظ شئ اور یہ عجیب تر بات ہے کہ لا صلوٰۃ الخ میں نفی کمال تو مراد نہیں لی جا سکتی مگر یہاں لا قرأۃ مع الامام فی شئ میں نفس قرأت سے جہر مراد ہو سکتی ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! اور ان تینوں حضرات رضہ سے بیک وقت سوال ہوتا ہے اور وہ اس کی اجازت نہیں

---

(بقیہ پچھلا صفحہ) و فضیلت اور دارقطنی رحہ معتبر کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں اور یہ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ صہ ۴۸۶) اور عبید اللہؒ بن مقسمؒ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب صہ ۲۵۳)

دیتے کہ امام کے پیچھے کسی قسم کی کوئی قرأت کی جا سکے۔ اور ان میں حضرت جابرؓ بھی ہیں، جو ببانگ دہل قرأت سے ام القرآن کی قرأت مراد لیتے ہیں، بہرحال ان حضرات کی یہ تاویل قواعد اور اصول کے نیز صحیح احادیث کے خلاف ہوتے ہوئے۔ بعید از انصاف ہے، جو کسی طرح توجہ کی مستحق نہیں ہے اور صحیح اور مرفوع حدیثوں اور خود حضرت جابرؓ کے قول صریح کے مقابلہ میں یہ تاویل اس کی زیادہ مستحق ہے کہ ؎:

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

**اثر حضرت عبداللہؓ بن مسعود:** امام ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوالاحوصؒ[1] نے بیان کیا۔ وہ منصورؒ سے اور وہ ابووائلؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے دریافت کیا:

| | |
|---|---|
| اقرأ خلف الامام فقال ان فی الصلوٰۃ شغلا وسیکفیک قرأۃ الامام (الجوہر النقی جلد ۱ ص ۱۷۰) | کیا میں امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں، حضرت عبداللہؒ نے فرمایا کہ نماز میں امام قرأت میں مشغول ہے اور تجھے امام کی قرأت ہی کافی ہو جائے گی۔ |

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں چنانچہ علامہ ہیثمیؒ کہتے ہیں ورجالہ موثقون۔ (مجمع الزوائد جلد ۲ صفحہ ۱۱۰) کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور مؤلف خیر الکلام ص ۵۷۱ میں لکھتے ہیں کہ صحیح ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اثر مطلق ہے۔ اس میں فاتحہ کا بالخصوص ذکر نہیں... الخ

**الجواب:** مطلق کی نفی سے مقید کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلہ میں نہ تو ان کا کوئی اثر صحیح ہے اور نہ ام الکتاب کی تصریح ہے پھر کیوں اس صحیح اثر کو رد کیا جاتا ہے؟ اس کے صحیح نہ ہونے کی بحث جلد دوم میں آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔ علاوہ ازیں اس کو مطلق (کہ فاتحہ کو نہ شامل نہ ہو) کہنا بھی درست نہیں کیونکہ ایک روایت

---

[1] امام ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ کا ترجمہ حدیث نمبر ۱۳ میں اور منصورؒ و ابووائلؒ کا باب اوّل میں حضرت ابن مسعودؓ کے اثر کے ذیل میں نقل کیا جا چکا ہے۔ ابوالاحوصؒ کا نام سلامؒ بن سلیمؒ تھا۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور احد الثقات لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۳۰)

میں یوں تصریح آتی ہے جو بطور تائید پیش کی جارہی ہے۔

ان ابن مسعود رض کان لا یقرأ خلف الامام فیما یجھر فیہ وفیما یخافت فیہ فی الاولیین ولا فی الاخریین و اذا صلی وحدہ قرأ فی الاولیین بفاتحۃ الکتاب وسورۃ ... الخ

(موطا امام محمد ص۹۶)

کہ عبد اللہ ابن مسعود امام کے پیچھے نہ جہری نماز میں قرأۃ کرتے تھے اور نہ سری نماز میں نہ پہلی دو رکعتوں میں اور نہ پچھلی دو رکعتوں میں اور جب اکیلے نماز پڑھتے تھے تو پہلی دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ بھی پڑھتے اور دیگر کوئی اور سورت بھی۔

ان کی اس مفصل روایت سے معلوم ہوا کہ قرأت میں فاتحہ خصوصیت سے شامل ہے۔

اس کی سند یوں ہے: محمد رح بن ابان بن صالح القرشی رح (اس پر محدثین کرام رح نے کلام کیا ہے، مگر مؤلف خیر الکلام وغیرہ کی صریح عبارات عرض کی جاچکی ہیں کہ تائید اور متابعت میں ضعیف حدیث بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا اس کو تائید اور متابعت میں پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے)

عن حماد رح عن ابراھیم رح عن علقمۃ بن قیس رح ان عبد اللہ بن مسعود رض ... الخ

باقی تمام راوی ثقہ ہیں اور علقمہ بن قیس کے اثر میں ان کے تراجم آرہے ہیں۔ امام بیہقی رح نے حضرت ابن مسعود رض کا ایک اثر یوں نقل کیا ہے

لان اعض علی جمر الغضا احب الی من ان اقرأ خلف الامام۔

(کتاب القرأۃ ص۱۱۶)

یعنی یہ کہ میں جنڈ درخت کے جلتے کوئلوں کو منہ میں پکڑوں مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کروں اور پڑھوں — (اور ظاہر ہے کہ قرأت فاتحہ ہی سے شروع ہوتی ہے)

دوسری سند: امام بیہقی رح فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ رح اور ابو سعید رح بن ابی عمرو نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو العباس محمد[1] بن یعقوب رح نے بیان

---

[1] حافظ ابو عبد اللہ رح اور شعبہ رح کا ترجمہ باب اول میں حضرت مجاہد رح کے اثر کے ذیل اور ابن مہدی رح کا سعید بن المسیب کے اثر کے تحت اور ثوری کا مقدمہ میں گذر چکا ہے۔ ابو العباس کو علامہ ذہبی الامام الثقۃ محدث المشرق لکھتے ہیں (ایضاً ۳ ص۶۳)

کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ہارونؒ رح بن سلیمان رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبدالرحمٰن رح بن مہدیؒ نے بیان کیا وہ سفیان (ثوریؒ) سے اور شعبہ رح سے روایت کرتے ہیں وہ دونوں منصورؒ سے اور وہ ابو وائل رح سے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ رضؓ بن مسعود سے سوال کیا:

عن القراۃ خلف الامام فقال انصت للقراٰن فان فی الصلوٰۃ شغلاً وسیکفیک ذلک الامام۔
(سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۶۰)

کہ کیا امام کے پیچھے قرأت کی جا سکتی ہے؟ حضرت عبداللہ رضؓ نے فرمایا کہ قرآن کے لیے خاموش رہو۔ امام نماز کے اندر قرأت میں مشغول ہے۔ اور تجھے امام کی قرأت کافی ہے۔

حضرت ابن مسعود رضؓ کے ان صحیح آثار سے معلوم ہوا کہ وہ تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے، ان کا ترجمہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ان پر کلی اعتماد باب اوّل میں وضاحت اور صراحت سے گذر چکا ہے۔

**اعتراض:** امام بیہقیؒ کہتے ہیں: (۱) حضرت ابن مسعود رضؓ نے انصات کا حکم دیا ہے اور انصات جہری نمازوں میں ہو سکتا ہے۔

(۲) علقمہؒ کا بیان ہے کہ میں نے نماز میں حضرت ابن مسعود رضؓ کو قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا پڑھتے سنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرأت کے قائل تھے۔

(۳) عبداللہؒ بن زیاد اسدیؒ کا بیان ہے کہ میں نے ظہر اور عصر کی نماز میں ابن مسعود رضؓ سے قرأت سنی ہے۔ (سنن الکبریٰ وکتاب القراۃ)

**جواب:** امام بیہقی رح کے اعتراض کی جملہ شقیں مردود ہیں علی الترتیب جواب سن لیجئے

(۱) حضرت ابن مسعود رضؓ تمام سری اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہ تمام حضرات فقہاءؒ اور محدثین رح کے نزدیک مشہور و معروف ہے۔ (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۸۳) انصات کی پوری تحقیق باب اوّل میں آیت کے ذیل میں عرض کی جا چکی ہے اور فریق ثانی کا

---

[۱] یہ امام ابو العباس رح کے جلیل القدر شیخ اور مشہور محدث تھے (دیکھئے تذکرہ جلد ۲ ص ۲۳۰) علامہ ذہبیؒ ان کی سند کو صحیح سمجھتے ہیں (ایضاً جلد ۱ ص ۳۰۲)

شبہ اور مغالطہ بھی نکال دیا گیا ہے وہاں ہی ملاحظہ کرلیں، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) امام بیہقی رحہ نے اس قول کی کوئی سند نقل نہیں کی اور خود امام بیہقی رحہ کا ارشاد ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ہرگز مکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین، مجہول نامعتبر اور غیر معلوم راویوں سے اخذ کریں۔ (کتاب القرأۃ ص۱۲۷ طبع دہلی) علاوہ بریں اس روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ ابن مسعود رحہ نے امام کے پیچھے یہ آیت پڑھی تھی۔ اور اس کا بھی کوئی ذکر نہیں کہ قیام کی حالت میں پڑھی تھی۔ کیوں یہ ممکن نہیں کہ سجدہ یا تشہد وغیرہ میں بطور دعا یہ آیت پڑھی ہو۔ اور مزید برآں اس آیت سے اُم القرآن اور فاتحۃ الکتاب کے خاص لفظ پر استدلال کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟

(۳) عبداللہ رحہ بن زیاد اسدی رحہ کی روایت پر روایۃً اور درایۃً کلام اپنے موقع پر عرض کیا جائیگا۔ انشاء اللہ العزیز۔

**تیسری سند:** حضرت ابن مسعود رضہ سے تیسری سند کے ساتھ یہ الفاظ مروی ہیں:

| | |
|---|---|
| قال انصت للقرأۃ فان فی الصلوۃ شغلا و سیکفیک ذلک الامام (طحاوی جلد ۱ ص۱۲۹، مجمع الزوائد جلد ۲ ص۱۹۵، کتاب القرأۃ ص۱۱۶، موطا امام محمد ص۹۶، فتاوی ابن تیمیۃ ۲ ص۱۴۵ و آثار السنن جلد ۱ ص۸۹ وغیرہ۔ | فرمایا قرأت کے لیے خاموش رہو کیونکہ نماز میں امام قرأۃ میں مشغول ہوتا ہے اور وہی امام تمہارے لیے کافی ہے۔ (تمہیں الگ قرأت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔) |

**اعتراض:** مبارک پوری صاحب رحہ لکھتے ہیں: (۱) سند میں وہیب رحہ بن خالد رحہ ہے، حافظ ابن حجر رحہ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھا۔ لکنہ تغیر قلیلا باخرہ (تقریب ص۳۸۸) آخر عمر میں تھوڑا سا تغیر ان کے حافظہ میں آچکا تھا۔

(۲) اس اثر کی سند میں نصر رحہ بن مرزوق رحہ ہے اور مجھے اس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔

(۳) اس میں خصیب رحہ واقع ہے نہ معلوم وہ کون اور کیسا تھا؟ (ابکار المنن ص ۱۹۵)

**جواب:** یہ تمام شقیں باطل ہیں: (۱) ثقہ اور ثبت راوی کا تغیر یسیر اور قلیل مضر نہیں ہے جیسا کہ گذر چکا ہے۔

(۲) خصیبؒ سے خصیبؒ بن ناصح رح مراد ہیں۔ امام ابوزرعہ رح فرماتے ہیں ما بہ بأس انشاء اللہ اور ابن حبان رح ان کو ثقات ہیں لکھتے ہیں (تہذیب جلد ۳ صد ۱۴۳)

(۳) نصرؒ بن مرزوق رح کا ترجمہ اگر مبارک پوری صاحبؒ کو نہیں ملا تو کیا حرج ہے۔ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں رجالہٗ موثقون (مجمع الزوائد جلد ص ۱۸۵) اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور علامہ نیموی رح لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے (آثار السنن جلد ا ص ۸۹) اور باقرار مبارکپوری صاحبؒ نہ جاننے والوں پر جاننے والوں کو ترجیح ہوا کرتی ہے۔ قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں ومن علم حجۃ علی من لا یعلم (نیل الاوطار جلد ا ص ۳۴۲) کہ جاننے والا نہ جاننے والے پر حجت ہے، یعنی جاننے والے کی بات نہ جاننے والے کی بات پر راجح ہوگی۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ کی بعض صحیح روایتیں باب اول میں نقل کی جا چکی ہیں اور متعدد سندیں ان سے اور بھی مروی ہیں۔ مگر ہمارا مقصد تمام روایات و آثار کا استیعاب نہیں صرف اپنے دعوای کو روشن کرنا ہے۔

## اثر حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ: امام طحاویؒ رح فرماتے ہیں کہ ہم سے

لہ امام طحاویؒ ابو جعفر احمد بن محمدؒ بن سلامہ الحنفیؒ (المتوفی ۳۲۱ھ) علامہ ذہبی رح لکھتے ہیں کہ وہ الامام العلامہ اور الحافظ تھے اور انھوں نے بہترین کتابیں لکھی ہیں، محدث ابن یونسؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ، ثبت فقیہ اور بڑے عقلمند تھے۔ اور انھوں نے اپنے بعد کوئی اپنا نظیر نہیں چھوڑا۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۰) مسلمہؒ بن قاسم رح کا بیان ہے کہ وہ ثقہ جلیل القدر، فقیہ البدن اور علماء کے اختلافات کے جاننے میں بڑی مہارت رکھتے تھے (لسان المیزان جلد ا ص ۲۷۶) حافظ ابو عمر رح بن عبد البر کا بیان ہے کہ وہ تمام فقہاء کے مذاہب پر گہری نگاہ رکھنے والے تھے۔ (الجواہر المضیہ جلد ا ص ۱۰۵) امام ابن ندیم رح فرماتے ہیں کہ وکان اوحد اھل زمانہ علما و زھدا (الفہرست لابن ندیم ص ۳۰۶) کہ وہ اپنے زمانہ میں علم و زہد میں یکتا تھے اور حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں: امام الحنفیۃ فی وقتہ فی الحدیث والفقہ ومعرفۃ اقوال السلف۔ اھ (اجتماع جیوش الاسلامیۃ ص ۹۶) کہ وہ اپنے وقت میں حدیث فقہ اور معرفت اقوال سلفؒ میں احناف کے امام تھے۔

ابراہیم رحمۃ بن ابی داؤد نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو صالح عبدالغفار بن داؤد الحرانی نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حمادؒ بن سلمہؒ نے بیان کیا۔ وہ ابو حمزہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ رضؓ بن عباس رضؓ سے سوال کیا۔

اقرأ والامام بین یدی قال لا۔ یعنی کیا امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں ؟ حضرت ابن عباس رضؓ نے ارشاد فرمایا۔ ہرگز نہیں۔

(طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹ والجوھر النقی جلد ۲ ص ۱۷۰ و آثار السنن جلد ۱ ص ۸۹ وغیرہ)

اس صحیح روایت میں سری اور جہری کی کوئی قید موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ تمام نمازوں کو شامل ہے اور یہی حضرت ابن عباس رضؓ کا مسلک تھا۔

**اعتراض:** مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں:

(۱) حمادؒ بن سلمہؒ کا آخر عمر میں حافظہ کچھ خراب ہو گیا تھا۔

(۲) عیزارؒ حضرت ابن عباسؓ سے اجازت قرأت خلف الامام کی روایت نقل کرتے ہیں اور اس کی سند بالکل بے غبار ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۲۶)

**جواب:** یہ اعتراض بھی باطل ہے: (۱) تغیر یسیر کا محقق حکم پہلے لکھا جا چکا ہے اور حمادؒ بن سلمہ کا ترجمہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ امام احمدؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ جو شخص حمادؒ بن

---

[۱] حافظ ابن حجرؒ ان کو من الحفاظ المکثرین لکھتے ہیں (لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۷۵) کہ وہ حفاظ حدیث میں شمار ہوتے ہیں جن سے بکثرت حدیثیں مروی ہیں۔ علامہ یاقوت حموی رحؒ فرماتے ہیں کہ ۲۷۰ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے اور وہ ثقہ اور حفاظ حدیث میں تھے۔ محدث ابن یونس رحؒ ان کو ثقہ اور من حفاظ الحدیث کہتے ہیں۔ علامہ سمعانی رحؒ بھی ان کو ثقہ اور من حفاظ الحدیث کہتے ہیں اور امام ابن عساکرؒ بھی ان کو ثقہ من حفاظ الحدیث کی صفت سے یاد کرتے ہیں۔ (امانی الاحبار جلد ۱ ص ۷)

[۲] وہ ثقہ اور فقیہہ تھے۔ (تقریب ص ۲۴۳)

[۳] ان کی توثیق باب اول میں سعید رحؒ بن المسیبؒ کے اثر کے تحت نقل ہو چکی ہے۔

[۴] ان کا نام نصر رحؒ بن عمران رحؒ تھا جو ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۷۳) حضرت ابن عباس رضؓ جلیل القدر صحابی ہیں۔

سلمہؒ پر اعتراض کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس کے اسلام میں متہم سمجھو۔ اصل الفاظ یہ ہیں فاتھمہ علی الاسلام اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ گو کہ حمادؒ بن سلمہؒ امام است تفردش ما دام کہ در مرویش منافی از اصول نبود مضر نیست۔ (بدور الاہلہ ص۳۳)

(۲) یہ اپنے مقام پر عرض کیا جائے گا کہ عیزارؒ کی روایت میں کوئی غبار ہے یا نہیں؟ علاوہ بریں حضرت ابن عباسؓ کی بسند صحیح دو روایتیں باب اوّل میں نقل کی جا چکی ہیں۔

ایک اور روایت: حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے سوال کیا گیا۔

| | |
|---|---|
| قیل لہ ان ناسا یقرؤن فی الظھر والعصر فقال لو کان لی علیھم سبیل لقلعت السنتھم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرأ فکانت قرأتہ لنا قرأۃ وسکوتہ لنا سکوتا۔ (طحاوی جلد ۱ ص۱۲۱) | کہ کچھ لوگ ظہر اور عصر کی نماز میں قرآت کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ اگر میرا ان پر بس چلتا تو میں ان کی زبانیں کھینچ لیتا۔ کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآت کی ہمیں بھی قرآت کرنی چاہیے اور آپ نے سکوت اختیار کیا، ہمیں بھی سکوت کرنا چاہیے۔ |

اس اثر میں اگرچہ خلف الامام کی قید مذکور نہیں ہے۔ لیکن بادنیٰ تامل یہ بات بخوبی معلوم ہو سکتی ہے کہ امام اور منفرد کو تو بالاتفاق قرآت کرنا ضروری ہے۔ پھر نہ معلوم حضرت ابن عباسؓ جیسے

---

[1] اس اثر کی سند کے راوی یہ ہیں: (۱) امام طحاویؒ (۲) ابن مرزوقؒ، ان کا نام ابراہیمؒ بن مرزوقؒ تھا۔ امام نسائیؒ ان کو صالح اور لا بأس بہ کہتے ہیں دارقطنیؒ ان کو ثقہ یخطئ کہتے ہیں۔ ابن یونسؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ ابن ابی حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور سعیدؒ بن عثمانؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص۱۶۳ محصلہ)

(۳) وہبؒ بن جریرؒ ثقہ تھے (تقریب ص۲۸۸) (۴) جریرؒ بن حازمؒ ثقہ تھے۔ (ایضاً ص۶۶)

(۵) ابو یزید مدنی، ابو حاتمؒ، امام احمدؒ اور ابوداؤدؒ ان پر اعتماد کرتے تھے، ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۲ ص۲۸۰) حافظ ابن حجرؒ ان کو مقبول کہتے ہیں (تقریب ص۲۴۲) (۶) عکرمہؒ ثقہ تھے (ایضاً ص۲۶۸) (۷) حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ صحابی ہیں۔

ترجمان القرآن اور حبر الامۃ ان لوگوں کی زبانیں کھینچنے کے لیے کیوں آمادہ ہو گئے تھے؟ اگر ان کے بس اور قدرت میں ہوتا تو ضرور اپنا ارادہ پورا کر گذرتے، ناچار یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور حضرت ابن عباسؓ نے ان کی اس مذموم حرکت سے انتہائی نفرت کی اور یہ بھی مت بھولئے کہ پڑھنے والے ظہر اور عصر کی نماز میں پڑھتے تھے جو بالاجماع سرّی نمازیں ہیں اور یہ ممکن تھا کہ قرأت ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت پر محمل کر لیا جاتا، مگر اس کو کیا کیا جائے کہ حضرت ابن عباسؓ امام کے پیچھے مطلقاً قرأت کے قائل نہ تھے، اور گذر چکا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت میں امام کے پیچھے خاص لفظ فاتحۃ الکتاب کے پڑھنے کی ممانعت آئی ہے۔

اور یہ بھی درست نہیں ہو سکتا کہ قرأت کو جہر پر محمل کر لیا جائے، اس لیے کہ قرأت کا تقابل سکوت سے کیا گیا ہے اور سکوت کے معنیٰ آپ پہلے وضاحت کے ساتھ پڑھ چکے ہیں، بہر کیف خود اس اثر کے اندر ایسے قرائن موجود ہیں، جو اس امر کو متعین کر دیتے ہیں کہ یہ بحالتِ اقتدا امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے۔ جس پر حضرت ابن عباسؓ طیش میں آکر یہ ارشاد فرماتے ہیں۔ باقی اثر کے اس حصہ کا مطلب کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرأت کی اور ہمارے لیے آپ کی اقتدا ضروری ہے اور آپ نے سکوت بھی کیا۔ اور ہمارے لیے سکوت میں بھی آپ کی پیروی لازمی ہے۔ تو اس کی پوری بحث سکوت کے ذیل میں کی جا چکی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بحالتِ امامت قرأت کی اور بحالتِ اقتدا سکوت اختیار کیا۔ یا یہ مطلب ہو کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمارے امام تھے۔ اور آپ کی قرأت ہم سب مقتدیوں کی قرأت تھی۔ اور آپ کا پچھلی دونوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے بعد کی قرأت کو ترک کر کے اس سے سکوت اختیار کرنا ہمارے لیے کافی ہوتا تھا تو اس لحاظ سے حدیث من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ کی گویا یہ اثر تفسیر اور تشریح ہو گا۔ اس حصہ کا یہ مطلب ہو یا کوئی اور ہو ہمارا استدلال واضح ہے اور اس پر موقوف نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے صہ۱۳ میں ہمارے اس مطلب کو "ایک قسم کی تحریف معنوی ہے" سے تعبیر کیا ہے اور دلیل یہ بیان

کی کہ بخاری ؒ صفحہ ۱ کی روایت میں ابن عباسؓ سے آتا ہے قرأ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما امر وسکت فیما امر ... الخ امام بخاریؒ نے اس سے جہر مراد لی ہے اور اس پر باب الجھر بقرأۃ صلوٰۃ الصبح قائم کیا ہے اور پھر ص۳۱۹ اور ص۳۲۰ میں لکھتے ہیں کہ امام اسمٰعیلیؒ اور حافظ ابن حجرؒ یہ مطلب لیتے ہیں کہ ابن عباسؓ کو سری نمازوں میں قرأت کا شک تھا اور بعض روایتوں میں ہے کہ وہ نفی کرتے تھے مگر آخر میں قائل ہو گئے تھے لہٰذا اس سے مراد یا تو جہر ہے یا ان کا پہلا نظریہ ہے اور بعض حنفیہ کا مطلب قطعاً غلط ہے (محصلہ)

**الجواب:** مگر ہم نے استدلال بخاری کی روایت سے نہیں کیا بلکہ طحاوی کی روایت سے کیا ہے جس کے الفاظ اور ہیں اور اس میں تفصیل ہے اور ظہر اور عصر کی قید موجود ہے وہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ پہلے قرأت میں شک یا انکار کرتے تھے تو بات قدرے معقول ہے مگر اس کا صحیح ثبوت درکار ہے اور در صورت صحت امام بخاریؒ کی روایت کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے مگر ان سے سری نمازوں میں قرأت اور ترک القرأۃ خلف الامام کی روایتیں بالکل صحیح ہیں اور دوسری روایتیں اس پایہ کی نہیں ہیں اس لیے ان کے آئینہ میں ان صحیح روایات کا مطلب لینا غلط ہے۔

**اثر حضرات خلفاءِ راشدینؓ:** امام عبدالرزاق رحؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے موسیٰ بن عقبہؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| ان ابا بکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ کانوا ینھون عن القرأۃ خلف الامام (بحوالہ عمدۃ القاری جلد ۳ ص۶۷ و اعلاء السنن جلد ۴ ص۵۸) | کہ حضرت ابو بکرؓ (المتوفی ۱۳ھ) اور حضرت عمرؓ (المتوفی ۲۳ھ) اور حضرت عثمانؓ (المتوفی ۳۵ھ) امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے تھے۔ |

امام عبدالرزاق رحؒ اپنے مصنف میں داؤدؒ بن قیسؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ

---

۱؎ ثقہ اور حافظ تھے۔ (تقریب ص ۲۴۰)

۲؎ ثقہ اور فقیہ تھے (تقریب ۳۶۸) ثبت اور کثیر الحدیث تھے (تہذیب التہذیب ۱۰ ص۳۶۱) حجت اور صغار تابعینؒ میں تھے (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۱۴)

۳؎ امام شافعیؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں امام احمد رحؒ، ابو زرعہ رحؒ، نسائی رحؒ، ابو حاتم رحؒ (باقی اگلے صفحہ پر)

محمدؒ بن عجلانؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

قال علیؓ من قرأ مع الامام فلیس علی الفطرۃ۔

(بحوالہ الجوہر النقی جلد ۲ ص۱۶۹)

کہ حضرت علیؓ (المتوفی ۴۰ھ) نے فرمایا کہ جس شخص نے امام کے ساتھ قرآت کی تو وہ فطرت پر نہیں ہے۔

اور دار قطنی جلد ۱ ص ۱۲۶ کی روایت یوں ہے:

من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرۃ۔

کہ جس نے امام کے پیچھے قرآت کی اس نے فطرت کو کھو دیا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے داؤدؒ بن قیسؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن عجلانؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں:

ان عمرؓ بن الخطاب قال لیت فی فم الذی یقرأ خلف الامام حجرا

(موطا امام محمد ص۹۸)

کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے فرمایا۔ کاش جو شخص امام کے پیچھے قرآت کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر ڈالے جائیں۔

اور حافظ ابو عمرؒ بن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ:

ثبت عن علیؓ وسعدؓ وزیدؓ بن ثابت انہ قال لا قرأۃ مع الامام لا فیما اسر ولا فیما جہر

(بحوالہ الجوہر النقی جلد ۲ ص۱۶۹)

حضرت علیؓ اور حضرت سعدؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ امام کے ساتھ نہ سری نمازوں میں قرآت کیجا سکتی ہے اور نہ جہری نمازوں میں۔

حضرت علیؓ سے ایک دوسری روایت یوں مروی ہے، جو صرف متابعت کے طور پر نقل کی جاتی ہے:

من قرأ خلف الامام فلیس علی الفطرۃ۔

کہ جس شخص نے امام کے پیچھے قرآت کی وہ فطرت پر

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ابن سعدؒ، ابن مدینیؒ اور ساجیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن معینؒ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص۱۹۸)

ان کا ترجمہ باب دوم حدیث نمبر ۲ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

(طحاوی جلد ا ص ۱۲۹ و منتخب کنز العمال ص ۱۸۷) ہیں۔

اور گو موسیٰ بن عقبہؒ اور محمدؒ بن عجلانؒ کی روایتیں مرسل ہیں لیکن جمہور ائمہؒ کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے جس کی تحقیق پہلے گذر چکی ہے۔ یہی اعتراض مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۱۴ میں کیا ہے کہ یہ دونوں اثر ضعیف ہیں کیونکہ یہ دونوں مذکور راوی صغار تابعینؒ میں ہیں۔ حضرت عمرؓ سے ان کی لقاء ثابت نہیں ہے۔ (محصلہ) ہم بھی ان کو مرسل مانتے ہیں، مگر معتضد ہے جو حجت ہے اور مرسل معتضد کے حجت ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں اور یہ ایک دوسرے کے اعتضاد کے لیے کافی ہیں اور دوسری حدیثیں اس پر مستزاد ہیں، حضرت علیؓ کی دوسری روایت میں ابن ابی لیلیٰ رح اور مختار بن ابی لیلیٰ رح کمزور اور ضعیف ہیں۔ اور اسی وجہ سے مبارکپوری صاحبؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۰۹) مگر ہم نے اس سے استدلال نہیں کیا۔ بلکہ اس کو محض متابعت میں نقل کیا ہے، اور بقول مؤلف خیر الکلام ان میں بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں ہے۔ (ص ۲۱۶) حضرات خلفاء راشدین رضا اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، ایسے جلیل القدر اور بلند مرتبہ صحابہؓ کی دینی خدمات اور دیگر علمی اور عملی فضائل کا کون انکار کر سکتا ہے؟ ہاں البتہ کوڑ مغز اور خیرہ چشم کی بات ہی الگ ہے۔ یہ وہی اکابر ہیں جن کو دنیا میں حضرت محمد رسول اللہ تعالیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے جنتی ہونے کی بشارت اور خوشخبری مل چکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مومن کا خطاب عنایت فرما کر ابدی رضا کا پروانہ دے دیا ہے۔

**حضرت ابوہریرہ رضا (المتوفی ۵۸ھ) اور حضرت عائشہ رضا (المتوفاۃ ۵۷ھ) کا اثر:**

امام بیہقی رح فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابوعبداللہ رح نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ابویحیٰی سمرقندیؒ[1] رح نے بالمشافہ بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد رح[2] بن نصر رح نے بیان کیا، وہ فرماتے

---

[1] ان کا نام محمدؒ بن اسحاق سمرقندیؒ ہے، جلیل القدر محدث اور فقیہ تھے۔ علامہ ذہبیؒ نے (تذکرہ جلد ۲ میں ص ۲۰۱) ان کا نام ذکر کیا ہے

[2] علامہ ذہبی رح لکھتے ہیں کہ وہ الامام شیخ الاسلام اور الفقیہ تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۰۱) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ الفقیہ اور الحافظ تھے۔ (تہذیب التہذیب ۹ ص ۴۸۹) ابن حبانؒ ان کو احد الائمۃ فی الدنیا کہتے ہیں (ایضاً ص ۴۹۰)

ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن یحیٰیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن یوسفؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عاصمؒ نے بیان کیا، وہ ابو صالح ذکوانؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت کرتے ہیں:

انھما کانا یامران بالقرأۃ وراء الامام اذا لم یجھر (سنن الکبریٰ جلد ۲ صلا)

کہ حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت ابو ہریرہ رضؓ دونوں اس بات کا حکم دیتے تھے کہ جب امام جہر سے قرات نہ کرتا ہو تو اس کے پیچھے قرات کرنی چاہیے۔

دوسری سند: امام بیہقی رحؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمدؒ بن محمدؒ بن الحارث رحؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو محمدؒ بن حیانؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن عبداللہؒ بن رستہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے شیبانؒ بن فروخ رحؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے

---

لہ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام شیخ الاسلام اور حافظ نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ ۲ صلا) ابو حاتم رحؒ ان کو امام اہل زمانہ اور ابو بکرؒ بن زیادؒ ان کو امیر المومنین فی الحدیث کہتے ہیں (ایضاً صلا۱۰۲) حافظ ابن حجر رحؒ ان کو الحافظ لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۹ ص ۵۱۱)

لہ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، العابد اور شیخ الشام لکھتے ہیں، امام بخاریؒ ان کو افضل اہلِ زمانہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ا صلا۱۴) امام عجلیؒ اور نسائی رحؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابو حاتم رحؒ ان کو صدوق اور ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۹ صلا۵۳۹)

لہ عاصم رحؒ بن بہدلہ رحؒ اگرچہ بعض محدثین نے خطار، اضطراب اور وہم کی وجہ سے ان میں کلام کیا ہے لیکن جمہور ان کو ثقہ کہتے ہیں چنانچہ امام احمدؒ، علامہ ابن سعدؒ عجلیؒ اور ابو زرعہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن معینؒ ثقہ اور لا بأس بہ نسائیؒ لیس بہ بأس اور یعقوبؒ بن سفیانؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم رحؒ ان کو صداقت شعار اور صالح الحدیث کہتے ہیں۔ بزارؒ کا بیان ہے کہ مجھے کوئی ایسا محدث معلوم نہیں جو ان سے روایت نہ کرتا ہو۔ امام یحیٰیؒ ان کو امام اعمشؒ کا ہم پایہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۹) علامہ ذہبیؒ ان کو حسن الحدیث لکھتے ہیں (میزان جلد ۲ صہ) حافظ ابن کثیرؒ عاصمؒ بن بہدلہ کی سند کو جید اور قوی کہتے ہیں (ابن کثیر جلد ۴ صلا۵۳۶) امام حاکم رحؒ اور

(باقی اگلے صفحہ پر)

عکرمہ بن زہیرؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عاصمؒ بن بہدلہ نے بیان کیا۔ وہ ابوصالحؒ سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں:

انهما کانا یأمران بالقرأة خلف الامام فی الظهر والعصر فی الرکعتین الاولیین بفاتحة الکتاب وشیٔ من القرآن وکانت عائشہؓ تقرأ فی الاخریین بفاتحة الکتاب۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۷۱)

کہ وہ دونوں ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کا حکم دیتے تھے اور دونوں فرماتے تھے کہ پہلی دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنا چاہیے اور حضرت عائشہؓ ظہر اور عصر کی پچھلی دونوں رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرتی تھیں۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے۔ صرف ظہر اور عصر کی سرّی نمازوں میں وہ امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل اور اس پر عامل تھے۔ اور وہ دونوں پہلی رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ وشیٔ من القرآن کی قرأت کے بھی قائل تھے۔ اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے اور اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہر اور عصر کی پچھلی دونوں رکعتوں میں امام کے پیچھے حضرت ابوہریرہ رضؓ قرأت سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔ ہاں حضرت عائشہؓ صدیقہ کا اس پر عمل تھا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ کا حضرات صحابہ کرام رضؓ میں اور خاص طور پر فن روایت میں جو مقام اور رتبہ ہے اور دین کی جتنی خدمات ان سے سرانجام ہوتی ہیں وہ کس سے مخفی ہیں؟

مبارکپوری صاحبؒ نے عاصم رحؒ بن بہدلہ رحؒ کی وجہ سے اس روایت پر کلام کیا ہے۔ (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ صد ۹۸) لیکن مولانا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ان کا موازنہ ذرہ محمدؒ بن

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ عاصمؒ بن بہدلہؒ کی روایت کو صحیح کہتے ہیں۔ (مستدرک جلد ۳ صفحہ ۴۱۶)

ؒ امام احمد رحؒ ان کو ثقہ اور علامہ ذہبیؒ ان کو من اجل الناس وا وثقهم لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۸۳) اصول حدیث اور محدثین کی تصریح کے مطابق یہ حدیث حسن، جید قوی اور صحیح ہے۔

اسحاقؒ وغیرہ سے کر دیکھیں۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۱۸ میں لکھتے ہیں کہ یہ اثر بھی بظاہر صحیح ہے مگر اس میں ممانعت کا ذکر نہیں اور یہ اثر جہری نماز کی نفی میں صریح نہیں۔

**الجواب:** ممانعت کا نہ سہی جہری نمازوں میں ترکِ قرآت کا ذکر تو ہے اور اذالم یجھر شرط اور قید ہے اور صراحت کیا ہوتی ہے؟ اور ترکِ قرآت خلف الامام کی وجہ سے بطلانِ نماز کی رٹ تو باطل ہوتی۔

**حضرات! قارئین کرام! ابھی حضرات صحابہؓ کرام کے بہت سے آثار پیش کیے**

لہ امام ابن قدامہؒ نے کئی سندات کے ساتھ حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابو سعیدؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عقبہؓ بن عامر، حضرت جابرؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حذیفہؓ کی روایتیں نقل کی ہیں (مغنی ابن قدامہؒ جلد ۱ ص ۶۰۵) اور حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ کے حوالے سے حضرت علیؓ، حضرت سعدؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت کے نام نقل کیے جا چکے ہیں۔ اور امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرآۃ کے قائل نہ تھے (جزء القرآۃ صٓ ۳) اور علامہ عینیؒ نے مانعین قرآت خلف الامام میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت عبد اللہؓ بن مسعود، حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت ابن عباسؓ کا ذکر بھی کیا ہے اور اس پر ایک روایت بھی وہ نقل کرتے ہیں (عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۶۷) نیز علامہ عینیؒ اور ملا علی القاریؒ لکھتے ہیں کہ اسّی ۸۰ حضرات صحابہ کرامؓ سے امام کے پیچھے قرآت کی ممانعت کا ثبوت ملتا ہے۔ (عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۶۷ اور شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳) بلکہ امام شعبیؒ نے تو یہاں تک فرمایا ہے: قال ادرکت سبعین بدریا کلھم یمنعون المقتدی عن القرأۃ خلف الامام (روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵) کہ میں نے ستر ۷۰ عدد بدری حضرات صحابہ کرامؓ کو دیکھا ہے کہ وہ سب مقتدی کو امام کے پیچھے قرآت کرنے سے منع کرتے تھے اور صاحبِ ہدایہ نے جلد ۱ ص ۱۰۱ میں تو اجماع صحابہؓ کا دعویٰ کیا ہے، حافظ ابن عبد البرؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وغیرہ کی ان عبارتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو باب اول میں نقل کی جا چکی ہیں (کہ آیت کا شان نزول بالاجماع خلف الامام کا مسئلہ ہے، اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآت کرنا منکر شاذ اور مخالف اجماع ہے) (باقی اگلے صفحہ پر)

جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارا مقصد ان کا استیعاب نہیں ہے بلکہ ہم نے عمداً صرف ان حضرات صحابہ کرامؓ کے جن پر زیادہ تر علم حدیث فقہ اور دین موقوف ہے۔ (مثلاً حضرات خلفائے راشدینؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت عائشہؓ وغیرہم) صحیح آثار صرف بطور نمونہ عرض کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جمہور اہل اسلام کا دامن قرآن کریم صحیح اور مرفوع احادیث کے علاوہ حضرات صحابہ کرامؓ کی کیسی باعظمت جماعت سے وابستہ ہے اور آخر میں ہم صرف ایک ہی اثر نقل کر کے حضرات صحابہ کرامؓ کے ان پیش کردہ آثار پر اکتفا کرتے ہیں۔ وفیہا کفایۃ لمن لہٗ ھدایۃ۔

**اثر حضرت سعدؓ** (المتوفی ۵۵ھ) امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ داؤدؒ بن قیسؒ نے ابن بجادؒ سے روایت کی ہے جو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی اولاد میں تھے اور وہ حضرت سعدؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

وددت ان الذی یقرأ خلف الامام فی فیہ جمرۃ (جزء القرأۃ ص۱۱ و موطا امام محمد ص۹۸) کہ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہو، اس کے منہ میں آگ کی چنگاری ڈال دوں۔ [۱]

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) صاحب ہدایہؒ کا یہ دعویٰ مبنی بر انصاف معلوم ہوتا ہے اور محض تعصب ملے ہی پر اس کو حمل کر لینا قرین قیاس نہیں ہے (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)

[۱] یہ سخت الفاظ صرف حضرت سعدؓ ہی سے منقول نہیں بلکہ دوسرے حضرات صحابہ کرامؓ وغیرہم سے بھی اسی طرح کے تہدیدی الفاظ مروی ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر ڈالنا چاہیے (موطا امام محمد ص۹۸ منتخب کنز ص۱۸۷ و الجوہر النقی ۲ ص۱۶۹، طحاوی ج۱ ص۱۲۹) اور ایک روایت میں نتن (بدبو دار چیز) اور ایک میں رضف (گرم پتھر) کے الفاظ آئے ہیں (جزء القرأۃ ص۱۱ وغیرہ) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأۃ کرنیوالے کے منہ میں آگ بھر دی جائے (زیلعی جلد ۲ ص۱۶) اور حضرت اسودؒ تابعی کہتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے، اس کے منہ میں مٹی ڈالی جائے (الجوہر النقی جلد ۲ ص۱۶۹) اور حضرت علقمہؒ تابعی سے مٹی اور رضف دونوں الفاظ منقول ہیں (الجوہر النقی جلد ۲ ص۱۶۹) اور حضرت زیدؓ بن ثابت فرماتے ہیں کہ امام (باقی اگلے صفحہ پر)

**اعتراض:** امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے: (۱) ابنِ بجادؒ مجہول ہے۔
(۲) آگ کی چنگاری اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے اور انسانوں کو ایسی سزا دینے کی صحیح حدیث میں نہی آئی ہے (بخاری جلد ا ص ۴۲۳ وغیرہ)
(۳) حمادؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ پسند ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنیوالے کا منہ شکر سے بھر دیا جاتے۔

**جواب:** حضرت امام بخاریؒ کا یہ اعتراض تمام شقوں کے ساتھ مخدوش ہے۔ ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب ملاحظہ کریں: (۱) ابن بجادؒ کی جہالت کا دعویٰ کر کے اس اثر سے اغماض کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام حاکمؒ تحریر فرماتے ہیں:

وولد سعدؓ بن ابی وقاص الی سنۃِ خمسین ومأتین فیھم فقھاء وائمہ وثقات و حفاظ۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۴۱)

کہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی اولاد میں ۲۵۰ھ تک بڑے بڑے فقیہ، امام ثقہ اور حافظ پیدا ہوتے رہے ہیں۔

اور امام بخاریؒ کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی ہے۔ اس لیے ابن بجادؒ (جو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی اولاد میں تھے) کی جہالت کو بہانہ بنا کر اس اثر کو رد کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام حاکمؒ کی عبارت کے پیشِ نظر ابن بجادؒ ثقہ حافظ اور امام تھے۔ علامہ علینیؒ عبد الرزاقؒ بن ہمامؒ کے طریق سے روایت نقل کرتے ہیں:

عن داؤدؒ بن قیسؒ عن محمدؒ بن بجادؒ (بکسر البأ الموحدۃ وتخفیف الجیم) عن موسیٰؒ بن سعدؓ

کہ داؤدؒ بن قیسؒ محمدؒ بن بجادؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ موسیٰؒ بن سعدؓ سے روایت کرتے ہیں

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) کے پیچھے قرأت کرنیوالے کی نماز ہی سرے سے نہیں ہوتی (موطا امام محمد ص ۱۰۱) اگرچہ ان میں بعض آثار کمزور ہیں، مگر کچھ صحیح بھی ہیں اور یہ سب مل ملا کر اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ ان کی بھی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہے، اگر نص قرآنی اور صحیح و مرفوع احادیث اور جمہور ائمہؒ کا اس بات پر اتفاق نہ ہوتا کہ امام کے پیچھے قرأت صحیح نہیں ہے تو یہ الفاظ یقیناً غلو اور زیادتی پر محمول ہو سکتے تھے مگر سابق ابواب کو پیش نظر رکھنے کے بعد قرآن کریم اور صحیح حدیث کی مخالفت کرنیوالے کے حق میں یہ الفاظ زیادہ سنگین نہیں ہیں۔ ہاں البتہ ان دلائل سے جو شخص ناواقف ہو اور یہ ناواقفی بھی محض دیانت پر مبنی ہو تو اس کے لیے مزید احتیاط کی ضرورت ہے۔ خصوصاً وہ حضرات جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور جن کی نگاہوں سے اس طرح یکجا جمع کئے ہوئے دلائل نہیں گذر سکے مگر یہ سب دلائل دیکھ کر ضد کرنیوالے کے لیے یہ الفاظ بالکل مناسب ہیں۔

بن ابی وقاص قال ذکر لی ان سعدؓ بن وقاص قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام فی فیہ حجر (عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۶۷)

کہ انہوں نے حضرت سعدؓ سے روایت کی انہوں نے فرمایا کہ میں پسند کرتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأۃ کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر ڈالا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض وُلد سعدؓ سے مراد موسیٰؒ بن سعدؓ ہیں۔ محدث مولانا محمد حسن صاحب فیض پوریؒ فرماتے ہیں کہ

رجال اسنادہ ثقات

اس روایت کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔

(الدلیل المبین ص ۳۴۷)

لہٰذا مولف خیر الکلام کا عثمانؒ بن عبد الرحمٰن وقاصیؒ کے متروک اور جھوٹا ہونے سے اس مذکور سند کے ضعف پر استدلال کرنا (ملاحظہ ہو ص ۵۲۳) باطل ہے کیونکہ یہ مذکورہ روایت صحیح اور اس کی سند کے روات ثقہ ہیں جن میں ابن بجادؒ بھی ہیں اور اغلب ہے کہ جزء القرآۃ میں ابن بجادؒ ہی کا ابن نجادؒ بنا ہوا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جس مسئلہ میں جمہور صحابہ کرامؓ کے دو یا تین قول ہوں تو ان سب پر اہلِ علم کے کسی نہ کسی طائفہ نے عمل کیا ہے۔

وآیۃ ذٰلک ان تظھر فی مثل الموطاء وجامع عبد الرزاقؒ روایا تھم اھ

اور اس کی علامت یہ ہے کہ ان کی روایتیں، موطا اور جامع عبد الرزاقؒ میں بیان ہوئی ہوں۔

(حجۃ اللہ جلد ۱ ص ۱۴۱ طبع مصر)

اس سے معلوم ہوا کہ وہ اقوال صحابہ کرامؓ جو موطاً اور جامع عبد الرزاق میں ہوں وہ مستند اور قابل اعتبار ہیں۔

(۲) قلعوں، سواری کے جانوروں اور انسانوں کو جلانے کے بارے حضرات صحابہ کرامؓ میں خاصا اختلاف ہے ایک گروہ جواز کا اور دوسرا عدمِ جواز کا قائل ہے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۱۵۱) حافظ ابن حجرؒ نے جلانے کی حدیثوں کے منسوخ ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ (فتح الباری ج ۲ ص ۱۲۶ و ج ۶ ص ۱۵۱) لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضراتِ صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں باغیوں کو آگ میں جلایا تھا اور حضرت خالدؓ بن الولید نے بھی مرتدین

کو جلایا تھا اور آگے لکھا: واکثر علماء المدینۃ یجیزون الخ (فتح الباری ۵۱ ص ۶) اس سے معلوم ہوا کہ نسخ کا مسئلہ اتفاقی نہیں اغلب ہے کہ حضرت سعدؓ بھی جواز کے قائل تھے ان حضرات کا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں وددت سے بڑھ کر لقد ھممت (کہ میں البتہ قصد اور ارادہ کر چکا ہوں) کے الفاظ آئے ہیں مثلاً آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میں پختہ ارادہ کر چکا ہوں کہ جو لوگ جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے۔ ان کو گھروں کے اندر بند کر کے آگ میں جلادوں (بخاری ص۸۶ ج۱ و مسلم ص۲۳۲ ج۱) نیز آپ نے فرمایا کہ جو لوگ جمعہ کی نماز میں شریک نہیں ہوتے ہیں ان کو گھروں میں بند کر کے آگ میں جلانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ (مسلم ص۲۳۲ ج۱ و مشکوٰۃ ص۱۲۱) اور آپ نے فرمایا کہ اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے، تو میں اپنا ارادہ پورا کر چکتا (مسند احمد ص — والبوداؤد طیالسی ص۳۰۵) حضرت سعدؓ نے تو خلاف شرع کام کرنے والوں کے لیے صرف آگ کے عذاب کی آرزو کی ہے لیکن جناب رحمۃ للعلمین صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم تو مجرموں کو آگ میں جلانے کا قصد تک فرما چکے تھے اور اگر عورتوں اور بچوں کا سوال سامنے نہ آتا تو آپ یقیناً اپنا ارادہ پورا کر گزرتے کیا یہ روایتیں امام بخاریؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں؟ اور کیا یہ حدیثیں امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس قاعدہ کے لحاظ سے لا تعذبوا بعذاب اللہ کی حدیث کے خلاف ہیں؟ اگر نہیں تو اُمید قوی ہے کہ حضرت سعدؓ کا اثر بھی مخالف نہ ہوگا، بلکہ اس کو بطریقِ اَولیٰ مخالف نہ ہونا چاہیے۔

ع :- "مانتے جس کو نہ تھے لیجئے پہنچے وہاں"

(۳) امام بخاریؒ نے حمادؒ کے قول کی سند بیان نہیں کی تو ایسی بے سند بات کا کیا اعتبار ہے؟ علاوہ ازیں اگر حمادؒ کے قول کی سند بھی مل جائے، تب بھی قرآن کریم صحیح احادیث اور آثار صحابہؓ کے مقابلہ میں حمادؒ کے قول کی کیا وقعت ہے؟ خود امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ جب ایک چیز آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ سے ثابت ہو جائے تو اسود وغیرہ کی بات کیسے حجّت ہو سکتی ہے؟ (جزأ القرآۃ، ص۱۱) سچ ہے نگار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے؟

مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ جو چیز منع ہوتی ہے اس کی تمنا بھی منع ہوتی ہے آپ کی تمنّا نہی سے پہلے کی ہے اس کے بعد آپ نے منع کیا قرآن کریم میں ہے: لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ ... الخ ص۵۲۴

الجواب: بے شک جو چیز منع ہوتی ہے اس کی تمنا بھی منع ہوتی ہے لیکن

جن حضرات کے نزدیک آگ میں جلانا جائز ہے ان کے نزدیک اس کی تمنّا بھی جائز ہے۔ باقی قرآنِ کریم میں تمنائے عذاب کی نہی نہیں ہے اس میں حسد سے منع کیا گیا ہے و آں چیزے دیگر است۔

**لطیفہ:** اگر حضرت حمادؒ کے اس قول کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا ——— (ملئ فوہ سکرا) منہ شکر سے بھر دیا جائے تو بھی اس سے حضرت امام بخاریؒ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اگر عین نماز کی حالت میں قاری کا منہ شکر سے بھر نا مراد ہے تو بیچارہ قرأت تو کیا کرے گا۔ جہر کے ساتھ آمین بھی نہیں کہہ سکیگا یک نہ شد دو شد، بلکہ وہ تو آہستہ آمین کہنے سے بھی رہا اور شکر بھی حضرت حمادؒ نے تھوڑی تجویز نہیں کی بلکہ اچھی خاصی تجویز کی ہے جس سے (ملئ فوہ سکرا) اس کا منہ خوب بھر سکے، کیا بعید ہے کہ حمادؒ نے امام کے پیچھے قرأت کی بندش کا یہ طریقہ ایجاد کیا ہو مگر امام بخاریؒ اس کی سطحی مٹھاس کو دیکھ کر ان کو اپنا ہمنوا سمجھ بیٹھے ہوں، مشہور ہے کہ گڑ سے مخالف کو جلدی قابو کیا جا سکتا ہے اور اگر امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا خارج از نماز شکر سے منہ بھر نا مراد ہے تو اس نازک دور میں دوسری اشیاء خوردنی کی طرح شکر کے لیے بھی لوگ سرگرداں پھر رہے ہیں۔ فریق ثانی حضرت حمادؒ کے اس قول کا اعلان کر دے، پھر قدرت خدا کا تماشا دیکھیے کہ جماعت کی تعداد کیسے بڑھتی اور اس کو کیسے ترقی حاصل ہوتی ہے؟ بلکہ ہمیں تو یقین ہے کہ عوام تو کیا اچھے خاصے محدث بھی حضرت

---

ابو سعید الخدریؓ کی مرفوع حدیث ان احق ما اخذ تم علیہ اجرا کتاب اللہ (او کما قال) سے اس شکر خوری پر استدلال کرتے نظر آئیں گے اور حمادؒ کے زمانہ کی شکر سے اس ترقی یافتہ دور کی شکر بدرجہا زیادہ سفید اور عمدہ ہے اور بہت ممکن ہے کہ جو لوگ فریق ثانی سے فرعی مسائل میں قدرے دور ہیں (مثلاً پٹھان وغیرہ) اور چائے کے اشد عادی ہیں اور کھانڈ اور شکر نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ اس شکری اعلان کے بعد فریق ثانی کے حلقہ بگوش ہو جائیں اور بیماروں کو تو بونانی قدحوں پر قدحے پینے کے لیے شکر مل جائیگی۔ غرضیکہ اس اعلان کے بعد سورۃ فاتحہ کی برکت سے ہر کس و ناکس کو اس کا سورۃ الشفأ اور سورۃ

السوال وغیرہ ہونا آسانی سے سمجھ آسکتا ہے اور اس کی برکت سے ہمیں تو فتح حاصل ہے ہی، فریق ثانی کو بھی بڑی فتح اور کامرانی حاصل ہوگی۔ الغرض امام بخاریؒ نے امام کے پیچھے قرآت کرنے والے کے لیے شکم تجویز فرمائی اور عین نماز کی حالت میں جیسا کہ ان ظاہری الفاظ سے متبادر ہوتا ہے مگر یہ خیال نہ کیا کہ گھر کس کا پورا ہو رہا ہے؟ سچ ہے ——

ع:— میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

**حضرات!** حضرات صحابہ کرامؓ کے ان مختصر سے آثار کے بعد مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر بعض حضرات تابعینؒ و اتباع تابعینؒ وغیرہم کے کچھ آثار آپ کے سامنے عرض کیے جاتے ہیں تاکہ آپ کو حضرات تابعینؒ وغیرہم کا نظریہ بھی بسلسلہ قرآت خلف الامام معلوم ہو سکے اور اختصاراً نقل سند کے بعد ہم رواۃ کی توثیق بھی عرض کریں گے اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات کے جوابات بھی عرض کر دیے جائیں گے۔

---

**اثر علقمہ[۱] بن قیسؒ** (المتوفی سنہ ۶۸ھ) امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے امام ابو حنیفہؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حمادؒ[۲] نے بیان کیا۔ وہ ابراہیم[۳] نخعیؒ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

---

[۱] علامہ ذہبیؒ ان کو امام بارع لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۱) امام نوویؒ ان کو صاحب کمال فقیہ لکھتے ہیں (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۳۴۲) علامہ ابن سعدؒ ان کو کثیر الحدیث لکھتے ہیں (طبقات ابن سعد جلد ۶ ص ۹۲) ابو ظبیانؒ کا بیان ہے کہ میں نے متعدد حضرات صحابہ کرامؓ کو علقمہؒ سے مسائل پوچھتے اور استفسار کرتے دیکھا ہے (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۷۷)

[۲] حمادؒ بن ابی سلیمانؒ، امام مسلمؒ اور دیگر محدثینؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے (الجواہر المضیہ جلد ۱ ص ۲۲۶) امام احمدؒ ان کی تعریف کرتے تھے اور ان کو قابل اعتبار سمجھتے تھے۔ امام معمرؒ کا بیان ہے کہ میں نے امام زہریؒ، حمادؒ اور قتادہؒ سے بڑھ کر دین کی سمجھ رکھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ امام ابن معینؒ، عجلیؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور مستقیم کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ لا بأس بہ کہتے ہوئے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۱۶ و ۱۷)

[۳] ان کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

ماقرأ علقمة بن قيس قط فيما يجهر فيه ولا فيما لا يجهر فيه ولا الركعتين الاخيرتين ام القرآن ولا غيرها خلف الامام۔

(بحوالہ تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹۰)

علقمہؒ بن قیسؒ نے امام کے پیچھے کبھی کسی نماز میں قراۃ نہیں کی نہ جہری نمازوں میں اور نہ سری میں (نہ پہلی رکعتوں میں اور نہ پچھلی رکعتوں میں، نہ سورۂ فاتحہ اور نہ کوئی سورت امام کے پیچھے وہ کچھ بھی نہیں پڑھتے تھے۔

اور یہ اثر اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح ہے کہ حضرت علقمہؒ امام کے پیچھے کسی نماز میں کوئی قراۃ نہیں کیا کرتے تھے۔

**اعتراض:** مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اولاً[1] ۔۔ اگرچہ حمادؒ ثقہ تھے مگر مدلس اور مختلط تھے۔ وثانیاً[2] ۔۔ ابراہیم نخعیؒ کی علقمہؒ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۶۹)

**جواب:** جب حمادؒ ثقہ ہیں تو اس روایت میں اختلاط سے کوئی فرق نہیں پڑیگا کیونکہ محدثینؒ نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ انکو اختلاط کا عارضہ آخر میں لاحق ہوا تھا اور ابراہیم نخعیؒ کی روایتیں میں وہ خطا نہیں کرتے تھے (تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۶) خود مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ اور سفیانؒ اور ان کے طبقہ کے مدلسین کی تدلیس مضر نہیں ہے۔ علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ نے علقمہ سے سماعت کی ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۶۹ و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۷۷) اس لیے مبارکپوری صاحبؒ کا یہ دعویٰ کرنا کہ ابراہیم نخعیؒ نے علقمہؒ سے ملاقات نہیں کی مردود ہے۔ علاوہ بریں اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ابراہیم نخعیؒ کی ملاقات علقمہؒ سے نہیں ہوئی تو یہ روایت مرسل ہوگی۔ اور امام دارقطنیؒ، امام طحاویؒ، حافظ ابن قیمؒ اور حافظ ابن حجرؒ وغیرہ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ کی مرسل روایتیں بھی حجت اور صحیح ہیں۔ (دارقطنی جلد ۲ ص ۱۷۶، طحاوی جلد ۱ ص ۱۳۳، زاد المعاد جلد ۴ ص ۲۵۴ و درایہ ص ۱۶) اور امام بیہقیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ مرسلات ابراہیم صحیحۃ الا حدیث تاجر البحرین[3]۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۴۸)

---

[3] یاد رہے کہ یہ روایت صرف مرسل ہی نہیں بلکہ مسند اور مرفوع بھی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اس نے کہا کہ حضرت! میں بحرین کے علاقہ میں تجارت کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ آپنے فرمایا کہ دو رکعت نماز پڑھو۔ (رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجالہٗ موثقون مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۲۸۳)

کہ تاجر بحرین کے مضمون والی روایت کے علاوہ ابراہیمؒ کی تمام مرسل روایتیں صحیح ہیں، بہر حال یہ روایت فن روایت اور محدثین کے اصول کے ماتحت بالکل صحیح اور حجت ہے۔

**اثر عمروؒ بن میمونؒ** (المتوفی سنہ ۷۴ھ) وغیرہ ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں ہم سے یزیدؒ بن ہارونؒ نے بیان کیا، وہ اشعثؒ سے اور وہ مالکؒ بن عمارہ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے اصحابؓ اور تلامذہ سے جن میں خصوصیت سے عمروؒ بن میمونؒ قابل ذکر ہیں۔ امام کے پیچھے قرآۃ کرنے سے متعلق سوال کیا۔ کلھم یقولون لا یقرأ خلف الامام (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹۰) تو ان سب نے جواب یہ دیا کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہئے، محقق نیمویؒ نے فرمایا تھا کہ مجھے مالکؒ بن عمارہ کا ترجمہ نہیں مل سکا، مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ تو اس اثر کا پیش کرنا بے سود ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۶۸) مگر ہم ثابت کر چکے ہیں کہ یہ مالکؒ بن عامرؒ ہیں جو ثقہ اور ثبت تھے اور یہ اثر بھی صحیح ہے، حضرت علیؓ جب کوفہ تشریف لے گئے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ

---

۱؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الامام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۹۱)

۲؎ ان کا ترجمہ گذر چکا ہے۔ ۳؎ وہ ثقہ متقن اور عابد تھے (تقریب ص ۴۰۰)

۴؎ اشعثؒ بن ابی الشعثاءؒ، امام ابن معینؒ، ابوحاتمؒ، نسائیؒ، ابوداؤدؒ اور بزارؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، عجلیؒ ان کو شیوخ کوفہ اور ثقات میں لکھتے ہیں اور ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۵) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تقریب ص ۴۱)

۵؎ یہ مالکؒ بن عمارہ نہیں بلکہ مالکؒ بن عامرؒ ہیں جو اشعثؒ سے روایت کرتے ہیں (دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۵ وغیرہ) علامہ ذہبیؒ ان کو صاحب ابن مسعودؓ قدیم الموت اور ثقہ لکھتے ہیں، (میزان جلد ۱ ص ۳) امام ابن معینؒ، ابوداؤدؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۲ ص ۱۶۹) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں (تقریب ص ۴۲۵) ابوعطیہؒ ان کی کنیت تھی بخاری ۲ ص ۶۵ اور ترمذی جلد ۱ ص ۸۸ میں ان کا ذکر ہے۔

۶؎ نواب صاحبؒ نے اصحاب علیؓ اور عبداللہؓ میں سے اٹھائیس کے نام بتلائے ہیں جو جلیل القدر محدث اور امام تھے۔ (الجنہ ص ۶)

اصحاب عبد اللہؓ سرج ھذہ القریۃ (طبقات ابن سعد جلد ۶ ص۲) عبد اللہؓ بن مسعودؓ کے اصحاب اس شہر کے روشن چراغ ہیں اور آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ اصحاب عبد اللہؓ سب کے سب امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہی فتوٰی دیا کرتے تھے۔

اثر اسودؒ بن یزیدؒ[1] (المتوفی ۷۵ھ) ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں ہم سے ابن علیہؒ[2] نے بیان کیا۔ وہ ایوبؒ[3] اور ابن ابی عروبہؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ دونوں ابو معشرؒ[4] سے وہ ابراہیم نخعیؒ سے اور وہ اسودؒ بن یزیدؒ سے۔

قال لان اعض جمرۃ احب الیّ من ان اقرأ خلف الامام اعلم انہ یقرأ۔

(آثار السنن جلد ۱ ص۹)

انھوں نے فرمایا کہ میں اس بات کو زیادہ پسند کرتا ہوں کہ اپنے منہ میں آگ کی چنگاری ڈال لوں بجائے اس کے کہ میں امام کے پیچھے قرأت کروں جبکہ مجھے علم ہے کہ وہ پڑھتا ہے۔

یہ روایت بھی اپنے مدلول میں واضح ہے۔ مبارکپوری صاحبؒ نے ابراہیم نخعیؒ کی تدلیس کا بہانہ کیا ہے۔ (ابکار وغیرہ) مگر بے سود ہے کیونکہ یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو امام فقیہ، زاہد، عابد اور کوفہ کا امام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص۴۳) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق اور جلالتِ شان پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص۱۲۲) محدث ابن حبانؒ ان کو فقیہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص۳۴۲) حافظ ابن کثیرؒ ان کو من کبار التابعین اور من اعیان اصحاب ابن مسعودؓ اور من کبار اھل الکوفۃ لکھتے ہیں (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص۱۲)

[2] ان کا نام اسمٰعیل بن ابراہیمؒ بن مقسمؒ تھا، جو ثقہ اور حافظ تھے۔

[3] ایوبؒ کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن مسعودؓ کے اثر کے تحت اور ابن ابی عروبہ کا باب دوم حدیث ۱ کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

[4] ابو معشرؒ کا نام زیادؒ بن کلیبؒ تھا۔ محدث عجلیؒ، نسائیؒ، ابن مدینیؒ اور ابو جعفر بستیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ ان کو حفاظ متقنین میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۸۳)

ابراہیم نخعیؒ اس طبقہ کے مدلس تھے جن کی تدلیس مضر نہیں ہے اور ان کی جملہ روایتیں (علاوہ ایک روایت تاجر بحرین کے) حجت ہیں، چنانچہ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں: قلت استقر الامر علی ان ابراھیم حجۃ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص۳۵) میں کہتا ہوں یہ طے شدہ بات ہے کہ ابراہیم حجت تھے۔

دوسری سند: ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ، ہشیمؒ[1] سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیلؒ[2] بن ابی خالدؒ نے بیان کیا۔ وہ وبرہؒ[3] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت اسودؒ بن یزیدؒ سے وہ فرماتے ہیں قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام ملیٔ فاہ ترابا (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹۰) کہ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا منہ مٹی سے بھر دیا جائے۔

تیسری سند: عبدالرزاقؒ[4] بن ہمامؒ اپنے مصنف میں سفیان ثوریؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ امام اعمشؒ سے اور وہ ابراہیم نخعیؒ سے اور وہ اسودؒ بن یزیدؒ سے وہ فرماتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام ملیٔ فوہ ترابا (الجوھر النقی جلد ۲ ص۱۶۹) | میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأۃ کرتا ہے اس کا منہ مٹی سے بھر دیا جائے۔ |

---

[1] ہشیم بن بشیرؒ ثقہ اور ثبت لیکن کثیر التدلیس تھے (تقریب ص۳۸۱) مگر اس روایت میں وہ تحدیث کرتے ہیں۔

[2] امام ابن مہدیؒ، ابن معینؒ، نسائیؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن عمار موصلیؒ ان کو حجت اور یعقوبؒ بن سفیانؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ، یعقوبؒ بن شیبہؒ، ابن حبانؒ اور ابن عیینہؒ ان کو ثقہ، ثبت اور حافظ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص۲۹۱)

[3] وبرہ بن عبدالرحمٰنؒ امام ابو زرعہؒ، ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۱۱ ص۱۱۱)

[4] عبدالرزاقؒ بن ہمامؒ کا ترجمہ اثر حضرت علیؓ میں اور سفیان ثوریؒ کا مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ بقیہ رواۃ کا ترجمہ بھی گذر چکا ہے۔ امام اعمشؒ ثقہ اور حافظ تھے (تقریب ص۱۶۰) البتہ مدلس تھے، لیکن حضرت قتادہؒ کی بحث ملاحظہ کر لیجئے کہ ان کی تدلیس بھی مضر نہیں ہے۔

غالباً حضرت اسودؒ کے یہی وہ الفاظ ہیں، جن پر حضرت امام بخاریؒ بہت ناراض ہوئے ہیں (دیکھئے جزء القرأۃ ص۱۱)

اثر سویدؓ[1] بن غفلہ (المتوفی ۸۰ھ) ابو بکرؒ[2] بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے فضلؒ بن دکینؒ نے بیان کیا۔ وہ زہیرؒ[3] سے روایت کرتے ہیں، وہ ولیدؒ[4] بن قیسؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سویدؓ بن غفلہ سے سوال کیا۔ اقرأ خلف الامام فی الظھر والعصر قال لا (تعلیق الحسن جلد ۱ ص۹) کیا میں ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں؟ فرمایا نہیں، اس اثر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سائل کو دوسری نمازوں کے بارے میں تو یہ علم تھا کہ ان میں امام کے پیچھے قرأت صحیح نہیں ہے۔ لیکن اس کو صرف ظہر اور عصر کی نماز میں قرأۃ خلف الامام کے بارے میں تردد تھا۔ سو حضرت سویدؓ نے اس کا یہ مغالطہ بھی نکال دیا ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ سند میں ولیدؒ بن قیس تجیبی ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ انکو مقبول لکھتے ہیں (تقریب ص۳۸۷) اور علامہ نیمویؒ نے حبل المتین میں لکھا ہے کہ جس راوی کے متعلق حافظ ابن حجرؒ مقبول لکھتے ہیں وہ کمزور ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ اثر کمزور ہے (ابکار المنن ص۱۹۷) جواب: حبل المتین ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ نہ معلوم محقق

---

[1] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ بلند مرتبہ عابد، زاہد، قانع بالیسیر اور کبیر الشان تھے (تذکرہ جلد ۱ ص۵۰) امام ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، محدث ابن قانعؒ تو ان کو صحابہؓ میں شمار کرتے ہیں (تہذیب التہذیب ۴ ص۲۷۸) حافظ ابن کثیرؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت سویدؓ بن غفلہ نے فرمایا کہ میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ہم عمر ہوں کیونکہ میری ولادت بھی عام فیل میں ہوئی ہے اور امام بیہقیؒ ان سے یہ نقل کرتے ہیں کہ میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے صرف دو سال عمر میں چھوٹا ہوں (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۲۶۲)

[2] ابو بکر بن ابی شیبہؒ اور فضلؒ بن دکینؒ کا ترجمہ گذر چکا ہے۔

[3] زہیرؒ بن معاویہؒ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص۱۲۳)

[4] ولیدؒ بن قیسؒ سکونی امام ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں امام نسائیؒ ان کی تعریف کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص۱۴۷) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص۳۸۷)

نیموی[۱] نے یہ کس راوی اور کس موقع اور محل پر لکھا ہے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اس راوی کے متعلق لکھا ہو، جس کو دیگر محدثین کمزور بتاتے ہوں اور صرف حافظ ابن حجرؒ ہی اس کو مقبول کہتے ہوں اور ولیدؒ بن قیسؒ کو تو دیگر محدثینؒ بھی ثقہ کہتے ہیں۔ علاوہ بریں مبارکپوری صاحبؒ کو یہ مغالطہ ہوا ہے۔ یہ راوی ولیدؒ بن قیس تجیبیؒ نہیں جن کو حافظ ابن حجرؒ مقبول لکھتے ہیں (اور محدث عجلیؒ تابعی اور ثقہ لکھتے ہیں۔ اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۱۴۶) بلکہ یہ ولیدؒ بن قیس سکونی ہیں جو زہیرؒ سے روایت کرتے ہیں (دیکھئے تہذیب التہذیب ۱۱ ص ۱۴۶)

ع ؎ "میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا"

اثر نافع[۲] بن جبیرؒ (المتوفی ۹۳ھ) امام مالکؒ یزیدؒ[۳] بن رومانؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ نافعؒ بن جبیرؒ سے کان یقرأ خلف الامام فیما لا یجهر فیه الامام (موطا امام مالک ص ۲۹)

---

[۱] محقق نیمویؒ کا نام ظہیر احسن ابوالخیر کنیت اور شوق تخلص تھا۔ آپ مولانا علامہ محمد عبدالحیؒ لکھنوی (المتوفی ۱۳۰۴ھ) کے شاگرد رشید تھے، بڑے پایہ کے محدث اور فقیہ تھے، فن اسماء الرجال پر گہری نظر رکھتے تھے، اور خداداد ذہانت اور فطانت میں قاضی شوکانیؒ سے بھی انکا پایہ بہت بلند تھا۔ مگر افسوس کہ ناپائیدار زندگی نے ساتھ نہ دیا اور ان کی قابلیت کے پورے جوہر ابھی اچھی طرح اجاگر نہ ہوئے تھے کہ ۱۷ رمضان ۱۳۲۲ھ میں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کی مشہور کتاب آثار السنن (مع حاشیہ تعلیق الحسن) کو علماء بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور فریق ثانی کی نگاہوں میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے، مولانا مبارکپوری صاحبؒ نے ابکار المنن لکھ کر اپنی جماعت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ آثار السنن کا جواب ہے، مگر وہ بری طرح اس میں ناکام رہے ہیں، فریق ثانی کے چیدہ چیدہ علماء کو بلکہ خود مبارکپوری صاحبؒ کو بھی اس کا گہرا احساس تھا اور ہر سلیم الطبع آدمی اس ٹھوس نظریہ کا یقیناً احساس کر سکتا ہے ولیس الخبر کالمعاینة۔

[۲] امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ نافعؒ بن جبیرؒ امام اور فاضل تھے۔ ان کی توثیق اور جلالت شان پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۱۲۲) ابن خراشؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ، مشہور اور امام تھے۔ وہ مدینہ طیبہ کے صاحب افتاء علماء میں تھے اور ان کے فتاوی معتبر سمجھے جاتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۴۰۵) حافظ ابن کثیرؒ ان کو من الثقات النبلاء اور من ائمة الاجلاء لکھتے ہیں (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۴۰۵)

[۳] حضرت امام مالکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گذر چکا ہے، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کہ وہ امام کے پیچھے صرف ان نمازوں میں قرأت کرتے تھے جن میں امام جہر سے قرأت نہیں کرتا تھا۔ اگر ہر نماز اور ہر رکعت میں امام کے پیچھے قرأت سورۃ فاتحہ ضروری ہوتی۔ تو حضرت نافعؒ بن جبیرؒ سب نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کیا کرتے، مگر وہ صرف سری نمازوں میں قرأت کرتے تھے۔ اور کیا بعید ہے کہ امام مالکؒ وغیرہ کی طرح وہ بھی استحباب کے قائل ہوں اگر وہ وجوب کے بھی قائل ہوں۔ تب بھی فریق ثانی کی جہری نمازوں میں بطلان نماز کی رٹ تو غلط ہو جائیگی۔ وعلیٰ ہٰذالقیاس ہم جتنے آثار نقل کریں گے، جن میں صرف جہری نمازوں میں امام کے پیچھے ترک قرأت کا ثبوت ہوگا۔ ان سے ہمارا مدعا بھی محض یہ ہے کہ فریق ثانی کا عمومی نظریہ صحیح نہیں ہے اور بس گو ان میں سری نمازوں کے اندر قرأت کا ثبوت بھی ہوگا، استحبابی طور پر ہو یا وجوبی طور پر بہر حال ہمارا مطلب اور مدعا واضح ہے۔

اثر سعیدؒ بن المسیبؒ (المتوفی ۹۴ھ) الوبکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے وکیعؒ نے بیان کیا۔ وہ ہشامؒ[1] دستوائیؒ سے اور وہ حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: انصت للامام (آثار السنن جلد ۱ ص۹۰) یعنی امام کے پیچھے بالکل خاموشی اختیار کرو، اور قرأت نہ کیا کرو۔ حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ کا ایک اثر باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے اور یہ اثر بھی اپنے معنوی اعتبار سے واضح ہے۔

**اعتراض:** مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اولاً — اس اثر کی سند میں قتادہؒ مدلس ہیں، جو عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ ثانیاً — امام بخاریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ سعیدؒ بن المسیبؒ، عروہؒ، شعبیؒ، عبیداللہؒ بن عبداللہؒ نافعؒ بن جبیرؒ، ابو الملیحؒ، قاسمؒ بن محمدؒ، ابو مجلزؒ، مکحولؒ، مالکؒ بن عونؒ اور سعیدؒ بن ابی عروبہؒ قرأت خلف الامام کے قائل تھے۔ (جزء القرأۃ ص۱۱) لہٰذا یہ اثر حجت نہیں ہو سکتا (ابکار المنن وغیرہ)

---

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) یزیدؒ بن رومانؒ کو امام نسائیؒ اور ابن معینؒ ثقہ کہتے ہیں۔ علامہ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ علامہ ابن سعدؒ ان کو عالم، کثیر الحدیث اور ثقہ کہتے ہیں (تہذیب ۱۱ ص۳۲۵)

[1] ہشام دستوائیؒ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص۳۸۰) حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ کا ترجمہ باب اول میں اور قتادہؒ وکیعؒ اور ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ کا باب ثانی میں نقل ہو چکا ہے۔ وہاں ہی ملاحظہ کر لیں۔

**جواب:** حضرت قتادہؒ کی تدلیس کا مفصل جواب پہلے دیا جا چکا ہے اور حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ کے بسند صحیح وہ اثر ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اور امام بخاریؒ نے اپنے استدلال میں ان کے اثر کی کوئی سند نقل نہیں کی اور بے سند بات حجت نہیں ہو سکتی۔ اور حضرت عروہؒ بن زبیرؒ نافعؒ بن جبیرؒ اور قاسمؒ بن محمدؒ وغیرہ کو مطلقاً مجوزین قرأت خلف الامام میں شمار کرنا باطل ہے بعض کے آثار اس کے خلاف نقل کیے جا چکے ہیں اور بعض کے عرض کر دیے جائیں گے۔ اور بقیہ آثار کی اسانید پر آثار خصوصی میں بحث کی جائیگی۔ انشاء اللہ العزیز

اثر سعیدؒ[1] بن جبیرؓ (المتوفی ۹۴ھ) ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ہیثمؒ نے بیان کیا۔ وہ ابو بشرؒ[2] سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سعیدؒ بن جبیرؓ سے سوال کیا۔

عن القرأۃ خلف الامام قال لیس خلف الامام قرأۃ۔

کیا امام کے پیچھے قرأت کی جا سکتی ہے؟ فرمایا کہ امام کے پیچھے کسی قسم کی کوئی قرأت نہیں کی جا سکتی۔

(تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹۰)

**اعتراض:** مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اولاً ہیثمؒ مدلس تھے۔ اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں وثانیاً حضرت سعیدؒ بن جبیرؓ سکتات امام میں قرأت کے قائل تھے (جزء القرأۃ ص ۵۷) اس لیے یہ اثر قابل احتجاج نہیں ہو سکتا

(ابکار المنن ص ۱۹۷ وغیرہ)

**جواب:** یہ بالکل صحیح ہے کہ ہیثمؒ کثیر التدلیس تھے، لیکن حضرت امام بخاریؒ اور علامہ ذہبیؒ ان کی معنعن حدیث سے استدلال کرتے ہیں (دیکھئے صحیح بخاریؒ جلد ۱ ص ۱۰۸ و تذکرہ ج ۱ ص ۲۴۷ وغیرہ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تدلیس بھی مضر نہیں ہے، مزید تائید کے لیے

---

[1] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ علماء اعلام میں تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۷۵) امام نوویؒ کا بیان ہے کہ وہ تابعینؒ کے ائمہ کبار میں تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عبادت اور زہد و ورع اور جملہ کمالات میں وہ کبار ائمہ اور سرگروہ تابعینؒ میں تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۱۶)

[2] ابو بشرؒ کا نام جعفرؒ بن ایاسؒ تھا اور وہ ثقہ تھے (تقریب ص ۵۶) ہیثمؒ کا ترجمہ پہلے گذر چکا ہے۔

ایک اور روایت سن لیجئے امام ابن جریرؒ عبد اللہؒ بن مبارکؒ کے طریق سے روایت کرتے ہیں اور وہ بقیہؒ بن ولیدؒ سے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ثابتؒ بن عجلانؒ سے سنا۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سعیدؒ بن جبیرؒ سے سنا۔ انھوں نے فرمایا کہ آیت واذا قرئ القرآن ... الآیۃ خطبہ، جمعہ اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۳) اور سعیدؒ بن جبیرؒ کے سکتات والے اثر کا جواب باب اوّل اعتراض ۱۱ کے جواب میں دیکھ لیں کہ نہایت کمزور اور ضعیف ہے۔

**اثر عروہؒ بن زبیرؓ** (المتوفی ۹۴ھ) امام مالکؒ ہشامؒ بن عروہؒ اور وہ اپنے والد عروہؒ بن زبیرؓ سے روایت کرتے ہیں:

| | |
|---|---|
| انه كان يقرأ خلف الامام اذا لم يجهر فيه الامام بالقرأة (موطا امام مالك ص۲۹ وكتاب القرأة ص۱۰) | کہ وہ امام کے پیچھے صرف ان نمازوں میں قرأت کیا کرتے تھے جن میں امام جہر سے قرأت نہیں کیا کرتا تھا۔ |

**اثر ابراہیم نخعیؒ** (المتوفی ۹۶ھ) ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو خالد الاحمرؒ نے بیان کیا وہ اعمشؒ سے اور وہ حضرت ابراہیم نخعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

---

لہ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کے مناقب بے شمار ہیں، ان کی جلالت علوئے مرتبت اور وفور علم پر سب کا اتفاق ہے فقہ میں ان کو اتنا کمال حاصل تھا کہ مدینہ منورہ کے سات مشہور فقہاء میں سے ایک فقیہ مانے جاتے تھے (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۳۳۱) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور عالم مدینہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۵۲) علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ ثبت کثیر الحدیث فقیہہ اور بلند قدر لکھتے ہیں (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۱۳۳) ان کا علمی کمال اس قدر مسلّم تھا کہ بڑے بڑے حضرات صحابہ کرامؓ مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے (البدایہ والنہایہ ۹ ص ۱۰۱) اس کمال کے باوجود اس قدر محتاط تھے کہ کوئی مسئلہ محض اپنی رائے سے نہ بیان کرتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۱۸۳)

لہ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، الحجۃ الفقیہہ لکھتے ہیں (تذکرہ ۱ ص ۱۳۶)

خالد الاحمر کا ترجمہ باب دوم حدیث ۲ میں اور ابراہیم نخعیؒ کا مقدمہ میں اور امام اعمشؓ کا حضرت اسودؒ ...

اقول ماحدث ثوا القرأة خلف الامام وكانوا لا يقرأون (الجوهر النقی جلد ۲ صـ ۱۶۹)

یعنی لوگوں نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی بدعت ایجاد کی ہے۔ اور وہ (یعنی حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ) امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے۔

اور یہی مضمون بعینہٖ شمس الدین ابن قدامہؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ (شرح مقنع جلد ۲ صـ ۱۲)

امام ابن قدامہؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا کہ لوگوں نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی بدعت مختار کے زمانے میں نکالی، کیونکہ وہ لوگوں کو دن کی نمازیں تو پڑھا دیا کرتا تھا۔ مگر رات کی نمازیں نہیں پڑھاتا تھا (اور حاکم ہونے کے باعث ناچار لوگوں کو اس کے پیچھے نمازیں پڑھنی پڑتی تھیں اس لیے) اس سے بدظن ہو کر لوگوں نے اس کے پیچھے قرآت شروع کردی (مغنی ابن قدامہ جلد ۱ صـ ۶۰۶) اگر یہ نقل صحیح ہے تو امام کے پیچھے قرآت کرنے کے بدعت ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت مل سکتا ہے؟ تسلیم کرنے والے کے لیے یہ دلائل بڑے مضبوط اور ٹھوس ہیں البتہ نہ ماننے والے کا کوئی علاج نہیں۔

**اثر قاسمؒ بن محمدؓ[۱] (المتوفی ۱۰۶ھ) امام مالکؒ یحییٰؒ[۲] بن سعیدؒ اور امام ربیعہؒ[۳] بن عبدالرحمنؒ**

---

[۱] علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ قاسمؒ بن محمدؒ الامام القدوہ اور الفقیہ تھے (تذکرہ جلد ۱ صـ ۹۰) علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ رفیع المنزلت و عالی مرتبت فقیہہ امام اور بڑے حافظ حدیث تھے اور متورع تھے (طبقات جلد ۵ صـ ۱۴۳) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وہ بڑے جلیل القدر تابعی ہیں۔ ان کی جلالت توثیق اور امامت پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۱ صـ ۵۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الفقہاء المشہورین اور افضل اہلِ مدینہ اور اعلم اہلِ زمانہ تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۹ صـ ۲۵) امام مالکؒ فرماتے تھے کہ قاسمؒ اس امت کے فقہاء میں تھے (تہذیب التہذیب جلد ۸ صـ ۳۳۵) ابوالزنادؒ کہتے ہیں کہ میں نے قاسمؒ سے زیادہ سنت کا عالم اور فقیہہ نہیں دیکھا (تذکرہ ۱ صـ ۹۱)

[۲] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، شیخ الاسلام، عالم اور قاضی المدینہ لکھتے ہیں (ایضاً ۱ صـ ۱۲۸)

[۳] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام، حافظ، فقیہہ اور مجتہد تھے۔ علامہ خطیبؒ کا بیان ہے کہ وہ فقیہہ، عالم اور حافظ فقہ اور حدیث تھے (ایضاً جلد ۱ صـ ۱۴۸)

سے روایت کرتے ہیں اور وہ دونوں حضرت قاسمؒ بن محمدؒ سے کہ وہ کان یقرأ خلف الامام فیما لا یجھر فیہ الامام بالقرأۃ (موطا امام مالک ص۲۹) صرف ان نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے جن میں امام جہر سے قرأت نہیں کرتا تھا۔ یہ اثر بھی جہری نمازوں میں ترک القرأت خلف الامام کے بارے میں بالکل روشن اور واضح ہے۔

**امام اوزاعیؒ** (المتوفی ۱۵۷ھ) بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ جیساکہ امام ابن قدامۃؒ کے حوالہ سے نقل کیا جاچکا ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے فتاوٰی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل تھے لیکن صرف استحباب کے طور پر چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

ومذھب طائفۃ کالاوزاعیؒ وغیرہ من الشامیین یقرأھا استحبابا وھو اختیار جدنا انتھی (فتاوی جلد ۲ ص۱۴۶)

اور ایک گروہ کا یہ مسلک ہے جیسے امام اوزاعیؒ اور ان کے علاوہ دوسرے شام میں رہنے والے علماء کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا صرف استحباب کے درجے میں ہے اور اسی مسلک کو ہمارے دادا صاحب[۱] نے اختیار کیا۔

کیا بعید ہے کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت اور حضرت مکحولؒ وغیرہ شامی علماء اور ائمہ وغیرہ من الشامیین کی مد میں شامل ہوں اور امام کے پیچھے قرأت سورۂ فاتحہ کے صرف استحباب کے قائل ہوں، آخر شیخ الاسلامؒ کی بات ہے اور اس کی مزید تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ امام اوزاعیؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے۔

**امام سفیان ثوریؒ** (المتوفی ۱۶۱ھ) بھی سری اور جہری کسی نماز میں امام کے پیچھے کسی قسم کی قرأت کے قائل نہ تھے (جیساکہ تفسیر معالم التنزیل جلد ۲ ص۲۲۶ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص۲۵۷ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے) اور امام سفیان ثوریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے۔

---

[۱] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام المجتہد شیخ الاسلام اور احد الاعلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۴ ص۲۷۸) مجد الدین لقب، عبدالسلام نام اور ابوالبرکات کنیت تھی (دیکھئے الجنۃ ص۳۸ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ)

امام لیثؒ بن سعدؒ (المتوفی ۱۷۵ھ) کا مسلک بھی ترک القرأۃ خلف الامام تھا جیسا کہ مغنی ابن قدامہؒ کے حوالہ سے مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے حضرت مولانا السید العلامہ، بحر العلوم، سید الحفاظ محمد انور شاہؒ (المتوفی ۱۳۵۲ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ ان کا مسلک بھی امام کے پیچھے ترکِ قرأۃ ہی تھا جیسا کہ حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ نے استذکار میں لکھا ہے اور وجوب کا مسلک تو ہرگز نہ تھا جیسا کہ شیخ الاسلامؒ نے (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۲) میں لکھا ہے (فصل الخطاب ص۵۰) امام ابن سعدؒ لیثؒ کا ترجمہ بھی مقدمہ میں گزر چکا ہے۔

امام عبداللہؒ بن المبارکؒ (المتوفی ۱۸۱ھ) امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ابو وائلؒ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کیا کرو، بلکہ خاموش رہا کرو۔ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت نہ کرنی چاہیے، کیونکہ انصات جہری نمازوں میں ہی ہوسکتا ہے (جزء القرأۃ ص۸) اور جہری نمازوں میں ان کا محقق مسلک امام کے پیچھے ترک القرأۃ ہی تھا (معالم التنزیل جلد ۳ ص ۶۶۴، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷ وغیرہ میں اس کی تصریح کی گئی ہے) اور تبییض الصحیفہ مصنفہ علامہ سیوطیؒ جو اپنے وقت کے سب سے بڑے حافظ تھے (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۱۴) کے حوالہ سے یہ بات نقل کی جاچکی ہے کہ امام عبداللہؒ بن المبارکؒ نے فرمایا کہ جس مسئلہ پر حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ مجتمع ہوجائیں تو وہی میرا مسلک ہوگا اور چونکہ یہ دونوں بزرگ ستری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ اس لیے یہی مذہب امام ابن مبارکؒ کا ہوگا۔

امام عبداللہؒ بن وہبؒ (المتوفی ۱۹۷ھ) حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن وہبؒ کا مسلک بھی امام ابن عیینہؒ کی طرح امام کے پیچھے ترکِ قرأت ہی ہے (فصل الخطاب ص۹۰) اور محدث مولانا محمد زکریا صاحب اس کی تصریح کرتے ہیں کہ امام ابن وہبؒ اور علامہ اشہبؒ وغیرہ مالکی علماء کا یہی مسلک تھا کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیے

---

(اوجز المسالک جلد ۱ ص ۲۳۹) اور امام ابن وہبؒ کا ترجمہ حدیث ۱۷ کے ذیل میں نقل کیا جاچکا ہے۔

امام سفیانؒ بن عیینہ (المتوفی ۱۹۸ھ) امام ابوداؤدؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے قتیبہؒ[2] بن سعیدؒ اور ابن ابی السرحؒ نے بیان کیا، وہ دونوں حضرت سفیانؒ بن عیینہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عبادہؓ بن الصامت کی مرفوع حدیث (لاصلوٰة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب فصاعدًا او کما قال) کا یہ مطلب بیان کیا لمن یصلی وحدہ (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱۹) یعنی جو شخص تنہا نماز پڑھتا ہو تو اس کو سورۂ فاتحہ کی قرأت کرنی ہوگی، اور یہ حدیث مقتدی کو شامل نہیں ہے، مطلب ظاہر ہے کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کی جاسکتی امام ابن عیینہؒ کا ترجمہ بھی مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے اور ابن ابی السرحؒ کا ترجمہ باب دوم حدیث ۲۸ میں نقل ہو چکا ہے۔

امام اسحاقؒ بن راہویہؒ (المتوفی ۲۳۶ھ) امام بغویؒ علامہ آلوسیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام موصوف جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے (معالم التنزیل جلد ۲ ص ۲۲۴، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ اور تحفة الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷) امام موصوفؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے۔

قارئین کرام! ہم نے بعض حضرات تابعینؒ و اتباع تابعینؒ کے آثار باب اول میں (مثلاً حضرت محمدؒ بن کعبؒ، مجاہدؒ بن جبرؒ، حسن بصریؒ، ابو عالیہ الریاحیؒ اور امام زہریؒ وغیرہ کے آثار) اور بعض دیگر اکابر علماءِ امت اور حضرات ائمہ اربعہؒ کے اقوال مقدمہ میں پوری تفصیل کے ساتھ عرض کر دیے ہیں اور گو ان کے علاوہ ابھی بہت سے آثار اور اقوال اس مضمون کے موجود ہیں۔ لیکن چونکہ ان حضرات کے مسلک کے سمجھنے میں فریق ثانی کو ایک نمایاں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم نے خصوصیت کے ساتھ ان کے نام پیش کیے ہیں۔ ورنہ مقدمہ میں اجماع نقل کیا جاچکا ہے اور اس کے بعد مزید کسی اور صراحت اور وضاحت اور تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

وفیہ کفایة لمن لہ ھدایة۔

---

[1] امام ابوداؤدؒ صاحب سنن (المتوفی ۲۷۵ھ) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الثبت اور سید الحفاظ تھے (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۲)

[2] قتیبہؒ بن سعیدؒ کو علامہ ذہبیؒ الشیخ، الحافظ اور محدث خراسان لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۳

حضرات! آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن... الآیۃ کا شانِ نزول صحیح روایات اور اجماع امت سے قرأۃ خلف الامام کا مسئلہ ہے اور اکیس ۲۱ عدد صحیح اور مرفوع روایات سے امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت اس کتاب میں ثابت کی جاچکی ہے۔ اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا آخری عمل بھی اس کی تائید کرتا ہے اور متعدد صحیح اور مرفوع حدیثوں سے خاص فاتحہ کا لفظ بھی نقل کیا جاچکا ہے اور فریقِ ثانی کی ہر طرح سے منہ مانگی مُرادیں بھی پوری کی جاچکی ہیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کی وہ جماعت جن سے باقرار فریقِ ثانی، دین، علم فقہ اور حدیث مروی اور منقول ہے۔ وہ بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہیں تھے۔ اور جلیل القدر حضرات تابعینؒ و اتباع تابعینؒ اور دیگر بڑے بڑے حضرات محدثینؒ اور فقہاءؒ بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور جہری نمازوں میں تو امام کے پیچھے قرأۃ کو مخالف قرآن شاذ منکر اور اجماع کے خلاف سمجھتے تھے، جیساکہ شیخ الاسلامؒ کے حوالہ سے نقل کیا جاچکا ہے اور جو سری نمازوں میں امام کے پیچھے قائل بھی تھے۔ وہ بھی صرف استحباب کے درجہ میں اور آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مانعین قرأۃ خلف الامام صرف احناف ہی نہیں ——— (جس طرح کہ فریقِ ثانی نے تمام دنیا کے حنفی حضرات کو کھلا اور انعامی چیلنج دے کر یہ مغالطہ دینے کی ناکام کوشش کی ہے کہ یہ صرف احناف کا قول اور ان کا مسلک ہے) بلکہ جمہور اہلِ اسلام اور فقہاءؒ و محدثینؒ کا یہ محقق مسلک ہے اور فریقِ ثانی نے غلطی کی وجہ سے صرف احناف کے مقتدر علماء مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، اور مولانا شبیر احمد صاحبؒ کی خدمت میں چیلنج پیش کر کے یہ سمجھنے یا سمجھانے کی بالکل ناکام سعی کی ہے کہ یہ مسئلہ صرف ان کا ہے اور آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ پیش کردہ روایات میں کم و بیش پچانوے ۹۵ فی صدی روات وہ ہیں، جو ثقہ، ثبت، حافظ اور حجت ہونے کے علاوہ بخاری اور مسلم کے مرکزی روات ہیں اور تقریباً پانچ فی صدی وہ راوی ہیں جن میں بعض حضرات محدثین کرامؒ نے کلام کیا ہے، لیکن ان کو بھی نوّے ۹۰ فی صدی اور جمہور محدثینؒ ثقہ کہتے ہیں اور ان کی روایتوں کو صحیح، حسن، صالح، جیّد اور قوی کہتے ہیں، جیساکہ آپ دیکھ چکے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان روات کی (بغیر تین چار کے حالانکہ جمہور محدثینؒ کے نزدیک وہ بھی ثقہ ہیں) ثقاہت اور عدالت فریقِ ثانی کے

نزدیک بھی مُسلّم ہے۔ صرف ان پر تدلیس، تخلیط، تغیر، سوءِ حفظ، وہم اور تفرد وغیرہ کے معمولی الزامات لگائے گئے ہیں یا مرفوع کو موقوف اور موصول کو مرسل کہنے کی بے جا سعی کی گئی ہے اور یا محض اپنی مرضی یا معمولی سے شبہ کی بنا پر مطلق قرأت کو مقید کرنے کی بعید از انصاف کاوش کی گئی ہے، اب ذرا فریق ثانی کی پیش کردہ روایات اور ان کے رواۃ اور رجال کا حال بھی دیکھ لینا تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ فریق ثانی کتنے پانی میں ہے۔ ان تمام پیش کردہ دلائل کو سامنے رکھ کر میں فریق ثانی کے اہلِ علم طبقہ سے نہایت مؤدبانہ اور مبنی بر انصاف مطالبہ بلکہ دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ حق کا ساتھ دے اور تعصب اور غلو سے کام نہ لے اور اگر وہ کسی خاص مصلحت کے پیش نظر اپنی پارٹی کا ساتھ نہ چھوڑ سکے یا نہ چھوڑنا چاہے تو اس چیلنج بازی سے باز آجائے اور یہ الفاظ اور نظریہ واپس لے لے کہ

جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے (انتہیٰ بلفظہٖ دیکھئے فصل الخطاب ص۱ جس میں تمام دنیا کے علمائے احناف کو کھلا چیلنج دیا گیا ہے)

اس سے قبل کہ باب چہارم شروع کیا جائے یہ کہ دینا نہایت ضروری سمجھتا ہوں (اور سخن ہائے گفتنی میں بھی عرض کیا جا چکا ہے) کہ ہر مقام پر حضرات محدثین کرامؒ اور فقہائے عظامؒ کے ناموں کے قبل، امام، علامہ، محدث، فقیہہ یا حضرت وغیرہ کے توصیفی القاب نہیں لکھے جا سکے۔ اس لیے کہ ان کے نام بار بار آتے رہے ہیں، ورنہ نہ صرف یہ کہ مجھے ان سے عشق اور محبت ہے، بلکہ ان کے نام لینے کو موجبِ نزولِ رحمتِ خداوندی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ انھیں کی کاوش اور سعی کی بدولت قرآنِ کریم اور حدیث شریف ہم تک پہنچی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظیم الشان ہستی تک ہماری رسائی کا عالم اسباب میں یہی اکابر بہترین ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور جہاں ان اکابر سے (خصوصاً حضرت امام بخاریؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ) علمی اور تحقیقی رسّہ کشی کی گئی ہے، تو حاشا و کلا ثم حاشا و کلا کہ اس سے ان کی تذلیل اور تحقیر مراد نہیں کیونکہ ان کی تذلیل کو بفحوائے حدیث من عادی لی ولیا فقد بارزتہ بالحرب۔ اللہ

تعالیٰ کی ذات سے اعلانِ جنگ کے مترادف سمجھتا ہوں۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ) بلکہ جہاں بھی ان اکابر سے اختلاف کیا گیا ہے۔ وہ صرف ان کی پیش کردہ دلیل کی خامی بتلانا مقصود ہے، وکل احد یؤخذ عنہ ویترك الا قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایک بات اور خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ راقم الحروف نے فریقِ ثانی کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات کے مفہوم کو اختصاراً اپنی عبارت میں پیش کیا ہے، مگر صرف بعض مواقع پر الفاظ بھی انھیں کے ہیں جہاں انتہیٰ بلفظہٖ یا بلفظہٖ وغیرہ لکھ کر اشارہ کر دیا ہے۔ ہاں البتہ ان کی کتابوں کے حوالے ضرور درج کر دیے گئے ہیں تاکہ مزید تسلّی اور اطمینان کے لیے اصل کتاب کی طرف بآسانی مراجعت کی جا سکے۔ مجھے اپنی علمی بے بضاعتی کا علم ہے۔ معصومیت کا دعوٰے کب ہو سکتا ہے؟ اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بغیر معصوم ہے کون؟ و العصمۃ بیدہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ۔

---

# چوتھا باب

قرآنِ کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ و اتباعِ تابعینؒ وغیرہم سے بلکہ جمہور امت سے یہ بات ثابت کی جاچکی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں ہے اور جہری نمازوں میں تو مخالف اجماع اور شاذ و منکر ہے۔ قرآن کریم، حدیث شریف اور اجماع امت کے بعد کسی اور دلیل کی نہ گنجایش ہے اور نہ ضرورت، لیکن ہم محض تکمیلِ فائدہ کے لیے نہایت اختصار سے چند عقلی ترجیحی اور قیاسی دلائل بھی اس باب میں عرض کردیتے ہیں تاکہ اصولِ فقہ کی رُو سے قرآنِ کریم[1]، حدیث شریف[2]، اجماعِ امت[3] اور قیاس[4] کے جملہ دلائل سے آپ کو جمہور اہلِ اسلام کا محقق مسئلہ معلوم ہو جائے کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ وغیرہ کسی قسم کی قرأت کرنا درست اور صحیح نہیں ہے۔

پہلی دلیل: علامہ حازمیؒ[1] (المتوفی ۵۸۴ھ) لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف کی حدیث ظاہر

---

[1] ابوبکر محمدؒ بن موسیٰؒ بن عثمان الشافعیؒ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، البارع اور النسابہ تھے، نیز لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ، حجت، نبیل، زاہد، عابد، متورع اور من الائمۃ الحفاظ تھے (تذکرہ جلد ۴ ص ۱۵۱) اور علامہ تاج الدین السبکیؒ (المتوفی ۷۷۱ھ) ان کو امام متقن اور مبرز لکھتے ہیں (طبقات الشافعیہ، جلد ۴، ص ۱۸۹)

قرآن کے موافق ہو، اور دوسرے طرف کی ایسی نہ ہو، تو وہ حدیث قابلِ اخذ اور حجت ہوگی جو ظاہر قرآن کے موافق ہوگی۔ (کتاب الاعتبار ص۱۱) امام کے پیچھے ترکِ قرأت کی روایتیں نہ صرف یہ کہ ظاہر قرآن کے مطابق ہیں، بلکہ آیت واذا قرئ القرآن … الآیۃ کا شانِ نزول ہی بالاجماع مسئلہ خلف الامام ہے، جس کی پوری تشریح باب اوّل میں عرض کی جا چکی ہے اور فریقِ ثانی کی طرف سے پیش کردہ روایات کی تائید میں قرآنِ کریم کی کوئی آیت موجود نہیں ہے، لہٰذا جمہور کے مسلک کو ترجیح ہوگی۔ مؤلف خیر الکلام نے ص۵۲۹ اور ص۵۳۰ میں اس کا جو جواب دیا ہے وہ بالکل غیر متعلق ہے۔ اوّلاً — اس لیے کہ انصات و استماع قرأت فی السّر کے منافی ہیں۔ کما مرّ وثانیاً — خلف الامام کی قید سے روایت نہ صحیح ہے اور نہ مشہور پھر اس سے تخصیص کیسی؟ وثالثاً — اختلاف نفسِ وجوب فاتحہ کا نہیں ہے جس کے لیے انھوں نے تین آیتیں پیش کی ہیں۔ (جو اصل مسئلہ سے بھی غیر متعلق ہیں) بلکہ اختلاف وجوب یا ترک فاتحہ خلف الامام میں ہے اور مقتدی کے لیے بحالتِ قرأت امام جواز اور اباحت قرأت کے لیے کوئی آیت موجود نہیں ہے محض کشید ہے بخلاف ترکِ قرأۃ خلف الامام کے کہ اس پر بالاجماع آیت واذا قرئ القرآن … الآیۃ دلیل ہے۔

دوسری دلیل: علامہ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک جانب کی حدیث پر اکثر امت کا عمل ہو اور دوسری جانب اتنا عمل نہ ہو تو اس روایت کو ترجیح ہوگی، جس پر جمہور امت کا اتفاق ہوگا۔ (ایضاً ص۱۱) اور امام کے پیچھے قرأت کے ترک کرنے کا مسئلہ جمہور امت کے اقوال اور عبارات سے آپ معلوم کر چکے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی مانعین قرأت خلف الامام کی احادیث اور مسلک کو ترجیح ہوگی۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۳۱ میں اس کا جو جواب دیتے ہیں وہ بالکل ناکام ہے کیونکہ عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید اور تطبیق و ترجیح کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دونوں دلیلیں مساوی ہوں اور یہاں ایسا نہیں ہے کیونکہ خلف الامام کی قید سے کوئی روایت صحیح نہیں ہے اور نزاع محض فاتحہ کے ایجاب کا نہیں جس کی حدیث صحیح ہے بلکہ فاتحہ برائے مقتدی میں نزاع ہے اور آیت انصات قطعی ہے وہ بھلا حضرت ابوہریرہؓ کی ضعیف حدیث سے کیونکر منسوخ ہو سکتی ہے؟ اور معدودے چند حضرات صحابہ کرامؓ کے بغیر باقی تمام حضرات قرنِ اوّل میں خلف الامام

قرآۃ کے منکر تھے اور بعد کے لوگوں کی اکثریت کا تو مؤلف مذکور کو بھی دبی زبان سے اقرار ہے اور قرآۃ خلف الامام سے منع کرنیوالے بے شمار حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ تھے بلکہ وہ تو منہ میں پتھر اور مٹی ڈالنے پر بھی اتر سے ہوئے تھے اور احناف کا مذہب باحوالہ گذر چکا ہے کہ منع قرآۃ خلف الامام ہے۔ اس لیے ترک القرآۃ خلف الامام جمہور کا مسلک ہونا واضح ہے۔ لا شك فيه۔

تیسری دلیل: علامہ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قولی حدیث کے ساتھ آپ کا عمل بھی موجود ہو۔ اور دوسری طرف صرف آپ کا قول ہو تو آپ کی اس حدیث کو ترجیح ہوگی جس پر آپ کا قول اور فعل دونوں موجود ہوں۔ (کتاب الاعتبار ص ۱۱) اور باب دوم میں آپ کی بہت سی قولی صحیح اور مرفوع حدیثوں کے علاوہ حدیث ۱۰ میں آپؐ کا آخری عمل بھی پیش کیا جا چکا ہے کہ آپنے بظاہر ساری سورۃ فاتحہ ترک کی اور آپ کے سامنے حضرت ابوبکرہؓ کی عملی اور فعلی حدیث بھی نقل کی جا چکی ہے۔ اور ایسی کوئی روایت بسندِ صحیح نہیں پیش کی جا سکتی کہ آپ نے اقتداء کی حالت میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأت کی ہے۔ ومن ادعی فعلیہ البیان دیدہ باید، اگر قرأت خلف الامام کی روایتیں صحیح بھی ہوں تب بھی ان کو ترجیح نہیں دی جا سکتی حالانکہ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ اس میں بھی مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۳۲ میں کلام کیا ہے مگر معقول نہیں کیونکہ باحوالہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ آپ پہلے مقتدی تھے۔ پھر آپ نے امامت اختیار کی اور بالاجماع اور باقرارِ مؤلف مذکور قرأت سورۃ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے اور وہی آپ سے چھوٹ گئی تھی اور بایں ہمہ نماز ہو گئی، قرأت سے نماز مراد لینا بے دلیل ہے اور یہ ترک فاتحہ کُلاً یا بعضاً عذر کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اقتداء کی وجہ سے تھا۔

چوتھی دلیل: علامہ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف کی روایت قیاس کے موافق ہو اور دوسری قیاس کے موافق نہ ہو تو اس روایت کو ترجیح ہوگی، جو قیاس کے مطابق ہوگی (کتاب الاعتبار ص ۱۷) اور امام کے پیچھے قرأت ترک کرنا قیاس کے مطابق ہے، اور فریق ثانی کا بھی اس امر پر اتفاق ہے کہ مازاد علی الفاتحۃ کی قرأت اور اسی

طرح مقتدیوں کو جہر بالقرأۃ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت اور جہر سے پڑھنا امام کا فریضہ ہے تو اس پر سورۂ فاتحہ کی قرآت کو قیاس کر لیں۔ ہاں اگر کسی صحیح سند کے ساتھ امام کے پیچھے مقتدیوں کو قرآت کرنے کی اجازت ہوتی تو الگ بات تھی۔ اس صورت میں قیاس نص کے مقابلہ میں باطل ہوتا۔ مگر خلف الامام کی ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے، جیسا کہ بیان ہوگا۔ مؤلف خیر الکلام کا فاتحہ کو نماز کی صحت کے لیے شرط قرار دینا اور قرآن کی قرآت کو رکن قرار دینا بجا ہے مگر مقتدی کے لیے دونوں شرط نہیں اور نزاع صرف اس میں ہے اور ما زاد کو بالاجماع عدم رکن قرار دینا غیر مسلّم ہے قرآت کے سلسلے میں فاتحہ اور ما زاد کا ایک ہی حکم ہے امام اور منفرد کے لیے دونوں ہیں اور اور مقتدی کے لیے دونوں نہیں۔ اس لیے ترک قرأۃ للمقتدی ہی قیاس کے مطابق ہے۔

پانچویں دلیل: اگر ایک طرف کی حدیث مُحَرِّم اور دوسری طرف کی مُبِیح ہو تو مُحَرِّم کو ترجیح ہوگی۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حظر مقدم باشد بر جانب اباحت (بدور الاہلہ ص ۱۸) اور یہ گذر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فاستمعوا لہ وانصتوا اور واذا قرأ فانصتوا وغیرہ امر کے الفاظ سے مقتدیوں کو قرآت سے منع کیا ہے اور خدا تعالیٰ اور اس کے برحق رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم اور امر کا خلاف کرنا یقیناً حرام ہے۔ اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے جو تہدیدی الفاظ نقل ہو چکے ہیں (کہ امام کے پیچھے قرآت کرنے والے کے منہ میں چنگاری ہو، خاک ہو، نتن ہوں، پتھر ہوں وغیرہ وغیرہ) وہ اس پر مستزاد ہیں۔ اس لیے مُحَرِّم کو مُبِیح پر ترجیح ہوگی۔ اور اس لحاظ سے بھی جمہور کی دلیل کا پلہ بھاری رہے گا۔ مؤلف خیر الکلام کا ایجاب فاتحہ خلف الامام کا دعویٰ کر کے اور ترکِ قرآت کو تخییر سے تعبیر کر کے ترجیح دینا مردود ہے کیونکہ ایجابِ فاتحہ خلف الامام کی جب سرے سے کوئی حدیث ہی صحیح نہیں تو پھر راجح و مرجوح کا کیا سوال؟ اور قرآن کریم و حدیث شریف سے ثابت ہے، کہ مقتدی کو خلف الامام استماع و انصات کا وجوبی حکم ہے پھر تخییر کہاں سے؟

چھٹی دلیل: اس امر پر تمام محدثینؒ اور فقہاءؒ کا اتفاق ہے جن میں خصوصیت سے حضرت امام بخاریؒ اور امام بیہقیؒ قابلِ ذکر ہیں کہ امام کا سُترہ مقتدیوں کو کافی ہے اور ان کو الگ سُترے

کی ضرورت نہیں ہے (دیکھئے بخاری جلد ا ص ۱۷ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۳۵۲) جب وہی امام، نماز اور مقتدی جمع ہیں تو امام کی قرأت مقتدیوں کو کیوں کافی نہیں ہے؟ جب کہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت میں سب کے نزدیک امام کفایت کرتا ہے[1]۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ سُترہ نماز کے ارکان اور شرائط سے نہیں قرأۃ نماز کے ارکان سے ہے ...... الخ صحیح نہیں ہے کیونکہ جیسے سُترہ رکن نہیں اسی طرح مقتدی کے لیے قرأت بھی رکن نہیں مطلق نماز کا جھگڑا نہیں بات مقتدی کی ہو رہی ہے اور جیسے سُترہ آگے ہونے کی وجہ سے بقول مؤلف خیر الکلام بمنزلہ کعبہ ہے اور سب کے لیے ایک ہی کعبہ کافی ہے تو اسی طرح امام بھی سب کے آگے ہوتا ہے اور قرأت میں سب کی کفایت کرتا ہے۔ لہٰذا امام کی قرأت اور سُترہ سب کے لیے کافی ہے۔

ساتویں دلیل: صاحبِ امر کے آخری قول و فعل سے بظاہر یہی متبادر ہو سکتا ہے کہ پہلا قول اور فعل منسوخ قرار دیا جائے۔ اور اس سے کیا کم ہو سکتا ہے کہ اگر آخری عمل ناسخ نہ ہو۔ تب بھی ترجیح تو اس کو بہر حال ہو گی۔ جیسا کہ حضرت امام بخاریؒ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے وانما یؤخذ بالآخر فالآخر من فعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری جلد ا ص ۹۶)

---

[1] شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: الامام یحمل عن المأمومین السھو وکذا القرأۃ عند الجمھور (منہاج السنہ جلد ۳ ص ۱۶) امام سہو میں اور جمہور کے نزدیک قرأت میں مقتدیوں کی طرف سے کافی ہوتا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک جنازہ پر بلند آواز سے قرأت کی۔ پھر ارشاد فرمایا: وانما جھرت لاعلمکم انھا سنۃ والامام کفاھا (منتقیٰ ص ۲۶۴) میں نے جہراً اس لیے قرأت کی ہے تاکہ تمہیں اس کا سنت ہونا معلوم ہو جائے ورنہ امام کی قرأت کافی ہے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حدیث آتی ہے لا صلوٰۃ الا بخطبۃٍ کہ خطبہ کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی، حالانکہ فریقِ ثانی بھی متفق ہے کہ خطبہ پڑھنا صرف امام کا کام ہے۔ (فیض الباری جلد ۲ ص ۷۷) بہر حال جب امام ما زاد علی الفاتحۃ سُترہ، سہو اور خطبہ وغیرہ میں کفایت کرتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ باقرار فریقِ ثانی تو قرأت میں بھی یقیناً وہ کفایت کر سکتا ہے۔

یعنی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سب سے آخری فعل ہی قابلِ عمل ہوگا۔ اور آپ پڑھ چکے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آخری نماز میں باقرار قاضی شوکانی رحؒ پوری سورۃ فاتحہ بحالت اقتدار ترک کی۔ مگر آپ کی نماز صحیح ہوگئی اور آپ کے آخری فعل کے حجت ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

مؤلف خیر الکلام کا حضور علیہ السّلام کی ابتدائً اقتداء کا اور پھر ترک فاتحہ کُلاًّ یا بعضاً کا انکار کرنا بالکل مکابرہ ہے۔ جب یہ روایات سے ثابت ہے کہ امر تو انکار کا کیا معنیٰ ؟ باقی نماز میں قیام وقعود اور نیابت وغیرہ میں عذر تو شریعت نے خود بتایا ہے مگر قرأت اور ترک قرأت میں عذر اور غیر عذر کا کوئی فرق نہیں کیا اس لیے قرأت یا ترک قرأت کو دیگر امور پر قیاس کرنا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے قیاس مع الفارق ہے جو قابل سماعت نہیں ہے۔

آٹھویں دلیل : آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ الامام ضامن[1] امام ضامن اور کفیل ہے ضامن اور کفیل جب قرض وغیرہ ادا کر دے تو اصل مقروض سبکدوش ہو جائے گا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حضرات صحابہ کرامؓ کے ابتدائً اس لیے جنازے نہیں پڑھائے تھے کہ وہ مقروض تھے اور ان کے پاس قرض کی ادائیگی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور جب ان کے قرض کو ان حضرات صحابہ کرامؓ نے اپنے ذمہ لے لیا جو زندہ تھے۔ اور ان کے کفیل اور ضامن بن گئے تو آپ نے اصل کو بری الذمہ سمجھتے ہوئے ان کا جنازہ پڑھا دیا۔

---

[1] یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الامام ضامن امام مقتدیوں کا ضامن اور کفیل ہے۔ یہ روایت ابوداؤد جلد ۱ ص ۸۴، ترمذی جلد ۱ ص ۲۹، معجم صغیر طبرانی ص ۱۲۳، اور مسند احمد جلد ۲ ص ۴۱۹ وغیرہ میں موجود ہے۔ صاحب تنقیح کہتے ہیں کہ مسند احمد کی روایت علی شرط مسلم صحیح ہے اور علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سند صحیح ہے (نصب الرایہ جلد ۲ ص ۵۷) علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں کہ بزارؒ نے یہ روایت بیان کی ہے: و رجاله كلهم موثقون (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۲) اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور یہ روایت حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے بھی مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الامام ضامن (الحدیث) علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ نے اور طبرانیؒ نے معجم کبیر میں یہ روایت بیان کی ہے و رجاله موثقون طبرانی کے سب راوی ثقہ ہیں (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۲)

(دیکھیے بخاری ومسلم وغیرہ) باقی باریک فقہی تدقیقات کا یہ مقام نہیں ہے ہم ان کو یہاں نہیں چھیڑتے۔ لہٰذا جب امام سورۂ فاتحہ کی قرأت کرلے تو مقتدیوں کو کافی ہوگی جیسے کہ ماذاد علی الفاتحہ کی قرأت بالاتفاق مقتدیوں سے ساقط ہے اور امام کی قرأت ہی کفایت کرتی ہے۔ مؤلف خیر الکلام صہ ۵۳۵ میں لکھتے ہیں کہ اگر ایک شخص کا بہت سے آدمیوں نے سو سو روپیہ ادا کرنا ہو تو یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص کفیل ان سب کی اور اپنی طرف سے ایک سو روپے دے کر سب کی ذمہ داری سے بری ہوجاتے .... الخ

الجواب: مگر یہ سب کچھ ان کی قلتِ فہم کا نتیجہ ہے کیونکہ یہاں ایک آدمی کا بہت سے آدمیوں نے نہیں دینا بلکہ کئی آدمیوں پر صرف سو روپیہ ہے اور اس کو کفیل ادا کر رہا ہے۔ کیونکہ قرأت جماعت کی نماز میں صرف ایک ہے اور ماذاد علی الفاتحہ میں تو فریقِ ثانی کو بھی مُسلّم ہے کہ امام اور کفیل سب کی طرف سے ادا کر رہا ہے۔ منفرد ہوتے تو ان کو خود پڑھنی ہوتی، لیکن یہاں بحث تو مقتدی کی ہو رہی ہے اور اس پر سرے سے قرأت ہی نہیں جو ہے وہ امام ادا کر رہا ہے۔

نویں دلیل: امام طحاویؒ نے ترکِ قرأت خلف الامام پر متعدد مرفوع حدیثیں اور آثار حضرات صحابہ کرام رضؓ و تابعینؒ وغیرہم نقل کرنے کے بعد اپنی عادت کے مطابق نظر فقہی اور عقلی دلیل یوں بیان کی ہے۔ اگر کوئی شخص رکوع کی حالت میں امام کے ساتھ شریک ہوجائے اور سورۂ فاتحہ اس سے کلیتہً چھوٹ چکی ہو تو جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک (جس کی تحقیق اپنے مقام پر آئیگی۔ اور دو مرفوع روایتیں اور متعدد حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوال پہلے نقل بھی ہوچکے ہیں) اس کی وہ رکعت بالکل صحیح اور درست ہے۔ اگر تکبیر تحریمہ اور قیام (جس میں کم از کم تکبیر تحریمہ ادا ہوسکتا ہو) کی طرح مقتدی پر سورۂ فاتحہ بھی پڑھنی لازم اور فرض اور رکن ہوتی تو جیسے تکبیر تحریمہ اور قیام اس سے ساقط نہیں ہوتے اسی طرح اس پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا بھی فرض ہوتا اور بغیر اس کے اس کی نماز نہ ہوسکتی۔ حالانکہ جمہور کے نزدیک اس کی یہ رکعت بالکل صحیح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ وہو المطلوب (محصلہ طحاوی جلد ا صہ ۱۲۸) مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ رکوع میں ملنے سے رکعت کا ہوجانا ان احادیث کے منافی نہیں جن میں آتا ہے کہ نماز میں ایک بار فاتحہ پڑھنی چاہیے جیسا کہ ہدایہ اور فتح الباری کے حوالہ سے گذر چکا ہے۔ ہاں ان احادیث کے منافی ہے

جن میں ہر ہر رکعت میں فاتحہ کا ذکر آتا ہے اس صورت کو خاص کر لیا جائے گا یا عذر شرعی پر محمول ہوگا۔ (محصلہ ص ۵۳۶)

الجواب: جس طرح یہ صورت رکوع والی رکعت کے منافی نہیں، اسی طرح یہ ان احادیث کے عین مطابق ہے جن میں قرأت صرف امام کا فریضہ بتلایا گیا ہے باقی مقتدی کے لیے ہر ہر رکعت میں بلکہ کسی بھی رکعت میں قرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے نہ تو یہاں منافاۃ کا سوال ہے اور نہ تخصیص اور عذر شرعی پر حمل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

دسویں دلیل: بحر العلوم، حجۃ الاسلام اور شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح (المتوفی ۱۲۹۷ھ) بانی دار العلوم دیوبند نے عقلی رنگ میں یہ مسئلہ یوں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہر چیز کا صرف ایک طول اور ایک ہی عرض ہوتا ہے۔ سو باعتبار طول کے ایک رکعت ایک نماز ہے اور ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے۔ اور باعتبار عرض کے امام اور مقتدی کی نماز ایک ہے۔ تو یہاں بھی ایک ہی سورۃ فاتحہ کافی ہو گی جس کو امام ادا کر رہا ہے۔ اور اگر امام اور مقتدی کے لیے الگ الگ اور جدا جدا سورۃ فاتحہ ضروری ہو تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ ایک چیز کے لیے ایک سے زیادہ عرض ثابت ہو اور یہ اصول موضوعہ کے خلاف ہے (توثیق الکلام ص۹، تبغییر) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ہر رکن چونکہ امام اور مقتدی کو الگ الگ ادا کرنا پڑتا ہے پس قرأت بھی ہر ایک کو الگ الگ ادا کرنی چاہیے۔ (بلفظہ ص ۵۳۹)

الجواب: جب قرأت مقتدی کے لیے رکن ہی نہیں تو اس کے لیے الگ پڑھنے کا کیا سوال؟ مقتدی کا رکن تو صرف استماع وانصات ہے جس کو وہ ادا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت آپ حضرات کے نزدیک بھی مقتدی پر نہیں ہے۔

گیارھویں دلیل: مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ بسلسلۂ قرأت امام اور مقتدی کی مثال ایسی سمجھ لیں جیسے سواری اور مسافر، مسافر کا کام صرف یہ ہے کہ وہ گاڑی، موٹر، بس، جہاز اور ٹانگہ وغیرہ میں اطمینان سے سوار ہو کر بیٹھ جائے۔ گاڑی وغیرہ حرکت کرے گی تو مسافر کی مسافت خود بخود طے ہوتی جائے گی اور مسافر کو ساتھ ساتھ دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالذات حرکت گاڑی کی ہے مگر بالعرض مسافر کی۔ اور باوجودیکہ مسافر آرام کے ساتھ گاڑی وغیرہ میں

بیٹھا رہتا ہے ۔ یہ کہنا صحیح ہے اور کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ مسافر نے اتنا راستہ طے کیا ہے ۔ اسی طرح امام جو بمنزلہ گاڑی کے ہے قرأت کرتا جائے گا اور یہی قرأت مقتدی کو کافی ہو گی (توثیق الکلام ص۱، ص۲ تبخییں) مولانا کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کیونکہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت میں فریقِ ثانی بھی متفق ہے کہ امام کی قرأت مقتدیوں کو کافی ہے اور اگر سورۃ فاتحہ کی قرأۃ مقتدیوں کو کافی نہ ہو تو اس مثال کے پیشِ نظر مطلب یہ ہو گا کہ ایک دو اسٹیشن تک مسافر گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا چلا جائے اور پھر گاڑی میں بیٹھ جائے ۔ جہاں تک گاڑی کا تعلق ہے اس کا سفر خود بخود طے ہوتا جائے گا ۔ لیکن طبعی، شرعی اور دیگر ضروریات میں خود کوشش اور کاوش کرنی پڑیگی ۔ اور بغیر اپنی ہمت اور حرکت کے دیگر ضرورتیں پوری نہیں ہوں گی ۔ مشہور ہے کہ حرکت ہی میں برکت ہوتی ہے ۔ اسی طرح جب گاڑی کی مسافت طے ہو جائے گی تو اپنے گاؤں محلہ اور گھر تک پہنچنے کے لیے خود عمل کی ضرورت ہے، اس لیے امام بمنزلہ گاڑی تو ہے لیکن صرف قرآت کی مسافت میں باقی رکوع و سجود، تسبیح و تشہد وغیرہ میں مقتدی کو خود ہی کچھ کرنا ہو گا ۔ مؤلف خیر الکلام کا امام کی نماز کو حقیقت اور مقتدی کی نماز کو مجاز سمجھ کر جواب میں دونوں کی نماز کو حقیقتہً سے تعبیر کرنا اور اس پر جواب کی بنیاد رکھنا بالکل غلط ہے نماز تو امام اور مقتدی دونوں کی حقیقتہً ہے، ہاں قرآت میں فرق ہے، امام حقیقی قرآت کرتا ہے اور مقتدی کی قرآت حکمی ہے اور ہم نے کتاب میں اس کی تصریح کر دی تھی کہ اس لیے امام بمنزلہ گاڑی تو ہے لیکن صرف قرآت کی مسافت میں ... الخ لہٰذا مؤلف مذکور کا ہماری عبارت سے مقتدی کی نماز کو مجاز سمجھنا غلط ہے ۔

بارھویں دلیل : شمس العلماء مؤرخِ اسلام علامہ شبلی نعمانی رح (المتوفی ۱۳۳۲ھ) نے حضرت امام ابو حنیفہ رح کے حالات میں ایک واقعہ نقل کیا ہے (جس کا خلاصہ راقم کی عبارت میں یہ ہے) کہ چند آدمی[1] مل کر مسئلہ خلف الامام پر امام صاحب رح سے بحث کرنے آئے، آپ نے فرمایا کہ میں

---

[1] یہ واقعہ مناقب موفق جلد ا ص۱۴۷ و ص۱۴۸ میں مذکور ہے ان جماعۃ من اھل المدینۃ جاؤ الی ابی حنیفۃ رح لینا ظروہ فی القرأۃ خلف الامام اھ اور اسی طرح مناقب کردری جلد ا ص۱۴۲ میں بھی ہے اور نواب صاحب رح بھی اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں ۔ وحکایتی کہ از امام اعظم رح در بارۂ الزام خصم باختیار یکی برائے مناظرہ از میان جماعتہ و بودن الزام او الزام جماعتہ نقل کردہ اند (باقی اگلے صفحہ پر)

اکیلا اتنے آدمیوں سے کیسے بحث کر سکتا ہوں؟ ایک آدمی کو اپنا وکیل اور مختار بنالو کہ اس کی فتح تمہاری فتح اور اس کی شکست تمہاری شکست متصور ہو، چنانچہ وہ سب اس پر راضی ہو گئے اور اپنا ایک وکیل انھوں نے انتخاب کر لیا۔ جب وکیل نے بحث شروع کی۔ تو حضرت امام صاحبؒ نے فرمایا کہ مسئلہ تو حل ہو چکا ہے۔ وہ بولا کیسے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ جب تم اکیلے سب کی طرف سے وکیل ہو کر گفت گو کر رہے ہو اور تمہاری بات ان سب کی بات سمجھی جاتی ہے تو اسی طرح امام کی قرأت سب مقتدیوں کی قرأت سمجھی جائیگی وہ سب شکست تسلیم کرتے ہوئے لاجواب ہو کر چلے گئے۔ (سیرت النعمان ا ص ۵۶)

مبارک پوری صاحبؒ نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ امام صاحبؒ کی طرف اس واقعہ کی نسبت غلط ہے۔ کیونکہ امام جب وکیل ہے تو قیام، رکوع، سجود، تشہد اور سلام وغیرہ جملہ امور میں امام کو وکیل ہونا چاہیے۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ) لیکن مبارکپوری صاحبؒ کا یہ اعتراض محض ہیچ اور باطل ہے۔ اس کی پوری تشریح گذر چکی ہے کہ امام مقتدیوں کا وکیل صرف قرأتِ قرآن میں ہے، باقی امور میں ان کا وکیل نہیں ہے اور اس کو ایسا سمجھ لیں جیسے بادشاہ کے حضور میں ایک وفد اپنی معروضات پیش کرنے کے لیے حاضر ہو۔ گفت گو تو صرف وفد کا وکیل اور پارٹی لیڈر ہی کرے گا۔ لیکن ارکان وفد کی طرف سے پارٹی لیڈر کی تائید بھی ضروری ہے، قرأتِ قرآنِ کریم کو اصل معروضات اور تسبیحات و تشہد وغیرہ کو اس کی تائید سمجھ لیجئے۔

نواب صاحبؒ کی یہ عبارت نقل کی جا چکی ہے کہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہمہ قرأت قرآنِ کریم است فقط (دلیل الطالب ص۲۹۴) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ وقول نبویؐ اذا قرأ فانصتوا وقول من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ دال است برآنکہ امام متحمل قرأت است از سامع (بدور الاہلہ ص ۵۱) اس لیے مبارک پوری صاحبؒ کا یہ اعتراض

---

(باقی پچھلا صفحہ) لطیفۂ شاعرانہ ومجرد تجویز عقلی بیش نیست در مقام استدلال و احتجاج بنصوص قابل التفات نمی تواند شد اھ (ہدایۃ السائل ص ۲۰۴) ہم نے بھی اس واقعہ کو قرآن و حدیث کے دلائل کی مد میں پیش نہیں کیا بلکہ عقلی دلائل میں نقل کر کے نواب صاحبؒ کی عقلی تجویز کی تائید کی ہے۔

سراسر باطل ہے۔ اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد سو فی صدی صحیح ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۳۷ میں لکھتے ہیں کہ امام وکیل نہیں بلکہ مقتدیٰ ہے اور ہر نمازی صرف اپنے لیے نماز پڑھتا ہے اور ہر نمازی رب سے باتیں کرتا ہے اور مناجات صرف فاتحہ پڑھنے میں ہوتی ہے اور فاتحہ فرض ہے اور دعا ہے اور یہ امام اور مقتدی دونوں پر لازم ہے۔ (محصلہ)

**الجواب**: جب صحیح حدیث میں الامام ضامن آتا ہے تو اس کی کفالت اور ضمانت کا انکار کون سنتا ہے؟ وہ مقتدیٰ بھی ہے اور کفیل بھی ہے۔ مقتدیٰ تمام ارکان وافعال میں ہے اور کفیل صرف قرأت میں ہے اور نمازی نماز خدا تعالیٰ کے لیے پڑھتا ہے جس کا ثواب نمازی کو ملتا ہے اور بے شک نمازی اللہ تعالیٰ سے مناجات کرتا ہے مگر وہ مناجات صرف ثناء اور تسبیحات وغیرہ ہی میں ہے قرأت میں تو اس کو صرف انصات و استماع کا حکم ہے جیسا کہ اس کے دلائل گذر چکے ہیں اور مناجات کو صرف فاتحہ میں بند کر دینا عقلاً اور نقلاً باطل ہے۔ سارا قرآن کریم اللہ تعالیٰ سے مناجات ہے اور سب تسبیحات اس سے سرگوشی ہے اور اوّل سے آخر تک نماز اس سے ہم کلامی ہے۔ باقی امور میں اصالتہً مقتدی خود عمل کرتا ہے اور قرأۃ میں اس کا امام وکالتہً سرگوشی کرتا ہے اور فاتحہ صرف امام پر لازم ہے۔ مقتدی کا فریضہ صرف انصات و استماع ہے، مقتدی پر فاتحہ فرض نہیں ہے۔ فاتحہ دعاء ہے، لیکن مقتدی حکماً دعا خواں ہے اور آمین سے اس کی تصدیق کرتا ہے۔

حضرات! ابھی ترجیحی، عقلی اور قیاسی دلائل اور بھی پیش کیے جا سکتے ہیں، مگر ہمارا مقصد دلائل کا استقصاء اور استیعاب نہیں ہے، بلکہ عامۃ المسلمین کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ ترک القرأۃ خلف الامام صرف احناف ہی کا مسلک نہیں ہے بلکہ جمہور اہلِ اسلام کا مسلک ہے اور جمہور اپنے اس محقق مسلک پر قرآن کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ واتباع تابعینؒ وغیرہم اور اجماعِ اُمت اور قیاس سے ٹھوس وزنی اور صحیح معیاری دلائل اور براہین پیش کرتے ہیں اور وہ ہرگز بلا دلیل نہیں ہیں جیسا کہ

آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب ہم بطور تبرک اس باب کو قرآن کریم کی ایک آیت کے ایک حصہ پر ختم کرتے ہیں، جیسا کہ پہلا باب بھی قرآن کریم کی آیت ہی سے شروع ہوا تھا۔ کہ اوّل بآخر نسبتے دارد۔ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْدِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا۔ اور آخر میں نہایت اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ فریق ثانی سے استدعا ہے کہ وہ اپنے اس غلو آمیز نظریہ سے باز آجائے۔ کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ اِس پوری کتاب کو پیشِ نظر رکھ کر انصاف سے فرمائیں کہ کس کس کی نماز باطل، کالعدم، بیکار اور ناقص ہوگی؟ غور تو کیجئے کہ جمہور امت کی نمازوں پر یہ حکم لگانا کیسی کھلی گستاخی اور بے ادبی ہے۔ اور گویا اس اعلان کے مطابق جمہور امت نماز پڑھتے ہوئے بھی بے نماز ہی ٹھہرے اور تارک صلوٰۃ کے بارے میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ کس مسلمان سے مخفی ہو سکتی ہیں؟ فریق ثانی نے احناف کے مقتدر علماء حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ و حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحؒ کی خدمت میں یہ اعلان پلیش کیا ہے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے۔ راقم الحروف، دار العلوم دیوبند کا خوشہ چین اور ان اکابر کے فضالہ علم اور پس خوردہ سے فیضیاب ہوا ہے۔ اس لیے اس حقیر پر یہ لازم تھا کہ اپنے محسن اکابر کا مسلک بیان کرتا اور ان سے سوءِ ظن کو دور کرتا، نیز فقیر فروعی مسائل میں اپنے اکابر کی طرح حنفی ہے۔ اس لیے فریقِ ثانی کا یہ مطالبہ بھی پورا ہو جاتا ہے۔ مگر آج تک ہمارے کسی حنفی بھائی کو یہ توفیق نہ ہوئی۔ کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے کی ایک ہی صحیح صریح مرفوع حدیث پلیش کر کے انعام لے (بلفظہٖ فصل الخطاب صا) اور انعام کی بابت وہ یوں لکھتے ہیں اور مخالفین کو ایک ہزار روپے کا انعامی کھلا چیلنج دیا ہے (بلفظہٖ فصل الخطاب صا) اب فریقِ ثانی کو دیانتہً از خود ہی یہ انعام دے دینا چاہئے۔ ورنہ اگر ہم چاہیں تو قانونی اور آئینی طور پر لے سکتے ہیں اور انہیں دینا پڑے گا۔ اور اس سے کیا کم ہے کہ ۔۔۔ ع: شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی

حضرات! آپ دیکھ چکے کہ ہمارا مسلک کیا ہے اور اس کے دلائل کیا ہیں؟ ع ۔۔۔

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

آخری التماس۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ جس طرح جمہور اہلِ اسلام کے دلائل اور براہین پیش کرنے کا صحیح حق تھا، میں ادا نہیں کر سکا۔ اہلِ علم حضرات سے التماس اور التجاء ہے کہ وہ مجھے میری کوتاہیوں اور لغزشوں پر مطلع فرماتے رہیں۔ کیونکہ ایک نوعمر آدمی سے جس کو اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کا بھی پورا احساس اور اقرار ہو۔ اور ایسے اہم مسئلہ میں جس میں حضرت امام بخاریؒ اور حضرت امام بیہقیؒ وغیرہ ائمہ حدیث اور فرسانِ علم نے خامہ فرسائی کی ہو، لغزشوں کا صادر ہو جانا کچھ بعید نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ سے نہایت اخلاص اور صدقِ دل سے دعا ہے کہ وہ حقیر کو جملہ جسمانی و روحانی، ظاہری اور باطنی بیماریوں سے محفوظ رکھے۔ اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور حضرات صحابہ کرامؓ، محدثینؒ اور فقہاءؒ اور جمہور اہلِ اسلام کی محبت اور اطاعت کا صحیح جذبہ عطا فرمائے جن کا ذکر موجبِ رحمتِ خداوندی ہے ؎

پلینے میں آ گیا کہاں لپٹی ہیں اڑ کے مستیاں
اتنی ہے تند مے یہاں مست ہوں اور پی نہیں

جلد دوم میں فریقِ ثانی کے پیش کردہ دلائل کا جائزہ لیا جائے گا کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ ومتبعیہ اجمعین۔

ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صفدر
خطیب جامع گکھڑ، ضلع گوجرانوالہ
۳ رمضان المبارک ۱۳۷۴ھ مطابق
۲۵ اپریل ۱۹۵۵ء